ایک خوبصورت معاشرتی ناول

جھونکا بہار کا

عابدہ نرجس

معیاری اور خوبصورت کتابیں

باا ہتمام: محمد علی قریشی

ایڈیشن ———— 2008ء

مطبع ———— نیراسد پریس

ڈیزائن ———— ذاکر

کمپوزنگ ———— کلاسکس گرافکس

قیمت ———— -/225 روپے

پیارے دُلارے

ملکیہ ، فائقہ

اور مفاخر کے نام......

عابدہ نرجس کا اندازِ تحریر

افسانے اور ناول میں بنیادی فرق ٹریٹمنٹ کا ہے۔ افسانہ تو کسی بھی دلچسپ یا اہم فقرے کے لئے بھی لکھا جا سکتا ہے، کسی بھی موڑ پر ختم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ناول کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ مسلسل اور مربوط واقعات کا فنکارانہ بیان ناول کے لئے ضروری ہے۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ زندگی کی مصروفیتوں کے باوجود آج بھی ہمارے قارئین ناول بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ عابدہ نرجس کا نام ادب کے ایوانوں میں نیا نہیں ہے۔ وہ ''اخبارِ جہاں'' میں باقاعدگی سے لکھ رہی ہیں اور خوب لکھ رہی ہیں۔ ان کا یہ ناول ''جھونکا بہار کا'' ہفت روزہ ''اخبارِ خواتین'' میں شائع ہو کر پسندیدگی کی سند حاصل کر چکا ہے۔ مگر میں سمجھتی ہوں کہ کتابی صورت میں شائع ہونے کے بعد اس کو ایک بڑا حلقہ میسر آئے گا۔ خوبصورت اسلوب اس ناول کی اہم خوبی ہے۔ مشاہدہ بھی غضب کا ہے۔ لوگوں کے رویے اس باریک بینی سے عابدہ نے سچ کی چھلنی میں چھانے ہیں کہ اتنی نفاست سے تو بعض خواتین منگے میں آٹا تک نہیں چھان سکتیں کہ چھلنی کے دائیں بائیں ہلنے سے آٹا باہر بھی گر کر ایک علیحدہ لکیر بناتا چلا جاتا ہے۔

عابدہ نرجس کے اندازِ فکر میں سچائیوں کی جو اٹھان ہے وہ قابلِ رشک ہے۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی وہ ایسے ہی سچے اور خوبصورت کہانیوں سے مزین ناول لکھتی رہیں گی۔

انجم انصار

مدیرہ ماہنامہ ''پاکیزہ'' کراچی

مصلّے پر بیٹھی ہوئی بڑی اماں کے ہاتھ میں تسبیح کے دانے تیزی سے گر رہے تھے۔ کبھی وہ دونوں ہاتھوں میں دوپٹہ پھیلا کر بڑی گریہ وزاری سے دعا کرتیں۔ کبھی سجدے میں گر جاتیں اور بہت دیر سر نہ اٹھاتیں لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے۔ اسی وقت گلاں نے گھبرائے چہرے کے ساتھ کمرے میں جھانکا تو بڑی اماں کا چہرہ بھی اتر گیا لیکن پھر بھی حوصلہ باندھتے ہوئے بیقراری سے بولیں۔ ''کچھ منہ سے بھی پھوٹ میرا تو کلیجہ منہ کو آ رہا ہے۔'' گلاں نے خشک لب کھولے اور منہ سوکھا کر بولی۔ ''لڑکی ہوئی ہے۔''

''ہائیں!!'' تسبیح ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر تخت پر گر پڑی اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ''کیا بک رہی ہے؟''

انہوں نے اس طرح ڈانٹا جیسے دوسری بار وہ انہیں کوئی اور خبر سنا دے گی۔

گلاں نے حیرت سے کہا۔ ''بڑی بیگم جو کوئی اور بات ہوتی تو میں آپ کے منہ میں گھی شکر نہ ڈالتی۔ اب تو میں حیران ہوں کہ میاں سے جا کر کیا کہوں اور کس طرح کہوں؟'' بڑی اماں نے دونوں ہاتھوں سے سینہ پیٹ لیا اور آنے والی ننھی سی جان کو جس کی ابھی آنکھیں بھی ٹھیک سے نہیں کھلی تھیں۔ منہ بھر بھر کے کوسنے لگیں۔

صمدانی صاحب کی یہ چھٹی بیٹی پیدا ہوئی تھی بیٹے کی خواہش میں بیٹیوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ پانچ لڑکیوں تک تو وہ خاموشی سے برداشت کرتے رہے لیکن اب تو انہوں نے الٹی میٹم دے رکھا تھا کہ اگر اس بار بھی لڑکی ہوئی تو وہ دوسری شادی کے متعلق سنجیدگی سے سوچیں گے۔ وہ خود بھی اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ وہ جو اولاد نرینہ سے محروم رہتے تو خاندان کا نام کیونکر باقی رہتا۔ اسی لئے

ان کے عزیز رشتہ دار ہر وقت صمدانی صاحب کو شہ دیتے کہ وہ دوسری شادی کرنے میں دیر مت کریں۔ لوگ تو اولاد کی طلب میں چار چار شادیاں کرتے ہیں۔ بعض نے تو رضا کارانہ طور پر اپنی بیٹیوں یا رشتہ دار لڑکیوں کی پیشکش بھی کر دی تھی۔ اسی لئے تو اس بار جب اماں بی کا پاؤں بھاری ہوا تو بڑی اماں نے کیا کیا جتن نہ کئے۔ سینکڑوں تو تعویذ ان کے دائیں بائیں آگے پیچھے لٹکے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ کوئی پینے کا' تو کوئی تکئے کے نیچے رکھنے کا۔ پیروں سے پانی کی دم کی ہوئی بوتلیں منگوائی گئیں اور منتوں مرادوں کا تو حساب نہیں۔ لیکن اماں بی کو تو جیسے پہلے ہی کچھ سن گن سی ہو گئی تھی۔ بڑی خاموش سی رہتی تھیں۔ اتنے بچوں کی پیدائش کے بعد وہ خاصی تجربہ کار ہو گئی تھیں۔ جیسے کوئی ان کے کان میں کہتا تھا کہ ان کی مرادوں کا پھول کبھی نہیں کھلے گا۔ آس کا سورج کبھی طلوع نہ ہوگا لیکن بڑی اماں ڈھارس بندھاتیں۔ رشتے دار ہمدرد عورتیں ٹونے ٹوٹکے اور وظیفے بتا جاتیں تو وہ بھی چند ساعتوں کیلئے خوش فہمی کے سنہرے خواب دیکھنے لگتیں۔

لیکن ایک طویل اذیت کے بعد جب انہوں نے رونے کی باریک سی مریل آواز سنی تو اک لمحے کو ان کا دل چاہا کہ اس کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دیں۔ ممتا کی اک خفیف سی لہر بھی ان کے دل میں پیدا نہیں ہوئی۔ انہوں نے آنکھ اٹھا کر بھی اس چھوٹے نے پالنے کی طرف نہیں دیکھا جس میں ایک ننھی سی جان اس بات سے بے خبر پڑی تھی کہ دنیا میں وہ بے ضرورت چلی آئی ہے۔ اس کے اپنے گھر میں اس کا استقبال غیروں کی طرح کیا گیا ہے۔ اس کیلئے چاہت' محبت اور قربت کا ایک ہلکا سا جذبہ بھی کسی دل میں بیدار نہیں ہوا۔

صمدانی صاحب تک یہ خبر نہ جانے کس نے پہنچائی تھی جسے سنتے ہی وہ گھر سے ایسے غائب ہوئے کہ رات تک خبر نہ لی۔ گھر کی حالت ایسی اجاڑ سی ہو رہی تھی جیسے کسی کی موت کے بعد ہو جاتی ہے لیکن یہاں تو زندگی کا ماتم ہو رہا تھا۔ اک ان چاہے روپ میں ان سب کے درمیان چلی آئی تھی۔ نیرا' شبو اور رانی تو اس بات پر کڑھ رہی تھیں کہ سکول میں ہم جماعت لڑکیاں ان کا مذاق اڑائیں گی۔ نازی اور انجم الگ پریشان تھیں کہ ابا گھر سے غائب ہیں اور اماں بی روئے جاتی ہیں اور بڑی اماں

جو کوسنوں سے کہیں فرصت پاتیں تو انہیں ڈانٹنے پھٹکارنے لگتیں۔ نوکر بھی بوکھلائے پھر رہے تھے کہ دیکھیں صمدانی صاحب آ کر کیا قیامت کھڑی کرتے ہیں۔

اماں بی نے ایک لمحے کو بھی نہیں سوچا کہ جب دودھ میدہ سی نیرا ان کی گود میں آئی تھی تو انہوں نے اسے بھینچ بھینچ کر ہزاروں ہی تو پیار کر ڈالے تھے۔ اس کی صورت' تکتے تکتے ان کا دل نہیں بھرتا تھا۔ بڑی اماں کے منع کرنے کے باوجود وہ دوڑ دوڑ کر اس کے کام کرتی تھیں اور اک یہ تھی کہ اس کی جانب نظر بھر کر بھی انہوں نے نہیں دیکھا تھا۔ دل صمدانی صاحب میں ہی اٹکا ہوا تھا کہ ابھی تک ان کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ نہ جانے جھنجلاہٹ میں وہ کیا فیصلہ کر بیٹھیں۔ اپنا راج سنگھاسن ڈولتا نظر آتا تھا۔ وہ بھی اپنی بات کے پکے تھے اس بار انہوں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں کئی بار جتایا تھا کہ اس بار وہ ایک اور لڑکی کے باپ بننے کو تیار نہیں۔

خاندان بھر کی عورتیں یوں اظہار افسوس کرنے آئیں جیسے کسی کی موت ہو گئی ہو اور واقعی افسوس کا مقام تو تھا کہ صمدانی صاحب نے اس کی صورت تک نہیں دیکھی تھی۔ انہوں نے اپنی اک رشتہ دار خاتون سے نکاح پڑھوالیا تھا اور الگ مکان لے کر رہنے لگے تھے۔

اب تو کوئی بھی اس کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔ اور جو کوئی اسے اک نظر دیکھتا وہ سو بار ناک بھوں چڑھاتا کہ دودھ میدہ سی شہابی رنگوں اور تیکھے نقوش والی لڑکیوں کے بیچ میں وہ کس پر چلی گئی تھی۔ سانولی رنگت اور دبے دبے نقوش والی اس منی سی بچی کا ایک نقش بھی تو کسی گھر والے سے نہیں ملتا تھا۔ خوبصورتی میں مثالی خاندان کی یہ سانولی لڑکی کسی کو بھی پسند نہیں آئی۔

رشتے دار عورتیں ہاتھ مل کر کہتیں۔ ''نقش کی تو اور بات ہے کم از کم رنگت تو گوری ہوتی۔ گورا رنگ سو عیب چھپاتا ہے۔ پہلی پانچ تھیں تو شکل صورت ہزاروں میں ایک کل کو لوگ شوق سے بیاہنے آئیں گے لیکن اسے کس کے سر منڈھا جائے۔ خدا نصیب نیک کرے۔ پیدا ہوئی تو باپ الگ ہو گیا۔

اور اماں بی نفرت و کراہت سے اس کی طرف دیکھتیں۔ جو ننھے منے ہاتھوں میں دودھ کی بوتل تھامے گلاں کی گود میں چپ چاپ پڑی رہتی۔ وہ نہ روتی تھی نہ تنگ

کرتی تھی۔ چپ چاپ اپنے جھولے میں پڑی کسی بھدے سے کھلونے سے کھیلتی رہتی۔ نازی اور انجم آ کر اسے ایک آدھ دھپ جما جاتیں۔ کان اینٹھ جاتیں۔ یا رخسار نوچ لیتیں۔ ''کالی کلوٹی' بیگن لوٹی۔'' ہم نہیں اسے بہن بناتے۔ وہ ٹکر ٹکر دیکھتی اور پھر رونے لگتی۔ گلاں باورچی خانے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بڑبڑاتی آتی اور اوپر ہاتھوں سے اسے دو ایک بار تھپک کر چلی جاتی۔ بڑی اماں ساتھ کے کمرے سے بڑبڑاتیں۔ ''اس کلموہی نے تو دو منٹ چین سے وظیفہ پڑھنا بھی حرام کر دیا۔'' اماں بی سلائی کی مشین چلاتے چلاتے اسے پچکارتیں کم اور ڈانٹتیں زیادہ۔ ''کیا آفت ہے؟'' ادھر سے نیرا جھنجھلاتی ہوئی آتی۔ ''کل میرا ٹیسٹ ہے اور خاک بھی پلے نہیں پڑ رہا۔'' وہ ٹوٹی ہوئی چوسنی اس کے منہ میں ٹھونس دیتی۔ جسے وہ تھوڑی دیر چسر چسر چوستی رہتی اور نہ جانے کب سو رہتی۔

اس عرصہ میں اس کے ہزاروں ہی نام رکھے گئے لیکن کسی نے بھی شوق سے' چاہت سے اس کا نام رکھنے کو نہیں سوچا تھا۔ پہلی دو تین لڑکیوں تک تو خود صمدانی صاحب نام ڈھونڈنے میں پیش پیش ہوتے۔ لغات دیکھی جاتیں۔ ریڈیو سے فرمائشی پروگراموں میں نام سنے جاتے۔ ملنے ملانے والوں سے مشورے ہوتے اور پھر کہیں بصد اہتمام کوئی نام رکھا جاتا تھا لیکن اب تو کسی نے سوچا ہی نہیں کہ اس کا نام رکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ جو کسی کے منہ میں بڑے سے بڑا لفظ آتا پکار لیا جاتا۔ جس سے اکثر نفرت و کراہت چھلکی پڑتی۔ بس اک محسن بھائی تھے جو کبھی لاڈ میں آتے تو اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے۔ چندا' چندا پکارتے جاتے۔ تب وہ اپنی چھوٹی چھوٹی بے حد سیاہ آنکھیں کھولتی اور ٹکر ٹکر ان کی جانب دیکھتی رہتی پھر ان کا ہاتھ منہ میں لے کر چوسنے لگتی۔

یہ محسن بھائی گھر بھر میں سب سے فالتو لیکن سب کی ضرورت تھے۔ صمدانی صاحب کی بہن کے لڑکے تھے چھوٹے ہی تھے کہ ماں باپ اک مہلک حادثے کی نذر ہو گئے۔ صمدانی صاحب ہی چونکہ قریبی عزیز تھے اس لئے بقول اماں بی نے ان کی چوکھٹ پر لا ڈالا تھا۔ اماں بی کو تو وہ روز اول سے ہی سخت ناپسند تھے۔ صمدانی صاحب کی بہن سے تو ان کی ساری زندگی نہیں بنی تھی۔ ان کی شادی ہوئی تو انہوں نے سو

شکرانے پڑھے تھے کہ پنڈ چھوٹا۔

گھر بھر میں انہیں کوئی پسند نہیں کرتا تھا۔ بس وہ گھر بھر کی ایک ضرورت بن کر رہ گئے تھے۔ اک پیر میں معمولی سی خرابی تھی لیکن گھر بھر کے کام وہ دوڑ دوڑ کر کرتے تھے۔ گلاں تو دن بھر باورچی خانے میں گھسی رہتی اور ادھر ادھر کے کاموں کیلئے محسن بھائی بھاگے پھرتے۔ ہر ایک کی زبان پر انہی کا نام۔ ابھی نیرو آپا بلا رہی ہیں کہ ''ہمارا دوپٹہ رنگنے کو دیا تھا لے آیئے۔'' شبو تسبو رہی ہے کہ ہماری کتابیں نہیں لائے اور بڑی اماں کو چھالیا منگوانی ہے۔ وہ ذرا سا بھی ادھر ادھر ہو جائے تو سارا گھر مفلوج ہو کر رہ جاتا۔

بڑے ماموں آئے تو یونہی ایک نظر چھوٹی بچی پر ڈال کر بولے۔ ''کہ اس کا نام کیا رکھا ہے۔'' سب نے ناگواری سے تیوریوں پر بل ڈال کر بیزاری کا اظہار کیا۔ جیسے اس کا نام رکھنا کوئی انتہائی ناخوشگوار فریضہ تھا۔ بڑے ماموں حسب عادت زور سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑے اور زندہ دلی سے بولے۔ ''ارے بھئی اس کا نام تو ''تمت بالخیر'' رکھو کہ اللہ میاں خیریت رکھیں تو بس اب بیٹیوں سے معاف ہی کریں۔'' بڑی اماں تیزی سے تسبیح پڑھنے لگیں۔ اماں بی جھینپ کر ہنس دیں لیکن ان کے چہرے پر محرومی کا اک عکس سا لہرا گیا۔

اس دن کے بعد سب کی زبانوں پر خود بخود یہ نام چڑھ گیا۔ کبھی جو ضرورتاً اسے پکارنا پڑتا تو سبھی ''تمت'' کہتے تھے۔ گلاں کارپوریشن سے اس کی پیدائش کی پرچی بنوا کر لائی تو اس پر بھی تمت صمدانی لکھوایا گیا تھا۔

لیکن تمت بالخیر صمدانی صاحب کی قسمت میں کہاں تھا۔ دوسری بیوی کی گود بھی ابھی ہری نہیں ہوئی تھی۔ سب کی آنکھیں اسی طرف لگی ہوئی تھیں لیکن کوئی خوشگوار یا ناخوشگوار خبر سننے کو نہیں ملی۔ اب وہ بھی کچھ مایوس سے ہو گئے تھے۔ اس لئے کبھی کبھی نگاہ التفات اس گھر پر بھی ہو جاتی تھی لیکن اجنبیت کی جو اک دیوار سی اٹھ گئی تھی اتنی بلند تھی کہ اس سے جھانک کر ہی دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ آ جاتے تو بچے سہمے سہمے سے رہتے۔ تمت تو ڈر کر گلاں کی بغل میں گھس جاتی۔ انہوں نے بھی کبھی اس کی طرف توجہ دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بس چپ چاپ آتے اور مہمانوں کی طرح چلے

جاتے۔

مرادوں کے پھول کھلنے کا وقت ایک بار پھر آ گیا تھا۔ گھر بھر میں اک دبی دبی سی خوشی کی لہر اٹھ کر اندیشوں اور وسوسوں میں کہیں گم ہو جاتی تھی۔ بڑی اماں کے پاؤں زمین پر نہیں لگتے تھے۔ ان کو تو جیسے الہام ہو گیا تھا کہ اس بار قسمت ضرور مہربان ہو گی۔ اماں بی بھی امید اور ناامیدی کے بھنور میں ڈوبتی ابھرتی رہتی تھیں۔ بعض اوقات تو وہ حد درجہ پریشان ہو جاتیں اور کسی وقت منا سا اک خوبصورت چہرہ ان کے تصورات میں جھانکتا تو اک لمحے کے لئے وہ بھی جی اٹھتیں۔ اس انقلاب نے انہیں تمت سے اور بھی غافل بنا دیا تھا۔

وہ بھی اب دو تین سال کی ہو چکی تھی لیکن بچپنے کی شوخی اور چونچال پن اس میں نام کو نہیں تھا۔ چپ چاپ اک کونے میں بیٹھی اپنے ٹوٹے پھوٹے کھلونوں سے کھیلتی انگوٹھا چوستی رہتی۔ صمدانی صاحب کے تو وہ کبھی نزدیک بھی نہیں پھٹکتی تھی۔ نیرو، شبو اور رانی تو اسے بہن کہنا بھی توہین سمجھتی تھیں۔ گھر بھر میں وہ صرف گلاں اور محسن بھائی سے مانوس تھی۔ اماں بی کی گود میں وہ کبھی خود سے نہیں گئی تھی۔ بس ان کی طرف ٹکر ٹکر دیکھتی جاتی۔ اس کی آنکھوں میں اک ایسی سوگوار سی معصومیت جھلکتی کہ گلاں کو سچ مچ اس پر پیار آ جاتا اور محسن بھائی بھی اسے گود میں اٹھا کر چوم لیتے اور وہ حیران حیران سی بے یقینی سے ان کی طرف دیکھتی رہ جاتی۔

☆......☆......☆

جس وقت کیلئے اک اک گھڑی گن گن کر گزاری تھی بالآخر سر پر آ گیا۔ گھر بھر سہا سہا سا سانس روکے کسی غیر متوقع خبر کے انتظار میں تھا۔ سب یوں چپ چاپ خاموش خاموش تھے جیسے سبھی کے دم حلق میں اٹک گئے ہیں۔ یا اگلے ہی لمحے ان پر کوئی آفت ٹوٹنے والی ہے۔ سب کی نظریں بند دروازے پر لگی تھیں کہ کب ہانپتی کانپتی گلاں باہر آتی ہے اور اس کے منہ سے انگاروں کی بوچھاڑ ہوتی ہے کہ پھولوں کی جھڑی لگتی ہے۔

اسی لئے جب دروازہ کھلا تو سب کے دل اچھل کر حلق میں آ گئے۔ گلاں گرتی پڑتی باہر آئی۔ اماں بی نے تمام تر متوقع اندیشوں سے قطع نظر انجان بن کر

پوچھا۔

"چل اب بک بھی۔"

گلاں نے میلی چادر سے پنی چندھی چندھی آنکھیں صاف کیں اور تھوک نگل کر بولی۔ "بڑی اماں، ہوئی تو اللہ کی رحمت ہے۔ اس کی مرضی میں کسی کا کیا دخل پر بھیجی بھی اللہ میاں نے اپنے ہاتھوں سے بنا کر، اتنی گوری گوری ہے کہ دیکھے سے میلی ہو، اتنی خوبصورت کہ نظر نہیں ٹکتی۔ بڑی اماں تو وہیں سن ہو کر رہ گئیں لیکن نیرو، شبو اور رانی اسے دیکھنے بھاگیں۔

جس نے دیکھا وہی حیران ہوا کہ ایسی خوبصورت لڑکی تو خاندان بھر میں نہیں تھی۔ یوں تو سوا تمت کے صمدانی صاحب کی ساری لڑکیاں نک سک سے درست تھیں لیکن اس بار تو کمال ہی ہو گیا۔ خوبصورت گڑھی گڑھائی گڑیا سی گلابی رنگت بلور سی چمکتی نیلی آنکھیں۔ سونے کے تاروں ایسے سنہری بال، وہ تو بنی بنائی گڑیا تھی۔ بس پہلے دن سے ہی اس کا نام گڑیا ہو گیا۔ ورنہ اس کا اصل نام تو "سونیا" رکھا گیا تھا۔

تمت اس سارے انقلاب سے بے خبر چپ چاپ اپنے اول جلول مشاغل میں لگی رہتی۔ ہاں جب اردگرد کوئی نہ ہوتا تو وہ ننھے منھے قدم لیتی اماں بی کے کمرے میں چھوٹے سے جھولے کے پاس آ جاتی اور ایڑیاں اٹھا اٹھا کر پالنے میں سوئی ہوئی چھوٹی سی گڑیا کو دیکھتی رہتی۔ ذرا سی آہٹ ہوتی تو ڈر کر وہاں سے ہٹ آتی اور باورچی خانے میں گلاں کو ڈھونڈتی پھرتی۔ گڑیا کی آمد نے گویا مایوسیوں پر مہر لگا دی۔ جب درد حد سے گزر جائے تو دوا بن جاتا ہے۔ یہی گڑیا کے معاملے میں اس گھر کے ساتھ ہوا کہ اب لڑکے کی امید منقطع ہی ہو گئی تو خوبصورت موہنی مورت دلکش لڑکی۔ تمت تو اس سے بہت ہی مرعوب ہو گئی تھی۔ گھر میں آنے والے اب دل کھول کر دونوں میں موازنہ کرنے لگتے تھے کیونکہ تمت اور گڑیا بالکل ایک دوسرے کی ضد تھیں۔ وہ جتنی خوبصورت تھی تمت اتنی ہی معمولی شکل وصورت کی۔ وہ ابھی سے اتنی چونچال، ہنس مکھ اور شریر تھی اور تمت اتنی ہی سہمی سہمی، خاموش اور آزردہ۔

جو کوئی آتا وہی کہتا "تم کو تو معلوم ہوتا ہے کہ کہیں سے لے کر پالا ہے۔ گڑیا نے تو سب کا نمبر کاٹ دیا۔" اور تمت حیران حیران یہ سب سنتی رہتی اور سوچتی کہ

نہ جانے کیا بات ہے کہ سب مجھ پر ایسی تمسخرانہ سی نگاہیں ڈالتے ہیں۔

بعض اوقات اس کا بھی جی چاہتا کہ اور کوئی نہیں تو صرف اماں بی ہی۔ اک بار گڑیا کی طرح اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر سینے سے لگا لیں۔ جھک کر اس کی پیشانی چوم لیں۔ پیار سے اس کے بکھرے بال سنوار دیں۔ اسی لئے بعض اوقات جب وہ کسی کام میں لگی ہوتیں یا بنائی کر رہی ہوتیں تو وہ چپ چاپ ان کے قریب جا کر کھڑی ہوتی۔ کبھی کبھی چند لمحوں کیلئے وہ آنکھیں بند کر کے کھڑی ہو جاتی کہ جیسے ابھی آنکھیں کھولے گی تو اماں بی کی گود میں ہو گی۔ ان کے سینے سے لگی ہو گی لیکن اس کی یہ آرزو کبھی بھی پوری نہیں ہوئی۔ یہ تمنا کبھی حقیقت میں نہیں ڈھلی۔ اماں بی ایک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالتیں اور لاپروائی سے کہتیں۔ ''کیا بات ہے تمو؟ جاؤ کھیلو جا کر میرے سر پہ کیوں سوار ہو۔ کبھی تو چین سے بیٹھ لینے دیا کرو۔'' تمت آنکھیں جھکا کر آہستہ آہستہ چلتی باہر چھوٹے سے چمن تک نکل آتی۔ ایک کونے میں بیٹھی پتوں کو تنکوں سے بیٹھی جوڑتی رہتی۔ چھوٹے چھوٹے پتھر جمع کر کے گھر بناتی یا زمین پر لکیریں کھینچتی۔ یہاں تک کہ سب کو کھانا کھلا کر جب گلاں اسے ڈھونڈتی ہوئی چمن میں نکل آتی تو وہ اس کی انگلی پکڑ کر اندر چلی آتی۔ باورچی خانے میں اس کے پاس بیٹھی، چپ چاپ کھانا کھا لیتی۔

وہ کسی سے کچھ نہیں کہتی تھی۔ اس کی سنتا بھی کوئی نہیں تھا اور اسے کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ جو وہ کسی کو سناتی۔ گھر آنے والے مہمان جب گڑیا کی پیاری پیاری حرکتیں دیکھتے تو پیار سے اسے لپٹا لیتے اور وہ کسی مہمان کو دیکھتی تو اور بھی سہم جاتی۔ زیادہ تر ان کی نظروں سے چھپنے کی کوشش کرتی۔ چمن میں نکل جاتی۔ نہیں تو گھر کے دور دراز گوشے میں بیٹھی ہوئی نہ جانے کیا کیا سوچا کرتی۔

گڑیا شرارتوں میں بھی تیز تھی اور پڑھنے میں بھی اسی لئے یوں تو وہ ایک ساتھ ہی سکول میں داخل ہوئی تھیں لیکن تمت ایک آدھ سال فیل بھی ہوئی اور گڑیا اس سے اگلی کلاس میں ہو گئی اور تمت نے جیسے اک عافیت سی محسوس کی۔ گڑیا اس کی کلاس میں ہوتی تھی تو وہ کمتری کے اک گراں بار بوجھ تلے دبی دبی سی رہتی۔

اس کے فیل ہونے پر لے دے تو بہت ہوئی لیکن محسن بھائی نے اس کی

طرف داری کی اور جھٹ پٹ بہانہ گھڑ لیا کہ پچھلے دنوں وہ بیمار جو ہوئی تھی تو ٹھیک طرح سے پڑھ نہیں پائی۔ اسی لئے امتحان کی تیاری بھی نہیں کر سکی۔ تمت اب پڑھائی میں اچھی ہو گئی تھی۔ گڑیا دوسری کلاس میں چلی گئی تو اک بڑا بوجھ اس کے سر سے ہٹ گیا تھا۔ گھر میں گڑیا کی برتری تسلیم کرتے کرتے وہ ادب جاتی تھی۔ اب کلاس میں گڑیا نہیں تھی جو سب کی توجہ، سب کا التفات اپنی جانب کھینچ لیتی۔ اس لئے وہ آسودگی سے پڑھنے میں لگی رہتی اور امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتی۔

جب وہ پاس ہو جاتی تو کسی کو کوئی خاص خوشی نہیں ہوتی تھی۔ الٹا یہ کہا جاتا کہ جب ایک کلاس میں دو سال لگیں گے تو یقینی بات ہے کہ نمبر بھی اچھے آئیں گے۔ ایک محسن بھائی تھے جو اس کے پاس ہونے پر بہت خوش ہوئے۔ اسے اپنے پاس بٹھا کر بہت دیر ان کے نمبروں کی کمی بیشی پر بحث کرتے اسے شاباش دیتے اور بازار سے اس کیلئے کچھ نہ کچھ لے آتے۔ یہ تحفہ یوں تو بے حد معمولی ہوتا بلکہ اکثر اوقات تھوڑی سی ٹافیاں ہی ہوتیں لیکن وہ ان ٹافیوں کی پنیاں بھی سینت سینت کر رکھتی۔ اکثر اس کی کتابوں میں نشانیوں کے طور پر ٹافیوں کے رنگ برنگے کاغذ پڑے رہتے۔

صمدانی صاحب کو گھر میں کوئی خاص دخل نہ تھا۔ اور نہ ہی دلچسپی۔ ڈھلتی عمر نے بیٹے کی کمی کا احساس اور بھی شدید کر دیا تھا۔ لڑکیوں سے ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے گھر میں ان کا سانس گھٹتا تھا۔ نیم کی طرح بڑھتی ہوئی جوان لڑکیوں کو دیکھ کر ان کے پیروں تلے سے زمین نکل جاتی۔ وہ بہت غمگین اور آزردہ رہتے۔ جیسے کوئی ہارنے والا تھک ہار کر اپنی شکست کو مقدر سمجھ کر قبول کر لے۔ اسی لئے تو انہوں نے دوسری بیوی کو طلاق دے کر الگ کر دیا تھا۔ جب قسمت میں ہی یہ داغ سہنا تھا تو پھر کیا ضرورت تھی اک نیا جھنجٹ پالنے کی۔

اب تو بیٹیوں کو دہلیز سے اٹھانے کی فکر تھی۔ نیرو یوں تو ابھی پڑھ رہی تھی لیکن خاندان بھر میں اس کی خوبصورتی کے چرچے تھے اسی لئے ابھی سے اس کیلئے پیغام آنے لگے تھے اور اماں بی سے زیادہ بڑی اماں کا اصرار تھا کہ جلد دیکھ بھال کر ''ہاں'' کر دی جائے۔ سات بیٹیوں کو بیاہنا کوئی ہنسی کھیل تو نہیں تھا۔ زمانہ ایسا آ لگا ہے کہ ایک بیٹی کا بوجھ بھی والدین کی کمر جھکا دیتا ہے۔ مگر نیرو تو ہر شے پر ناک بھوں

چڑھاتی کہ پہلوٹھی اولاد ہونا بھی آفت ہی ہے کہ جس کی نظر ہے وہ ہم پر ٹکی ہے۔ جو منہ اٹھاتا ہے ہماری ڈیوڑھی میں جھانکنے چلا آتا ہے۔

بعض اوقات تو بڑی اماں بڑی راز داری سے اماں بی سے کہتیں کہ لڑکی کی مرضی کہیں اور تو نہیں۔ تم رانی اور شبو سے کہو کہ معلوم کریں' اس کے ارادے آخر کیا ہیں؟ کہیں اور تو ساز باز نہیں کر رکھی۔ جو یوں چبا چبا کر باتیں کرتی ہے۔ تب ہی تو ہر ایک میں کیڑے نکالتی ہے۔ ورنہ لڑکی کی کیا مجال کہ بات میں دخل دے۔

نیرو نے کہیں آنکھیں تو چار نہیں کر رکھی تھیں لیکن ایک آئیڈیل جو سب کے تصورات میں جھلکا کرتا ہے اس کی تنہائیاں بھی اسی سے رنگین تھیں۔ یونہی تصورات میں جو وہ اس سے اتنی مانوس تھی تو حقیقت کی دنیا میں کسی اجنبی کو کیونکر قبول کر لیتی کہ خاندان میں جو آڑا ترچھا' بانکا بجیلا لڑکا تھا وہ اسی گھر کی جانب آس لگائے بیٹھا تھا اور اپنے خیال میں اس کا تھوڑا بہت منگیتر بھی بنا پھرتا تھا۔ وہ ان اوچھے لڑکوں کو دیکھتی تو ابکائی سی آتی۔

نیرو جو اک الگ تھلک دنیا کا تصور اپنے ذہن میں لیے بیٹھی تھی جب ہر وقت کی لایعنی بحثوں' بے موقع تقاضوں اور بے تکے مہمانوں سے اکتا جاتی تو وہ پہلے خواب بن بن کر اک جھلمل کرتی دنیا کی تعمیر میں مگن ہو جاتی لیکن خواب بن بن کر اگر دنیا بسائی جا سکتی تو شاید یوٹو پیا کی تلاش میں کوئی بھی نہ بھٹکتا۔

انہی دنوں صمدانی صاحب نے کسی کیس کے سلسلے میں اک وکیل کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ان کا آنا جانا اکثر رہتا تھا۔ منظر صاحب یوں تو نوجوان تھے کسی حد تک سمارٹ بھی کہے جا سکتے تھے لیکن ایسے ہی نوجوان جو بزرگوں کی صحبت میں جی حضوری کرتے کرتے نہیں تھکتے۔ صمدانی صاحب کے ساتھ ان کی طویل نشستیں رہتی تھیں۔ بڑی اماں نے جس دن سے انہیں دیکھا تھا اماں بی سے دن رات کھسر پھسر کرتی رہتی تھیں اور شبو نے جب سے یہ خفیہ گٹھ جوڑ دیکھے تھے نیرو کو الٹی میٹم دے دیا تھا کہ سازشیں کچھ تمہارے خلاف ہی معلوم ہوتی ہیں کہ بڑی اماں کو شروع ہی سے شادی فوبیا کی شکایت ہے۔ مرض ہے چھوت کا۔ بزرگوں میں خوب پھیلتا ہے اور اب اماں بی بھی اسی میں مبتلا ہوتی نظر آتی ہیں۔

نیرو نے کتابیں پٹخ دیں اور اکتا کر سوچا کہ ان منظر صاحب جیسے آڑے ترچھے دولہا ہی کے پلے باندھنا تھا۔ تو پھر کس نے کہا تھا کہ ہمیں اتنا پڑھاؤ کہ ہم اتنا کچھ سمجھنے لگیں اور جو ہمیں اک کرب مسلسل کا شکار بنا دے۔ منظر صاحب جنہیں ڈھنگ کے کپڑے بھی پہننے نہیں آتے تھے ہر وقت ایک آدھ فائل بغل میں دبائے کالر چڑھائے اسی ڈیوڑھی کے چکر لگاتے رہتے۔ گویا کورٹ ہی یہی ہے۔ اور منظر صاحب کا کورٹ کیا سب کچھ یہی تھا۔ جب سے ڈیوڑھی میں نیرو سے سامنا ہوا تھا انہوں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ اس کا ہاتھ لے کر ہی رہیں گے۔ ان کو یوں احمقانہ اپنی جانب دیکھتا پا کر نیرو پریشان سی ہو گئی تھی۔ جھجک کر اس نے آنچل سر پر ڈالا تو اس کی اس ادائے معصومانہ پر وہ قربان ہو ہو گئے۔ می لارڈ کے انداز میں بے تکے پن سے بولے۔ ''آپ صمدانی صاحب کی صاحبزادی ہیں۔'' نیرو کیلئے مشکل ہو گیا کہ کیا کہہ دے۔ ہاتھ میں پکڑا رومال اس نے یوں چہرے پر رکھ لیا جیسے پسینہ خشک کر رہی ہو۔ وہ بھی نہیں ٹلے اور مشتاقانہ اس کی جانب دیکھتے چلے گئے۔ نیرو نے کترا کر نکل جانا چاہا تو انہوں نے پھر بے تابی سے سوال کیا' لیکن الفاظ بدل کر۔ ''صمدانی صاحب آپ کے والد ہیں۔''

☆......☆......☆

نیرو بے زاری ہوگئی۔ چپ چاپ اک جانب سے نکل کر سامنے والے کمرے میں گھس کر غائب ہوگئی اور وہ وہیں کھڑے کھڑے اس یک طرفہ احمقانہ الفت کے شکار ہو گئے جو دوسروں کے نامعلوم جذبات کو اپنا مفہوم عطا کرتی ہے۔ وہ نیرو کی بے زاری کو اس کے شرمیلے پن پر محمول کررہے تھے اور اس کے اس طرح کترا کر نکل جانے کو اس کی اک وفا شعاری محسوس ہوئی۔ اسی لئے انہوں نے صمدانی صاحب سے اور بھی زیادہ برخوردارانہ تعلقات استوار کر لیے تھے تاکہ بعد کو برخورداری سے فرزندی تک آنے میں نہ انہیں دقت ہو اور نہ ہی صمدانی صاحب کو تامل۔

نیرو کو تو وہ ایسے احمق معلوم ہوئے تھے کہ اس نے دوبارہ ان کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔ وہ اس قابل ہی کب تھے کہ کسی لڑکی کی طرف محبت کی نگاہ سے دیکھیں اور جواب بھی ویسے ہی گرمجوشی سے پائیں لیکن شبو ایک ہی کائیاں تھی۔ اس نے منظر صاحب کے ڈیوڑھی میں چکر کاٹنے کا مطلب خوب سمجھ کر نیرو کے بھی گوش گزار کر دیا تھا۔

اور نیرو تو اس دن تو سچ مچ ہی دہل گئی تھی جب دیوار میں لگے لیٹر بکس سے ڈاک نکال کر وہ پلٹی تو منظر صاحب عین اس کے پیچھے موجود تھے۔ ایک پل میں سارے خط اس کے ہاتھ سے نیچے گر پڑے اور وہ وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ منظر صاحب نے عجیب بے تکے پن سے ہاتھ میں پکڑی فائلیں اسے تھمائیں اور خود جھک کر خط اکٹھے کرنے لگے۔ اتفاقاً خطوں میں زیادہ خط اسی کے نام تھے۔ اس کے ہاتھ سے فائلیں لے کر انہوں نے خط اسے تھماتے ہوئے بڑے اشتیاق سے اس کے جھینپے جھینپے چہرے کی طرف دیکھا اور بولے۔ ''آپ شبنم صمدانی ہیں یا نیر صمدانی۔'' نیرو اتنی

گھبرائی کہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ اس وقت شبو اور رانی ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتی ہوئی آیں اور ڈیوڑھی میں ان دونوں کو دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔ رانی نے اس کے ہاتھ میں ڈاک دیکھی تو بے صبری سے بولی۔ ''نیرو میرا کوئی خط ہے۔''

☆......☆......☆

منظر صاحب کا چہرہ کھل اٹھا۔ ہنس کر بولے۔ ''لیجئے آپ کا نام بھی ظاہر ہو گیا۔''

نیرو کے گڑے ہوئے قدم جیسے ایک دم آزاد ہو گئے وہ کھٹ پٹ کرتی تیزی سے ساتھ کے کمرے میں گھس گئی۔ نہ جانے منظر صاحب کی آنکھوں میں اسے کیا نظر آیا تھا کہ آنکھوں میں آنسو آئے جاتے تھے۔ شبو اور رانی دلچسپی سے منظر صاحب کی طرف دیکھتی رہیں۔ انہوں نے ہنس کر سر ہلایا اور آگے بڑھ گئے۔

عورت اپنے اوپر پڑنے والی محبت پاش نظروں کا اندازہ فوراً لگا لیتی ہے۔ وہ دوسروں کے جذبات بہت جلد پڑھ لیتی ہے۔ بعض اوقات تو یہ جذبات اسے ایک میٹھی سی کسک دے جاتے ہیں۔ جو زندگی میں رنگ بھر دیتی ہے لیکن کبھی یہی جذبات کی پیغام رسانی اسے اندیشوں اور وسوسوں کے ایک بھنور میں تنہا چھوڑ دیتی ہے۔ جو اسے چکرا کر رکھ دیتی ہے۔

اس لئے جب سے گھر میں کھسر پھسر شروع ہوئی تھی اور منظر صاحب کا نام یہاں سے وہاں گردش کرنے لگا تھا تو نیرو کی نیندیں بھی اڑنے لگی تھیں۔ وہ شاعرانہ طبیعت کی اک رومانی سی لڑکی تھی اس نے اپنے آئیڈیل کو سندر سپنوں سے گوندھ گوندھ کر سجایا تھا۔ اسے اونچے سنگھاسن پر بٹھا رکھا تھا۔ اب اسے پستیوں کی طرف لاتی تو وہ خود پستیوں میں گرتی چلی جاتی۔ یہ بدذوق سے منظر صاحب جنہیں اچانک سامنا ہو جانے والی کسی حسین لڑکی سے اس کا نام پوچھنا بھی نہیں آتا ہونقوں کی طرح یوں تکے جاتے ہیں جیسے زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی کو دیکھا ہو اور حیرت کے مارے گنگ ہو گئے ہوں۔ انہیں وہ کس طرح جیون ساتھی کا درجہ دے دیتی؟

لیکن اماں بی، بڑی اماں اور خصوصاً ابا کا خیال تھا کہ اس جیسا اکیلا لڑکا خوش قسمتوں کے ہی ہاتھ آتا ہے پھر کچھ جائیداد بھی تھی اور خاندان کا کوئی لمبا چوڑا بکھیڑا

نہیں کچھ دور پار کے رشتے دار تھے اور بس خود منظر صاحب اپنے حویلی نما مکان میں نوکروں کے ساتھ رہتے تھے اور وکالت شوقیہ کرتے تھے۔ اس سے بڑھ کر کسی لڑکی کو کیا چاہئے؟ بزرگوں کا یہی موقف تھا اور نیرو آنکھوں میں آنسو بھرے سوچتی تھی کہ لڑکی نے جب بھی تمنا کی ہے تو اپنے آئیڈیل کی' اپنے من مندر کے دیوتا کی۔ اس نے کبھی جائیداد' مکان یا دولت کو دل میں نہیں بسایا۔ یہ سب چیزیں اسے مل بھی جائیں لیکن من میں بسا ہوا وہ مانوس چہرہ پیش نگاہ نہ ہو تو اجنبیت کی فضا میں اس کا دم گھٹ کر رہ جاتا ہے۔

سب بیکار تھا صمدانی صاحب کو صرف نیرو کو ہی نہیں بیاہنا تھا جو اس کے خوابوں کے شہزادے کی تلاش میں پاتال کھنگالنے نکل کھڑے ہوتے۔ انہیں اور بھی چھ بیٹیاں بیاہنی تھیں اور ایک مددگار کے بغیر یہ کام اور بھی دشوار تھا۔ اسی لئے اس کی کسی نے ایک نہ سنی۔ کسی نے نہ دیکھا کہ اس نے کتنے سپنے سجا رکھے تھے' کتنے سنہرے خوابوں کی تہہ بہ تہہ کرنوں میں وہ آنکھیں بند کئے اجالوں کی منتظر تھی۔ کسی نے نہیں دیکھا کہ وہ کیا کچھ کرنا چاہتی ہے۔ اس کو بھی اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق ہے۔

سب بے سود' سب لاحاصل' اس نے ابھی بی اے کا امتحان بھی نہیں دیا تھا کہ اسے سرخ جوڑا پہنا کر لمبا گھونگھٹ کاڑھ دیا گیا اور نیرو نے اپنے ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں چنتے چنتے سوچا کاش یہ گھونگھٹ اسی طرح اردگرد کی دنیا کی نگاہوں سے اوجھل رکھے۔ وہ دنیا جس میں وہ اپنی خواہش سے نہیں آئی تھی کسی چیز کی طرف دیکھنے کو بھی اس کا جی نہیں چاہتا تھا۔

جب منظر صاحب نے بدسلیقگی سے ایک سستا سا شعر پڑھتے ہوئے اس کا گھونگھٹ الٹ دیا تو اس نے ان کے بے حد اصرار کے باوجود ایک پل کو آنکھیں نہیں کھولیں۔ خیالوں ہی خیالوں میں وہ جس کی امانت بن گئی تھی اس کی جگہ وہ کسی اجنبی کو اپنی انہی آنکھوں سے کیونکر دیکھ لیتی جن میں وہ خوابوں کا شہزادہ بستا تھا۔ ان کی ایک بات کا جواب بھی اس نے نہیں دیا۔ وہ باتیں ہی ایسی کچی پکی اور احمقانہ کر رہے تھے کہ نیرو کا دل کٹ کٹ جاتا تھا۔ یوں تو وہ اس کے حسن کے قصیدے پڑھ رہے تھے۔

اس کو ایک بار دیکھ لینے کے بعد اپنے دیوانے ہو جانے کی داستانیں سنا رہے تھے لیکن نیرو کو یونہی معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی فلم کا کامیڈی سین دیکھ رہی ہے۔ وہ جو رومانی نظموں اور خوبصورت غزلوں کے درمیان رہتی بستی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کا گھونگھٹ اٹھانے والا اتنے گھٹیا انداز سے ایسے شعر پڑھے گا۔ اسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مر گئی ہے اور اپنی بے جان سرد لاش سے منظر صاحب کو اظہار محبت کرتے دیکھ رہی ہے۔

مگر منظر صاحب اس کی خاموشی' بے زاری اور لئے دیئے رہنے کو اس کی شرم و حیا پر محمول کر رہے تھے۔ اس سے پہلے جب بھی نیرو سے ان کا سامنا ہوا تھا اس نے ان کی بات کا بھی جواب نہیں دیا تھا۔ اسی لئے تو آج بھی انہوں نے اس کی کم گوئی کی شکایت تو کی لیکن انہیں یہ کھلی نہیں۔

اس بے رنگ ان چاہی زندگی میں اس کا دم الجھ کر رہ گیا تھا۔ کتنے چاہت بھرے خوابوں کو اس نے زندگی بنا رکھا تھا مگر ان کی تعبیر ایسی بے رنگ ہوگی اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ منظر صاحب تو اس کے آگے پیچھے پھرتے تھے لیکن ایسی بے تحاشہ محبت سے تو اسے اور بھی وحشت ہوتی تھی۔ وہ بڑی نفیس طبع لڑکی تھی۔ اظہار اور ایسے بدسلیقہ اظہار سے اسے شدید نفرت تھی۔ الفاظ اظہار کا روپ دھار لیں تو محسوسات کو مجروح کر دیتے ہیں کہ لفظوں نے محسوسات کا درجہ پایا ہی کب ہے۔

وقت نے اسے کتنا مجبور بنا دیا تھا۔ گھر بھر کی صورت دیکھنے کو اس کا مطلق دل نہیں چاہتا تھا۔ جنہوں نے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کو اس پر اک ایسا بوجھ لاد دیا تھا جس کے نیچے دب کر وہ گھٹ گئی تھی۔ اماں بی اکثر شکایت کرتیں کہ جب سے وہ بیاہی گئی ہے اپنے گھر کا راستہ ہی بھول گئی ہے۔ تو نیرو پھیکی سی ہنسی ہنس کر خاموش ہو جاتی اور دل ہی دل میں سوچتی۔ میں تو اپنا آپ بھول گئی ہوں کسی کو کیا یاد رکھوں۔ بہنوں میں سے کوئی نہ کوئی اس کے پاس اکثر آ جاتی تھیں۔ منظر زیادہ تر اپنی فائلوں میں سر کھپاتے اور جو کبھی انہیں فرصت ہوتی تو اس کے ساتھ سر کھپاتے اور نیرو یوں بے جان سی گڑیا بنی ان کی باتوں کے جواب میں ہوں ہاں کرتی رہتی جیسے اس کے علاوہ اسے کوئی لفظ بولنے پر قدرت نہیں ہے۔

☆ ☆ ☆

گھر بھر میں بزرگوں نے اسے بیاہ کر اطمینان کا سانس لیا تھا۔ گویا وہی تو اک ایسا بوجھ تھی جس نے ان کی سانسیں انکا رکھی تھیں اور اب سازشیں رانی کے خلاف تھیں اور رانی تھی زمانے بھر کی کھلنڈری' پڑھنے لکھنے سے اسے کوئی خاص رغبت نہیں تھی۔ جب سے اس نے نیرو کے ایسے ٹھاٹ دیکھے تھے اور منظر صاحب کو اس پر یوں بے دریغ قربان ہوتے دیکھا تھا تو وہ جو طبیعت کی بھی رانی ہی تھی ایسی ہی میٹھی میٹھی تمنائیں کرنے لگی تھی۔ گھر میں پراسرار قسم کی مائیوں کی آمدورفت بڑھ گئی تھی اور اس کے حسن کے تذکرے یہاں وہاں ہونے لگے تھے۔ ایک دو تصویریں بھی یہاں سے وہاں گردش کرتی پائی گئی تھیں۔ اس نے اک نظر انہیں دیکھا اور مطمئن ہو کر خاموش ہو گئی۔

اس بار جب نیرو آئی تو شبو نے چپکے چپکے اسے ساری تفصیل بتا دی تھی۔ نیرو نے اک ٹھنڈی سی سانس بھری اور بولی۔ ''ابا بھی خوب ہیں بھلا رانی انٹرمیڈیٹ تو کر لیتی پھر یہ قصہ شروع کرتے۔''

رانی ہنس پڑی۔ ''کمال کرتی ہیں خود تو عیش کر رہی ہیں اور ہمیں پڑھنے کے بکھیڑوں میں پھنسانا چاہتی ہیں۔''

''رانی تجھے بہت شوق ہے۔'' اس نے بے ساختہ پوچھا۔ رانی بولی کچھ نہیں' مسکرا کر پلکیں جھپکانے لگی اور شبو نے فوراً اس کی طرف سے جواب دیا۔ ''اور نہیں تو کیا یہ تو شادی کے پیچھے مری جاتی ہے۔''

''یہ بات تھی۔'' نیرو نے جیسے اپنے آپ سے اک حسرت بھرے لہجے میں کہا اور جملہ ہونٹوں پر ہی روک دیا۔ ''تو منظر صاحب سے تم بیاہ کر لیتیں۔''

☆ ☆ ☆

''محسن بھائی!'' تمت نے دفعتاً پکارا جو خاصی دیر سے برآمدے کے اک کونے میں گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے بیٹھی تھی۔ محسن بھائی جو چارپائیوں کی ادوائین کھینچ رہے تھے سانس لینے کو ذرا رکے۔ ماتھے سے پسینہ پونچھ کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''محسن بھائی!'' وہ جھجک کر خاموش ہو گئی۔

''ہوں۔'' انہوں نے زور سے سانس کھینچا اور زور لگا لگا کر رسیاں کھینچنے لگے۔ تمت کچھ دیر ان کے سرخ ہوتے چہرے کی طرف دیکھتی رہی اور بار بار یوں لب ہلاتی رہی جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن ہر بار جھجک گئی۔ آخر ہار کر وہ پھر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور چپ چاپ انگوٹھا چوسنے لگی۔

شبو تیز تیز سیڑھیاں چڑھتی ہوئی برآمدے میں آ کر چلائی۔ ''محسن بھائی کمال ہے' کہا نہیں تھا آپ سے یہ رقعہ راحیلہ کو دے آئیے۔ پر آپ کبھی سنیں بھی۔'' محسن بھائی نے رسی چھوڑ دی اور مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ماتھے پہ آئے بال جھٹک کر وہ پھر جھنجھلائی۔ ''ایک گھنٹہ پارٹی میں جانے کو رہ گیا اور آپ ابھی تک اسے وہ رقعہ نہیں دے کر آئے وہ نہ آئی تو میں کیسے جاؤں گی؟''

''لاؤ ابھی دے آتے ہیں۔ پانچ منٹ کی ساری بات ہے۔'' محسن بھائی نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''تم ذرا یہ رسی پکڑو تا۔'' شبو اور جھنجلا گئی۔ پیر پٹختی ہوئی بولی۔

''بھاڑ میں گئی یہ رسی' میں کہہ رہی ہوں آپ اس کو رقعہ دے کر آئیں گے کہ نہیں۔''

''دے آئیں گے بھئی' دے آئیں گے۔'' محسن بھائی ہنس دیئے۔ ''غصہ کیوں ہوتی ہو۔''

''تمو ادھر آ میرے ساتھ آ کے رقعہ لے جا' مجھے تو کپڑے بھی استری کرنے ہیں۔'' شبو نے جاتے جاتے کہا۔

☆ ☆ ☆

تمت نے جلدی سے انگوٹھا منہ سے نکال دیا اور کپڑے جھاڑتی اس کے ساتھ چل پڑی۔ جب وہ رقعہ لے کر پلٹی تو محسن بھائی نے اس کے بکھرے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر کہا۔ ''تمہی' چندا بال باندھو جا کر۔''

تمت نے چٹکی میں ان کی قمیض پکڑ لی اور جھجکتی ہوئی سرگوشی میں بولی۔ ''محسن بھائی میں بھی چلوں آپ کے ساتھ۔''

''ارے تم کیا کرو گی' اتنی گرمی میں جا کر' میں تو ابھی گیا اور ابھی آیا۔''

''کہاں جا رہے ہیں۔ میں بھی چلوں گی۔'' پیچھے سے گڑیا کی آواز آئی۔ جو رسی پھلانگتی ہوئی ان تک آ گئی۔ تمت نے ایک دم ہی ان کی قمیض چھوڑی۔ گڑیا رسی پٹک کر ان کے گرد ہو گئی۔ ''میں بھی چلوں گی محسن بھائی۔'' اس نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ محسن بھائی کچھ جز بز سے ہو گئے۔ ''مجھے نہیں پتہ میں تو جاؤں گی۔ ہاں جی۔'' وہ بسورنے لگی۔ تمت آہستہ آہستہ چلتی۔ ایک ایک کر کے برآمدے کی سیڑھیاں اترنے لگی۔ محسن بھائی نے جھنجھلا کر اس سے ہاتھ چھڑایا تو وہ بھیں بھیں رونے لگی۔ وہ وہیں زمین پر اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ ''ارے بھئی خدا کے واسطے رو نہیں۔ میں لے چلتا ہوں تمہیں۔'' گڑیا اب بھی خاموش نہیں ہوئی اور بے سری آوازیں نکالتی ان کا ہاتھ کھینچنے لگی۔ تمت نے انگوٹھا منہ میں ڈالا اور ساتھ کے کمرے میں گھس گئی۔

بڑی اماں دوسری طرف کے دالان میں تخت پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ اماں بی کسی مہمان کے ساتھ مصروف تھیں۔ باقی سب بھی ادھر ادھر کے کاموں میں الجھے تھے۔ تمت آہستہ آہستہ چلتی پچھواڑے میں آ گئی۔ چوڑے پتھر پر پیر رکھ کر وہ ذرا اونچی ہوئی اور جالی کی کھڑکی سے جس میں جھولتا ہوا پردہ ایک سمت سے ہٹا ہوا تھا کمرے میں جھانکنے لگی۔ ایڑیاں اٹھا اٹھا کر کتنی ہی دیر اندر دیکھتی رہی۔ کبھی کبھی مڑ کر ادھر ادھر بھی دیکھ لیتی کہ کہیں کوئی آ تو نہیں رہا اور پھر کمرے میں جھانکنے لگتی۔

گڑیا اور تمت کی عمر میں فرق تو تھا لیکن دونوں ایک ساتھ ہی پڑھی تھیں۔ گڑیا کا رنگ اور بھی شفاف آئینہ سا چمکنے لگا تھا۔ پکی کٹورہ سی آنکھیں' ہیرے کی کنی کی طرح دمکتی تھیں۔ اس کے سنہرے بال سونے کے تاروں ایسے تھے۔ تمت بے حد معمولی نقوش کے باعث گڑیا کے مقابلے میں بہت ہیچ نظر آتی تھی۔

عمر کے بڑھنے کے ساتھ جیسے جیسے شعور میں پختگی آ رہی تھی دونوں بخوبی اس فرق کو سمجھنے لگی تھیں اور اس کے ساتھ ہی گڑیا میں جو بچپن ہی سے شوخ اور چنچل تھی ایک احساس تفاخر' غرور اور تمکنت پیدا ہو گئی تھی اور تمت کی دبی دبی سی طبیعت اور بھی گھٹ گئی تھی۔ وہ اکثر تنہا بیٹھی کہانیوں کی کتابیں پڑھتی رہتی یا سکول کا کام کرنے لگتی۔ اسے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ اس کی حیثیت گھر میں ایک فالتو چیز کی ہے۔ وہ کمتری کے

عجیب سے احساس کا شکار تھی۔ کبھی خود سے کچھ نہ کہتی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ وہ دوسروں کے کہے پر مشین کی طرح عمل کرتی تھی۔ وہ خود سے کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی تھی۔

وہ الگ تھلگ گویا کسی کے حکم کی منتظر رہتی جو کوئی کچھ کہہ دیتا وہی چپ چاپ کر دیتی۔ ورنہ تنہا بیٹھی' انگوٹھا چوستی ہوئی نہ جانے کیا سوچتی رہتی اور جو کوئی دیکھ پاتا تو زور کی ڈانٹ پڑتی۔ سبھی اس کی اس عادت سے نالاں تھے۔ کئی دفعہ اس کی مرمت بھی ہوئی۔ ڈانٹا پھٹکارا بھی گیا لیکن وہ خود بھی مجبور تھی جہاں تنہائی میسر آتی تو وہ انگوٹھا منہ میں ڈال لیتی۔

☆ ☆ ☆

جب سے گرمیوں کی چھٹیاں ہوئی تھیں محسن بھائی کی جان سولی پر ٹنگی تھی...... سب کو چھٹیاں تھیں اور گھر مچھلی مارکیٹ بنا رہتا اور رہ رہ کر محسن بھائی کو آوازیں پڑتی تھیں۔ کسی کو سیاہی منگوانی ہے تو کسی کو قلم' کبھی کتابیں لا دیں تو کبھی کاپیاں' کسی کی سہیلی کو رقعہ دے آئیں تو کسی کی سہیلی آئی ہیں۔ ان کی خاطر داری کو کچھ لا دیں۔ غرض کہ بازار کے چکر لگا لگا کر وہ خود گھن چکر بن جاتے۔

خود اپنے پڑھنے کا تو انہیں مطلق وقت ہی نہیں ملتا تھا اور کسی کو اس کی پروا بھی کیا تھی۔ کسی وقت دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے سوچنے لگتے کہ ایسی لاوارثی کی زندگی گزارنے وہ اس دنیا میں آئے ہی کیوں تھے۔ ماں کا پیار کیا ہوتا ہے؟ ممتا کی ٹھنڈی چھاؤں کس کو کہتے ہیں؟ باپ کی شفقت کا کوئی روپ انہوں نے نہیں دیکھا تھا۔ پیار کا لفظ انہوں نے سن رکھا تھا لیکن ابھی تک اس کا مفہوم سمجھ نہیں پائے تھے۔ وہ سب کی ضرورت تھے اور ان کی اپنی ضرورت اور خواہش کوئی نہ تھی۔

پڑھنے بیٹھتے تو حروف نیم دائرے سے بن کر ناچنے لگتے اک چہرہ سا ان لفظوں کے پیچھے گردش کرتا تھا۔ جو ان سے اس طرح مانوس تھا جس طرح اپنا آپ آئینے میں مانوس نظر آتا ہے لیکن وہ اسے پہچانتے ہوئے ڈرتے تھے' گھبراتے تھے۔ جان بوجھ کر انجان بنے جاتے تھے۔ ان کیلئے اب تک اپنا آپ پہچاننا دشوار تھا تو کسی

دوسرے کی شناخت کیونکر کر لیتے۔

☆......☆......☆

تمت ہاتھ میں کاپی پنسل لئے ان کے پاس آ بیٹھی۔ وہ اپنی کتابوں میں منہمک تھے لیکن حقیقت میں ان کا ذہن کہیں اور تھا۔ تمت نے کئی بار ان کے چہرے کی طرف دیکھا گویا انہیں متوجہ کرنا چاہتی ہو لیکن وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھے۔ تھوڑی دیر وہ ان کی کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی پھر اٹھ کر اندر گئی اور پرانا کیلنڈر اور قینچی لے آئی اور بڑی احتیاط سے محسن بھائی کی کتابوں پر گرد پوش چڑھانے لگی۔ محسن بھائی نے کاغذوں کے کاٹنے پھاڑنے کی آوازیں سنی تو جھک کر اس کی طرف دیکھا جو برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے بڑی توجہ سے ان کی کتابوں پر کاغذ چڑھا رہی تھی۔ تمت !! انہوں نے پکارا۔ وہ اپنے خیال میں مگن تھی کاغذ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

''ارے چندا یہ تو لائبریری کی کتابیں ہیں۔ واپس کرنی ہوں گی۔ ان کی جلدیں بھی تو بندھی ہیں۔'' تمت سہم سی گئی رک رک کر بولی۔ ''محسن بھائی تو میں ابھی اتار دیتی ہوں۔ اس کے سراسیمہ ہو جانے پر محسن بھائی کو یک لخت پیار آ گیا۔ اسے پچکارتے ہوئے بولے۔ ''تمہیں کور چڑھانے کا شوق ہے تو اندر میری کچھ کتابیں پڑی ہیں ان پر چڑھا دینا۔ ویسے تم ایسی صفائی سے کور چڑھاتی ہو جیسے ابھی ابھی جلد ہو کر آئی ہیں۔'' تمت خوش ہو گئی۔ گردن پر جھولتا ربن بالوں میں کس کر باندھتی ہوئی بولی۔ ''محسن بھائی میری مس بھی یہی کہتی ہیں۔ وہ ہمیشہ میری کتاب سے پڑھاتی ہیں۔''

''سچ مچ ؟'' انہوں نے حیران ہونے کی اداکاری کی۔ ''خیر تم ہو ہی ایسی سویٹ سویٹ بے بی۔'' تمت کا چہرہ اک فخر کے احساس سے سرخ ہو گیا۔

☆......☆......☆

اسی وقت گڑیا برآمدے سے گزری۔ تمت پر اس کی نظر پڑی تو دہائی دینے لگی۔ تمت وہیں دبک گئی۔

''تمو کی بچی یہ کیلنڈر تو میرا تھا تو نے کیوں لے لیا۔'' میں نے کب سے سنبھال سنبھال کر رکھا تھا۔ اس کالی کلوٹی نے لے لیا۔ تمت یوں سراسیمہ ہو گئی جیسے کوئی بڑی غلطی ہو گئی ہو۔ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

''دیکھو تو گڑیا میں نے بھی دو صفحے تو لئے ہیں۔ تم باقی لے لو۔''

''واہ تو تم سے کہا کس نے تھا کہ تم لو۔'' تمت کو کوئی جواز نہیں مل رہا تھا کہ وہ اپنی صفائی پیش کرتی۔ گڑیا حسب معمول شیر ہو گئی۔ محسن بھائی نے ٹوکا تو وہ حسب عادت رونے لگی۔ گھر بھر کے لاڈ سے وہ ایسی بگڑی تھی کہ ذرا ذرا سی بات پر ضد کر کے بیٹھ جاتی۔ رو رو کر گھر سر پر اٹھا لیتی۔ شور سن کر شبو اور انجم آ گئیں۔ گڑیا نے رو رو کر ساری سرگزشت سنائی تو تمت کو خوب ڈانٹ پڑی۔ ''تمت گم صم کھڑی آنسو بھری آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ گڑیا اور اترائی۔ اس نے تمت کے ہاتھ سے کیلنڈر چھین کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ محسن بھائی سے نہ رہا گیا۔ ''گڑیا کیا فائدہ ہوا اتنی لڑائی کا اب پھاڑا کیوں ہے؟'' اچھی اچھی تصویریں تو اس نے لے لی تھیں تو باقی میں کیا کروں۔'' اس نے بدتمیزی سے کہا۔ ''تمیز سے بات کیا کرو گڑیا۔ اب تم چھوٹی سی بچی نہیں رہیں۔'' انہوں نے ڈانٹا تو شبو نے طرف داری کی۔

''محسن بھائی خواہ مخواہ اس کو مت ڈانٹیں۔'' اور تم جو تمت کو ڈانٹ رہی تھیں۔'' آپ بڑے آئے ہیں تمو کے حمایتی بن کر اس نے گڑیا کی چیز لی ہی کیوں تھی؟''

تمت سہمی ہوئی سی ستون میں گھسی جاتی تھی۔ ''وہ کیلنڈر گڑیا کا تھا ہی کب۔ ابھی پرسوں ہی میں نے صفائی کروائی تو اتروا کر سٹور روم میں رکھا تھا۔''

گڑیا چلائی۔ ''نہیں نہیں وہ میرا تھا۔ میں نے خود لیا تھا۔ یہ محسن بھائی کی کتابوں پر جو چڑھا رہی تھی۔

''یہ تب ہی کہہ رہے ہیں۔'' ہوں تو یوں کیوں نہیں کہتے کہ آپ نے اس سے کہا تھا۔

''اچھا تو کہا تھا پھر۔'' محسن بھائی کو بہت غصہ آیا۔ شبو کچھ کہنے ہی والی تھی

کہ انجم بولی۔ ''محسن بھائی آپ کو ہماری بات پر بولنے کو کون کہتا ہے۔ خواہ مخواہ ہی ٹانگ اڑاتے ہیں۔''

☆......☆......☆

ساتھ کے کمرے سے بڑی اماں بکتی جھکتی باہر آئیں۔ ان کے وظیفے میں یہ ہنگامہ خلل انداز ہو رہا تھا۔ لے دے کر سارا نزلہ محسن بھائی پر گرا۔ ''تمہیں کیا ضرورت ہے لڑکیوں کے منہ لگنے کی۔ اپنی جگہ پر رہا کرو۔ لے کے سارا وظیفہ غارت کر دیا نامراد نے۔ کوئی نہ کوئی ننتنا اٹھائے رکھتا ہے بدذات۔''

لڑکیاں تو ادھر ادھر کھسک گئیں اور محسن بھائی ایسے باہر نکلے کہ شام کی خبر لی۔ آتے ہی اماں بی سے تواضع ہوئی کہ ہر وقت کی آوارہ گردی سے فرصت ہی نہیں ملتی کہ گھر کی طرف بھی دیکھیں۔ گھر میں ٹکیں ہی کیوں' کہ کہیں ہاتھ نہ ہلانا پڑ جائے اور کھانے کے وقت آن موجود۔'' اور محسن بھائی جن کی بھوک دن بھر سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے خوب چمک گئی تھی۔ پل بھر میں اتر گئی۔ خاموشی سے کان لپیٹے کمرے میں آن گھسے ڈیوڑھی کی طرف کا یہ الگ تھلگ کمرہ انہی کیلئے مخصوص تھا جس کی طرف کوئی پلٹ کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ اس کی صفائی بھی محسن بھائی ہی کے ذمے تھی۔ بیزاری سے چارپائی پر بیٹھ کر انہوں نے گرد آلود جوتے اتارے اور تھوڑی دیر سر پکڑے یونہی بیٹھے رہے کہ آہٹ سے چونک کر انہوں نے سر اٹھایا۔ الماری کے پیچھے سے نکلتی ہوئی تمت پھر دبک گئی۔ ''تمو تم کیا کر رہی ہو؟''

کچھ نہیں۔ کچھ نہیں محسن بھائی میں تو کچھ بھی نہیں کر رہی۔''

''یہاں آؤ میرے پاس۔'' انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ سہمی سہمی سی چلی آئی۔ اسے گود میں بٹھا کر انہوں نے اس کے بکھرے ہوئے بال سمیٹے تو دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔ انہوں نے انگوٹھا اس کے منہ سے نکالا اور بولے۔ ''تمو رو رہی ہو۔ کیا ہوا؟'' تمت کے آنسو اور بھی تیزی سے بہنے لگے۔

''کیا ہوا کسی نے کچھ کہا۔''

انہوں نے بار بار پوچھا تو وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔ ''محسن بھائی میں تو

آپ کی وجہ سے رو رہی ہوں۔''

''کیوں بھئی مجھے کیا ہوا؟'' انہوں نے بے دلی سے ہنس کر پوچھا۔

''محسن بھائی کیلنڈر تو میں نے لیا تھا اور جھڑکیاں آپ کو پڑ گئیں۔'' اس کی باتوں میں اک ایسی والہانہ اپنائیت اور بے ساختہ معصومیت تھی کہ محسن بھائی کی اپنی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ اس کی ٹھوڑی اٹھا کر چند لمحے تک اس کے سانولے سلونے چہرے کی طرف دیکھتے رہے یہ انداز گفتگو ان کیلئے نیا تھا لیکن اس نے دل کے رستے زخموں پر جیسے اک مرہم سا رکھ دیا تھا کہ درد کی ساری ٹیسیں پلک جھپکتے غائب ہو گئی تھیں۔ جاتے بچپن کی معصومیت اس کی آنسو بھری آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔

☆......☆......☆

اس کے آنسو پونچھتے ہوئے انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی۔ وہ ان کے بازو سے لگی بڑے غیر محسوس انداز میں اپنا گال ان کے بازو سے رگڑتی رہی۔ محسن بھائی نے آہستہ سے اسے گود سے اتارا اور ربن سے اس کے بال باندھتے ہوئے بولے۔ ''تمت شاباش اب جاؤ اپنے کمرے میں صبح تمہیں پارک لے جائیں گے۔ کسی کو بتانا نہیں اچھا۔'' انہوں نے جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی تو اس کا سانولا چہرہ کھل اٹھا۔

☆ ☆ ☆

''ارے بھابی جی — کباب تو آپ نے بڑے جشن کے بنائے ہیں۔'' خرم نے چٹخارہ لے کر اپنا مخصوص فقرہ کہا۔ ''اچھا تمہیں پسند آئے ہیں تو اچھے ہی ہوں گے۔'' نیرو نے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''وہ آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے میں نے بڑی مجبوری سے کہا ہو۔''

''ہوسکتا ہے مجبوری میں ہی کہا ہو ذرا میرا دل رکھنے کو۔''

خرم نے کھلے دل سے قہقہہ لگایا۔ ''بھابی جی نہیں۔ میں تو اپنے دل کی بات کہتا ہوں۔ کسی کے دل رکھنے نہ رکھنے کی پروا نہیں کرتا اور معلوم ہے آج کل لوگ دل نہیں رکھتے۔ اتنے بڑے بڑے پتھر کے ٹکڑے رکھتے ہیں جو ذرا نہیں پسیجتے۔ پتہ نہیں کیسے فٹ کروا لیتے ہیں۔'' نیرو ایک لمحے کو کچھ متذبذب سی ہوگئی۔ اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑی بے نیازی سے بیٹھا ہوا نیپکن تہہ کر رہا تھا۔

''تم نے کتنے لوگوں کے دل دیکھے ہیں اس قسم کے۔'' وہ ایک بناوٹی سی ہنسی ہنس کر بولی۔

''بھابی جی بہت لوگوں کے ہوتے ہیں، بہت لوگوں کے۔'' وہ شوخی سے

بولا۔ ''ایک اپنے پاس ہیں ہزاروں عذر پیش کئے بتیرا گڑگڑائے کہ حضور ہماری غلطی کوئی نہیں۔ ہمیں بے یار و مددگار دیار غیر میں نہ بھیجو۔''

''اچھا تو تمہارے لئے یہ دیار غیر ہے؟'' نیرو نے خوبصورت پلکوں کو دلکشی سے جھپکایا۔

''بھئی پہلے تو تھا جب مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ منظر بھائی کے ساتھ آپ بھی ہیں۔''

''اور اب؟؟؟''

''اور اب وہ دیار غیر ہے سچ بھابی آپ تو میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔'' نیرو کا چہرہ کھل سا گیا۔ نوکر کو برتن اٹھانے کا کہہ کر وہ اس کیلئے چائے بنانے چل دی۔

خرم منظر صاحب کے۔ دور کے رشتے کا بھائی تھا۔ بیچارے کا کسی محکمانہ سازش کی وجہ سے یہاں تبادلہ کر دیا گیا تھا اور کچھ دنوں سے ان کے یہاں رہ رہا تھا اور دن رات اسی کوشش میں مصروف تھا کہ کسی طرح اس ناروا پوسٹنگ کو منسوخ کر دیا جائے۔ اس نے اعلان کر رکھا تھا کہ تین چار مہینوں میں تو یہ کام ضرور ہی ہو جائے گا۔ اسی لئے منظر صاحب نے اسے اپنے یہاں ٹھہرنے کو کہہ دیا تھا۔

وہ ہنس مکھ اور خوش شکل لڑکا تھا۔ باتونی بے انتہا۔ دلچسپ شخصیت کا مالک تھا۔ جلد ہی نیرو سے بے تکلف ہوگیا تھا۔ منظر صاحب سے بھی اس کی گاڑھی چھنتی تھی لیکن وہ اپنی مصروفیات میں الجھے رہتے۔ وہ گھر پہ ہوتا تو نیرو کا دل بھی بہلا رہتا۔

چائے بنا کر نیرو نے میز پر رکھی تو اس نے نئی کوزی میں رکھی چائے دانی کا ہینڈل ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ''لائیے میں آج چائے بناؤں۔''

''خیریت۔'' نیرو نے بھنویں اچکائیں۔ ''ویسے تو خیریت موجود اور خیریت مطلوب ہے۔ نیرو میری پی۔ اے بڑی نامعقول ہے۔ کہتی ہے تمہیں تو چائے تک بنانی نہیں آتی۔

نیرو نے مشکوک سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''ہوں۔'' تو یہ ٹھاٹ ہیں۔

''ٹھاٹھ واٹھ کچھ نہیں۔ اس کم بخت نے کوئی سکوپ ہی نہیں رہنے دیا۔

پرسوں ہی اس نے منگنی کی انگوٹھی پہنی ہے۔"

"چچ ...چچ ... تمہیں افسوس ہوا؟"

"بھلا افسوس کاہے کا۔ ایسی ایسی دس سیکرٹریاں تو میری جیب میں ہوتی ہیں۔"

"ایک آدھ ہمیں بھی دکھاؤ۔"

"جانے دیجئے بیچاری شرما جائیں گی۔" اس نے شرارت سے کہا اور سیٹی بجاتا ہوا چائے بنانے لگا۔

"واہ واہ آج تو خرم بھائی چائے بنا رہے ہیں۔ پچھلے دروازے سے شبو' رانی اور انجم نے دھاوا بولا۔ نیرو نے انہیں دیکھا تو کھڑی ہوگئی۔ "تم کیسے آئیں؟"

"بس سیر کا موڈ تھا آ گئے۔" انجم اٹھلائی۔

"خدایا آج کل کی لڑکیاں کیسی آوارہ گرد ہیں۔ سیر کے سوا تو انہیں کچھ سوجھتا ہی نہیں۔" خرم نے بڑی بوڑھیوں کے سے لہجے میں کہا تو شبو بولی۔

"ہاں جی لڑکے بیچارے جو بہت گھڑ ہیں۔ گھر بیٹھے چائے وائے بناتے رہتے ہیں۔"

"خیر لڑکے بیچارے تو ہوتے ہی بہت نیک ہیں۔"

"جی ہاں ڈریکولے جیسے۔" شبو نے اس کا منہ چڑایا۔

نیرو تب تک چائے لے آئی تھی۔ وہ بھی خرم نے ہی بنائی اور پیالیاں ان کی طرف بڑھا دیں۔ رانی نے پوچھا۔ "نیرو آپا منظر بھائی کھانے پہ نہیں آئے۔"

نیرو کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ خرم ہنس پڑا۔ "بھئی وہ شہنشاہ آدمی ہیں مگر رعایا کو دیکھنے کی فرصت ذرا کم کم ہی پاتے ہیں۔ رانی جی ہم ان کے خلاف آپ کی بارگاہ میں فریاد کرتے ہیں۔" اس نے تمسخر سے ہاتھ جوڑے تو رانی جھینپ سی گئی اور تیزی سے پلکیں جھپکنے لگی۔

شبو نے مذاق اڑایا۔ وہ کہتے ہیں ان کی غیر موجودگی میں آپ بھی رلجہ اندر بنے رہیں۔" نیرو نے یکبارگی خرم کی طرف دیکھا جو ہنستا ہوا اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔" بھابی جی اس گل شبو کو سمجھائیں کہ پریوں کا جھرمٹ تو آج ہی میسر آیا ہے ورنہ

ہم تو بے چارے بس چھوٹے موٹے سے سیکنڈ ہینڈ گلفام ہیں۔ بس ذرا سبز پری کی تلاش میں رہتے ہیں۔"

"تو پھر ملی سبز پری کہ اخبار میں اشتہار دینا پڑے گا۔" انجم نے شرارت سے کہا۔ تو اس نے ابرو نچا کر چاروں طرف دیکھا۔

"مل تو گئی ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اس کا رنگ تو کچا نہیں۔" نیرو کے رخساروں پر نامعلوم سی گلبیاں جھلکنے لگیں۔ رانی کے من میں بھی اک میٹھی میٹھی سی رسیلی تان جاگنے لگی۔ شبو نے پیشانی پر آئے بھورے بال جھٹکے۔ "اور وہ جو آپ کو دیکھے کہ گلفام نقلی تو نہیں تب؟" "ہم نے کہا تو ہے کہ ہم ہیں تو گلفام ہی لیکن۔"

"ذرا سے سیکنڈ ہینڈ۔" انجم نے اس کی بات مکمل کر دی تو وہ زور سے ہنس پڑا۔ "بھئی گلفام چاہے سیکنڈ ہینڈ ہو۔ پر ہوتا گلفام ہی ہے۔"

"سبز پری کا رنگ چاہے کچا ہو پر ہوتی تو سبز پری ہی ہے۔" شبو نے ہوبہو اس کی نقل اتاری۔

"کیوں بھابی جی آپ کا کیا خیال ہے۔" خرم نے گم صم بیٹھی نیرو سے سوال کیا تو وہ چونک گئی۔

"ارے بھابی جی۔" وہ میز پر جھک گیا۔ "ہم پریوں کی بات کر رہے ہیں۔ جنوں کی نہیں جو آپ ڈر گئیں۔ نیرو نے خوبصورت آنکھیں جھپکائیں اور ایک بار اس کی تیز چمکتی ہوئی آنکھوں میں دیکھا اور بولی۔ "تم جیسے جن کی موجودگی میں بھلا اور کس سے ڈرنے کی ضرورت ہے۔"

"ایسی ہی بے سروپا باتوں میں شام جھک آئی تو شبو' رانی وغیرہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ خرم بھی انہیں گھر تک پہنچانے چل دیا۔ نیرو کی طرف مڑ کر بولا۔ "بھابی آپ بھی چلیں سیر ہو جائے گی۔" وہ نہ جانے کیوں تذبذب کا شکار ہوگئی۔ کچھ سوچتی ہوئی سی بولی۔ "نہیں خرم۔ تم جاؤ۔"

"واہ تو آپ کیوں نہ جائیں۔" اس کا جی تو چاہ رہا تھا کہ اس گھٹی ہوئی فضا سے کہیں دور بہت دور چلی جائے۔ یہاں تک کہ تھک کر چور ہو جائے اور ہانپ کر گھنے سایہ دار درخت کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں آنکھیں موند کر بیٹھ رہے۔

"کیا ہیں آپ بھی بور چلتی کیوں نہیں۔" اسے خاموش دیکھا تو اس نے اصرار کیا۔ نیرو نے یوں ان سب کی طرف دیکھا جیسے ابھی ابھی بیدار ہوئی ہو اور پوری طرح سے سمجھ نہ پا رہی ہو کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ پھر کمزوری آواز میں بولی۔

"مجھے رات کے کھانے کا انتظام دیکھنا ہے۔ منظر شاید آج جلدی آ جائیں۔"

خرم زور سے ہنس دیا۔ "ایسا غضب بھی نہیں کیجئے گا جو ان کے وعدے پر اعتبار کر لیا تو پھر قیامت کا انتظار بھی کرنا پڑے گا۔" نیرو کا دل جیسے کسی نے مٹی میں دبا لیا۔ لڑکھڑا کر وہ سنبھلی اور آگے بڑھ کر ان کیلئے دروازہ کھول دیا اور کھڑکی سے باہر انہیں دور سڑک پر جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ دور سے وہ کتنا سمارٹ نظر آتا تھا۔ وہ رانی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ رک کر کوئی بات کہتا تو سب ہنس پڑتیں۔

☆......☆......☆

نیرو کے دل میں اک ہوک سی اٹھی۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے رانی نام کی رانی نہیں سچ مچ کی رانی ہو جس کو خرم جیسا شہزادہ ملا ہے۔ اک کرب کے عالم میں وہ پلٹی تو سامنے مینٹل پیس پر منظر صاحب کی تصویر پر نگاہ پڑی۔ ان کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ سجی تھی جس سے اسے نفرت تھی۔ شدید نفرت۔ جیسے اچانک کسی نے ہنستے ہنستے کسی خوفناک چیز کو دیکھ کر ہونٹ بھینچ لئے ہوں۔

منظر صاحب کے قریب رہتے ہوئے بھی وہ ان سے کتنی دور تھی جیسے ایک ہی راستے پر چلے جانے والے دو مسافر ہوں جو سفر کی کلفتوں اور ناآسودگیوں سے اس قدر تھک گئے ہوں کہ ایک دوسرے کا وجود بھی گراں معلوم ہونے لگا ہو لیکن ایک ہی سیدھ میں دیکھتے ہوئے دونوں چلے جانے پر مجبور ہوں اور خرم اس نے پھر کھڑکی سے باہر دیکھا دور جاتے ہوئے خرم کی قمیص ننھا سا سفید دھبہ بن گئی تھی لیکن یہ ننھا سا سفید دھبہ اسے اپنی آنکھ کی پتلی معلوم ہوا۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ذرا سا ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتی ہے۔

☆......☆......☆

موسم بے حد حسین تھا۔ برسات کی آمد آمد تھی۔ نمی سے لدی ہوئی ہوائیں نرم نرم اور خنک تھیں۔ اودی اودی گھٹاؤں میں سورج کہیں کھویا گیا تھا۔ چمکیلا دن

سہانی شام میں ڈھل رہا تھا۔ سانولا سلونا ملگجا اجالا۔ اک بڑی خوشگوار سی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ نیرو کب سے کھڑکی میں کھڑی ساون کے دلفریب حسن کا نظارہ کر رہی تھی۔ خوشگوار خنک ہوا نے روح میں اک سرشاری سی بھر دی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا منظر صاحب کچھ گنگناتے ہوئے شیو کر رہے تھے۔

نہ جانے کیوں نیرو کا جی چاہا کہ وہ بھی اس کے برابر آ کھڑے ہوں اور وہ ان کے شانے پر سر رکھے دلکش موسم کی سہانی کیفیتوں میں کھو جائے۔ اس نے پھر یک بار ان کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ وہ تولئے سے چہرہ صاف کرتے ادھر ہی آ رہے تھے۔ اسے کھڑکی میں کھڑی دیکھا تو وہ بھی اس طرف ہی آ گئے۔ کھڑکی سے آتے ہوئے ہوا کے سبک جھونکوں میں شیونگ کریم کی مہک نیرو کے ناک میں گھس گئی۔ انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور باہر دیکھتے ہوئے بولے۔ "ادھو پھر بارش کے آثار ہیں۔"

"دیکھا کتنا اچھا موسم ہو گیا ہے۔" نیرو بے ساختہ کہہ گئی۔ "ہاں !! موسم تو اچھا ہے ہر گاڑی کا کباڑا ہو جائے گا۔" انہوں نے بیزاری سے کہا تو نیرو کا جی چاہا کہ ابھی کھڑکی سے باہر کود جائے اور چپ چاپ بارش میں پڑی بھیگتی رہے۔ یہاں تک کہ اس کی روح ان سہانے بادلوں اور بارش کی ننھی ننھی پھوار سے سرگوشیاں کرتی ہوئی اس نیلگوں آسمان تک چلی جائے کہ دیکھو میں تمہارے حسن پر نچھاور ہوئی ہوں۔

"ویسے ٹمپریچر میں کمی ہو جائے گی۔ پچھلے دنوں تو گرمی نے بے حال کر دیا۔" انہوں نے ٹھنڈی ہوا سے اس کے لہراتے ہوئے بھورے بالوں کو اس کے کان کے پیچھے سمیٹتے ہوئے کہا۔

نیرو کچھ بھی نہیں بولی۔ اس کا جی چاہا کہ رو دے اس سہانے موسم نے بھی منظر صاحب کی روح پر کوئی لطیف احساس مرتسم نہیں کیا۔ سوائے اس کے کہ درجہ حرارت میں کمی ہو جائے گی۔ کاش یہ شخص آدمی ہونے کے بجائے درجہ حرارت ناپنے کا آلہ ہوتا اس نے اجنبیوں کی طرح سوچا۔

☆......☆......☆

"چلو ناشتہ تو لگوا دو۔ اور ہاں میرا رین کوٹ بھی نکلوا دینا۔ شاید آج مجھے باہر جانا پڑے۔ یہ بارش بھی عجیب مصیبت ہے۔" انہوں نے پھر بارش کو کوسا تو نیرو کا

جی چاہا کہ بارش کے اس سندر شفاف ترشے ترشائے قطروں کو اپنی روح میں بھر کر ان کی نظروں سے ہمیشہ کیلئے پوشیدہ کر دے۔ یہاں تک کہ یہ دھوپ کی تمازت میں جلتے جلتے۔ ان بھیگے بھیگے موتیوں کی آرزو کرتے کرتے مر جائیں۔" منظر صاحب نے اسے خاموش دیکھا تو شانوں سے پکڑ کر اپنی طرف گھما لیا۔ اس کے چہرے پر مسلے ہوئے جذبات کا اک انوکھا سا رنگ تھا۔

"تم کتنی خوبصورت ہو۔" انہوں نے ہزار بار کا چبایا ہوا فقرہ بغیر کسی لطیف احساس کے دوہرایا تو رومانی دنیا میں بسنے والی نیرو نے سوچا کہ اس خوبصورتی کو نوچ کر کہیں پھینک دے۔ جس کی توصیف کرنے کا اسے سلیقہ نہیں جس کی بھینٹ پہ دلکشی چڑھائی گئی ہے۔

"تم واقعی خوبصورت ہو۔" انہوں نے بے ڈھنگے پن سے کہا۔ جب بچے پہاڑہ پڑھتے ہیں۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھاما اور جھکے نیرو نے یوں سہم کر بند ہوتی آنکھیں کھولیں جیسے موت کو سامنے دیکھنے والا اک لمحے کو ششدر رہ جائے۔ اس نے اپنا چہرہ ان کے ہاتھوں سے چھڑا لینا چاہا لیکن ان کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ کھڑکی کے پٹ سے لگ گئی۔ وہ اور جھک گئے۔ ان کی ٹھوڑی پہ لگی خراش سے رستے خون اور شیونگ کریم کی تیز بو سے اسے ابکائی سی آنے لگی۔

پچھلے برآمدے کے ستون سے لگی وہ چپ چاپ سبز گھاس پر برستی بارش کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کبھی کبھی ہوا کے تیز جھونکے سے برستی بارش کی دھاروں کا رخ اس کی جانب ہو جاتا لیکن ہوا کے یہ بھیگے بھیگے جھونکے بھی اس کی روح کے تپتے صحرا میں کوئی نخلستان نہیں پیدا کر سکے تھے۔ دل کے ریگستان میں اب بھی لو چل رہی تھی۔ سامنے کچھ بھی تو نظر نہیں آتا تھا۔ گھٹاؤں نے اندھیروں کا روپ دھار لیا تھا۔ یہ من کا اندھیرا کتنا خوفناک ہے۔

دور گیٹ میں سے خرم برساتی اوڑھے داخل ہوا۔ اس نے پتلون کے پائنچے چڑھا رکھے تھے۔ پانی میں شڑاپ شڑاپ چلتا وہ اس کی طرف ہی آ گیا۔ نیرو نہ جانے کیوں پتھر سی ہو گئی تھی۔ اس طرح ساکت کھڑی تھی جیسے گرد و پیش سے بے خبر ہو۔ بارش کے ننھے ننھے قطرے اس کی دراز پلکوں کے خمیدہ گوشوں پر اٹکے تھے۔

بھورے بال ہوا سے لہرا رہے تھے۔ اس کے اودے آنچل کا اک سرا زمین سے چھوتا ہوا بھیگ رہا تھا۔ خرم نے برساتی اتار کر ایک جانب ڈالی۔ بالوں میں ہاتھ پھیر کر کھنکھارا تو نیرو نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی۔ وہ خاصا بھیگ گیا تھا۔ پتلون کے پائنچے چڑھائے پیشانی پر کھلے بھیگے بالوں سے وہ ایسا نٹ کھٹ سا نظر آ رہا تھا۔

"بھابی جی۔" سچ مچ جو کہیں میں پینٹر ہوتا نا تو بس ابھی آپ کی تصویر بنا لیتا۔" نیرو نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"سچ مچ یوں لگتا ہے جیسے آپ یہاں سے ذرا بھی ہٹ گئیں تو یہ بارش، یہ ہوا، یہ اتنا حسین موسم سب ختم ہو جائے گا۔ آپ تو بس۔ آپ تو بس۔ ساون کی شہزادی لگ رہی ہیں۔"

نیرو کے دل میں اٹھتے طوفان کو قرار سا آ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسی طرح کھڑی رہے۔ بارش رم جھم برستی رہے اور وہ یہ سب کچھ کہتا رہے۔ کہتا چلا جائے۔ اس نے پھر خرم کی طرف یوں دیکھا جیسے نگاہوں ہی نگاہوں میں اس سے التجا کر رہی ہو کہ وہ کچھ اور بھی کہے۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے خرم کچھ اور نہ کہے گا تو اس کا دم گھٹ جائے گا۔"

بھابی جی کتنا اچھا رنگ پہن رکھا ہے آپ نے / میں تو کہتا ہوں ساون میں ساری لڑکیاں ایسے ہی اجلے اجلے، نکھرے نکھرے رنگ پہنا کریں۔ تو برسات کتنی حسین ہو جائے۔ جدھر دیکھیں خوبصورت رنگ۔ حسین چہرے!!!۔"

نیرو اب بھی خاموش تھی۔ اس کے بھیگے چہرے پر گلابی رنگ اس طرح آہستہ آہستہ چھا رہا تھا جیسے کسی مردہ چہرے پر زندگی کی رمق دوڑ رہی ہو۔" بھابی آج باہر موتیے کے گجروں والا ملا تھا۔ میں نے یہ گجرے آپ کے لئے لے لیے۔" اس نے بچوں کی سی سادگی سے دونوں ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیئے۔ جن میں موتیے کے پھولوں سے گندھے تر و تازہ گجرے مہک رہے تھے۔ نیرو کو محسوس ہوا جیسے ساری فضا موتیے کی خوشبو سے بھر گئی ہے۔ بارش کے قطروں کے بجائے آسمان سے موتیے کے مہکتے پھول برس رہے ہیں اور وہ ان میں آہستہ آہستہ دھنس رہی ہے۔ اس نے غیر ارادی طور پر ہی اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا۔ وہ جھجک سا گیا اور اپنی ہتھیلی پر دونوں

گجرے رکھ کر اس کی طرف بڑھائے۔ نیرو نے ایک بار اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ ''پہنادو۔''

''خرم نے بے یقینی سے پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی خاموش کھڑی کہیں دور برستے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی اور ہاتھ اس کی جانب بڑھا رکھا تھا لیکن اس طرح کہ گجرا اس کی کلائی میں پہنایا جا سکتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں رکھا نہیں جا سکتا تھا۔ خرم کو محسوس ہوا جیسے وہ واقعی ساون کی دلربا شہزادی ہے جو اسے گجرے پہنانے کا حکم دے رہی ہے۔ اس کے اس ناز آمیز تحکم پر وہ مرعوب سا ہو گیا۔ اس نے دھیرے سے اس کے بھیگے بھیگے ہاتھ پکڑے اور موتیے کے مہکتے گجرے اسے پہنانے لگا۔ نیرو نے اپنی دونوں کلائیوں کی طرف دیکھا اور گنگناتی سی آواز میں بولی۔

''اچھے ہیں۔''

خرم نے خوش دلی سے کہا۔ ''خوبصورت تھے تو لیے تھے۔ آپ کے پہننے سے تو بہت خوبصورت ہو گئے۔'' نیرو کی آنکھوں میں ایک پیاس سی اتر رہی تھی۔ وہ انہی لفظوں کی تو پیاسی تھی۔ وہ لفظ جو چاہتوں کو نئے معنی دے دیں۔ کبھی پیار کو چھپا دیں۔

کبھی نکھار دیں۔ وہ کہتا گیا۔ ''آج میں نے سوچا کہ موسم ایسا زبردست ہے بھلا' آج بھی ایسا دن ہے کہ خود کو فائلوں میں ضائع کریں۔ آج تو جی چاہتا ہے' یہاں بیٹھے بیٹھے چپ چاپ ملہار سنتے رہیں۔'' اس نے دور تک پھیلے بارش میں بھیگے سبزے کی طرف دیکھ کر کہا۔

نیرو نے اک خوشگوار سی حیرت اور اچانک پنے سے اس کی طرف دیکھا اور بیتابی سے بولی۔ ''تمہیں بھی۔ تمہیں بھی؟؟ اس کا شوق ہے۔''

''ارے بھابی آپ کیوں مجھے بدذوق سمجھنے پر تلی ہیں۔''

''پر' پر تمہیں بھی؟؟؟''

''اور کیا مجھے نہیں۔ ساون تو نام ہی سروں کا ہے۔'' اس نے رسان سے کہا تو نیرو کو اپنے گرد سر بکھرتے محسوس ہوئے۔ اس نے ایک عجب سی مسرور نظر اس پر ڈالی

جو برآمدے کی سیڑھیوں پر اس طرح پیر لٹکائے بیٹھا تھا کہ اس کی ٹانگیں بارش میں بھیگ رہی تھیں۔ اس نے کھلنڈرے سے خرم کی طرف دیکھا۔ منظر صاحب کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور ان کی آواز کانوں میں گونجنے لگی۔

اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ایسی ہی دھاروں برستی بارش میں وہ بیر بہوٹی سے کپڑے پہنے یوں ہی ستون سے لگی کھڑی تھی۔ بارش کے چھینٹوں سے اس کا گلنار چہرہ یوں بھیگا بھیگا سا تھا جیسے شبنم نے گلاب کو ایک ہی بار میں بھگو دیا ہو۔ منظر صاحب جو خاصی دیر سے برآمدے میں کرسی پر بیٹھے تھے۔ وہیں سے بولے۔ ''نیرو یہاں آ جاؤ وہاں کھڑی کیوں بھیگ رہی ہو؟'' نیرو نے ایک شرمیلی نگاہ ان پر ڈالی جیسے انہیں بھی بھیگنے کی دعوت دے رہی ہو۔ اس کی نگاہوں سے رکے رکے سے جذبات کی پھوار سی برس رہی تھی' وہ کرسی سے اٹھے اور اس کے قریب پہنچ کر انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے اپنے دونوں بھیگے ہوئے ٹھنڈے ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور ہولے سے بولی۔

''موسم کتنا اچھا ہے۔ آیئے یہاں بیٹھ کر ملہار سنتے ہیں۔''

''نہیں نیرو آؤ نا اندر چلیں۔ ایسی بھیگتی رہو گی تو زکام ہو جائے گا۔ دیکھو فریج میں آم ہوں تو ذرا نکال کر کاٹو ساتھ کوئی ریکارڈ بھی سن لیں گے۔''

منظر صاحب نے اسے اپنی جانب گھما لیا۔ تو اس کا دل چاہا کہ ان کے منہ پر تھوک دے۔

اور آج خرم وہیں بیٹھا کہہ رہا تھا کہ ملہار سنتے ہیں۔ وہ تو سروں کی دیوانی تھی لیکن منظر صاحب کی اوقات پھٹیچر فلمی گانے ہی تک تھی لیکن خرم......؟

وہ وہیں گھٹنوں کے بل جھک گئی اور اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر بولی۔

''خرم! تمہیں یہ سب پسند ہے؟''

''بھابی جی...... کوئی کافر ہی ہو گا جس کو یہ نہیں پسند ہو گا۔ اس نے غیر ارادی طور پر ہی اس کی فراخ پیشانی پر چپکے ہوئے بھیگے بال سنوار دیئے اور وہ اک نغمے کی طرح لہراتی ہوئی اندر چل دی۔

☆ ☆ ☆

نیرو اپنے گھر آنے کیلئے گاڑی میں بیٹھی ابھی گیٹ سے نکل ہی رہی تھی کہ گیٹ سے اندر آتا ہوا خرم عین راستے کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ ڈرائیور نے بریک لگائے تو اس نے کھڑکی سے منہ اندر ڈالا۔ ''بھابی جی' کدھر کی تیاریاں!!'' نیرو کو معلوم ہوا جیسے ساری کائنات یہیں سمٹ آئی ہے۔ اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ ''اپنے گھر!!!''

''ہمیں بھی لے جایئے۔'' نیرو کو محسوس ہوا جیسے اس کا دل خرم کی زبان پر آ گیا ہے۔ ''بڑے شوق سے۔'' وہ مسکرائی۔ اس نے پیچھے ہٹ کر دروازہ کھولا اور مستعدی سے بولا۔

''چلئے آپ آگے' اور خود دوسری طرف سے ہو کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے ڈرائیور سے بولا۔ ''چلو میاں عیش کرو آج تمہاری چھٹی۔''

نیرو نے ساتھ کی سیٹ پر گاڑی چلاتے ہوئے خرم کی طرف دیکھ کر سوچا۔ ''کاش زندگی اسی سفر میں بیت جائے راستہ دلچسپ باتوں میں کٹا۔ گاڑی گیٹ میں داخل ہوئی تو سامنے ہی سے محسن بھائی لنگڑاتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے بھی پلٹ کر دیکھا اور ایک طرف ہو گئے۔ ''یہ بھی اچھی مخلوق ہیں۔'' خرم ہنسا نیرو بھی ہنس پڑی۔ خرم نے گاڑی ان کے قریب سے گزارتے ہوئے شیشے سے چہرہ نکال کر انہیں 'ہیلو' کہا تو وہ چونک کر پیچھے ہٹ گئے۔ اتنی دیر میں وہ آگے نکل کر پورچ تک آ گئے تھے۔

صمدانی صاحب سے رسمی بات چیت کے بعد وہ اٹھ کر اندر آ گیا۔ ''ہیلو لیڈیز!!!'' اس نے سب کو بیٹھے دیکھ کر شوخی سے کہا۔ سب نے اس کی طرف دیکھا۔ رانی کا دلکش چہرہ تمتما گیا۔ شبو اور انجم نے اک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی اور کام میں مصروف ہو گئیں۔ نیرو کوئی رسالہ دیکھ رہی تھی۔ نازی کڑھائی کر رہی تھی۔ اس نے ذرا سا جھک کر شبو کے ہاتھ سے پنسل چھین لی۔ ''ہائے اللہ وہ چلائی۔'' دیجئے نا بھئی۔'' ''کیا دیں بھئی۔'' اس نے پنسل کان پر اٹکا لی اور دونوں خالی ہاتھ اس کے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔ شبو نے کھڑے ہو کر جھپٹا مارا لیکن وہ پھرتی سے پیچھے ہو گیا اور دہائی دینے لگا۔

''بھابی جی دیکھئے شبو مجھے مار رہی ہے۔'' شبو جھنجھلائی۔

''کیا مصیبت ہے دے دیں نا بھئی۔''

''لو بھئی۔ رانی مجھے بچاؤ اس سے۔ خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑی ہے۔'' اس نے رانی کے سامنے تمسخر سے ہاتھ جوڑے تو اس کا خوبصورت چہرہ گلابی ہو گیا۔ نیرو اور انجم بھی ہنس دیں۔

''ہے کہ نہیں ظالم۔'' خرم نے پھر مذاق اڑایا تو وہ منہ پھلا کر بیٹھ رہی۔

''اب چائے بھی کسی اور سے پی لیجئے گا سمجھے آپ۔''

''چائے تو ہم کو رانی بھی پلائیں۔ پر رانی جی سے ہم کام کیوں کروائیں۔ چائے بناؤ گی اور تم ہی بناؤ گی۔'' اس نے نازی کے ہاتھ سے سوئی چھین کر شبو کی طرف چبھونے کے انداز میں بڑھائی تو وہ آنکھیں جھپک کر پیچھے ہو گئی۔ اکتا کر بولی۔ ''ہائے خرم بھائی کیا مصیبت ہے۔''

''تم سے بڑی مصیبت کیا ہو گی۔'' رانی نے اسے باتوں میں الجھا دیکھا تو موقع غنیمت جان کر اس کے کان پر سے پنسل جھپٹ لی لیکن خرم نے ایک دم پلٹ کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ رانی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ خود بخود اس نے مٹھی کھول دی۔ پنسل خرم کی گود میں گر پڑی۔ خرم سوئی اس کے دہکتے رخسار تک لے گیا اور رعب ڈالتے ہوئے بولا۔

''رانی ہو کر چوری کرتی ہو ''

رانی کچھ بول نہ پائی۔ شبو نے پلک جھپکتے میں اس کی گود میں گری پنسل اٹھا لی اور دھاگہ زور سے کھینچا تو سوئی خرم کے ہاتھ سے نکل گئی۔ خرم اس کی طرف پلٹا تو اس نے منہ چڑایا۔

''خرم بھائی چلئے آج ڈرائیو پر چلتے ہیں '' نازی نے تجویز رکھی۔ انجم بھی لپک کر قریب آ گئی۔

اس وقت شور سا مچ گیا..... گڑیا روتی ہوئی اندر آئی اس نے ایک ہاتھ سے تمت کا بازو پکڑ رکھا تھا جس کی رنگت خوف سے اڑی ہوئی تھی۔ خرم نے بھی حیران ہو کر دونوں کی طرف دیکھا۔

''کیا ہوا......؟'' شبو نے پوچھا۔
''اس نے میرا کلر بکس لے لیا ہے۔'' گڑیا ٹھنکی۔
شبو نے تمت کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب کھینچا اور تلخی سے بولی۔ ''کیوں تمو...... تم نے لیا ہے......؟''
تمت جس نے ٹھوڑی گردن میں گھسا رکھی تھی خاموش کھڑی تھی۔
''عجیب مصیبت ہے...... ہر وقت ان دونوں کا کوئی نہ کوئی جھگڑا ہی کھڑا رہتا ہے...... چل تمو...... جا اس کا کلر بکس لا کر دے...... ہزار دفعہ سمجھایا ہے کہ ایک دوسرے کی چیزیں نہ لیا کرو......''
گڑیا کی خوبصورت نیلی آنکھیں شرارت سے چمکنے لگیں...... تمت باہر گئی اور تھوڑی دیر میں کلر بکس لا کر میز پر رکھ دیا...... گڑیا نے جلدی سے ڈبہ اٹھایا اور قلانچیں بھرتی باہر بھاگ گئی۔
''تیرا کلر بکس کدھر ہے......؟'' انجم نے تمت سے پوچھا۔
وہ خاموشی سے چلتی ہوئی دروازے کی طرف چلی گئی۔
''منہ سے بھی کچھ نہ پھوٹنا اچھا......'' نازی نے چڑ کر کہا۔
''یہ کون ہے......؟'' خرم نے پوچھا۔
''بہن ہے ہماری گڑیا سے بڑی ہے۔'' رانی نے بیزاری سے جواب دیا۔

☆......☆......☆

''اچھا......؟'' خرم حیران رہ گیا۔ ''لگتا تو نہیں۔''
''سبھی یہی کہتے ہیں۔'' نازی نے بتایا۔
''واقعی وہ تم لوگوں سے بہت مختلف ہے اور گڑیا تو سچ مچ کی گڑیا ہے۔ اور یہ......؟''
تمت نے ایک بار پلٹ کر دیکھا اور پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔
سامنے سے ہی گڑیا دونوں کلر بکس لئے آ رہی تھی اسے دیکھا تو منہ چڑا کر بھاگ گئی۔
تمت کی آنکھیں ایک دم ہی چھلک گئیں۔ فراک کے دامن سے آنسو پونچھتی وہ گھر کے پچھواڑے نکل گئی۔ ادھر ادھر دیکھ کر وہ چوڑے پتھر پر کھڑی ہوئی اور اندر جھانکنے لگی۔ اس کے ستے ہوئے چہرے پر اک مرجھائی ہوئی سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ کچھ دیر بعد دائیں بائیں بھی جھانک لیتی تھی کہ کہیں کوئی آ تو نہیں رہا اور پھر وقفے وقفے سے اندر دیکھتی جاتی۔
ہارن کی آواز سے گھبرا کر وہ پلٹی اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی گیٹ کی طرف آ گئی۔ پورچ میں نیرو آپا کی کار کھڑی تھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر خرم بیٹھا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ انجم' نازی اور شبو سب گھسی بیٹھی تھیں۔ خرم نے گاڑی اسٹارٹ کر دی کہ رانی دروازہ کھولتی ہوئی جھپٹ کر باہر نکلی اور گڑیا کو آواز دینے لگی۔ گڑیا نہ جانے کہاں سے لڑھکتی ہوئی آئی اور پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔
تمت اکھڑے اکھڑے سے قدم لیتی پورچ تک آ گئی۔ برآمدے کے ایک ستون کے پاس محسن بھائی خاموش کھڑے تھے۔ وہ بنا آہٹ کے ان کے قریب چلی

آئی۔ کئی بار اس نے چاہا کہ ان کا ہاتھ پکڑے ان کے گلے میں باہیں ڈال دے۔ ان کے ساتھ پارک میں جا کر اتنا کھیلے کہ محسن بھائی کا ستا ہوا چہرہ ہنس ہنس کر سرخ ہو جائے۔ لیکن اس کی ہمت نہیں پڑی۔ کئی بار وہ ان کی قیمض کا دامن چھوتے چھوتے رہ گئی۔ ناچار انگوٹھا چوسنے لگی لیکن وہاں سے ہٹ جانے کو بھی اس کا جی نہیں چاہا۔ محسن بھائی نے خود ہی پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کانپ سی گئی۔

''تمت کیا کر رہی ہو۔'' انہوں نے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''آج تم نہیں پڑھوگی؟''

''ہوں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ان کا ہاتھ چھوڑ کر اندر پڑھنے کیلئے چل دی۔

☆ ☆ ☆

انہیں واپس چھوڑ کر نیرو جب خرم کے ساتھ گیٹ سے باہر نکل رہی تھی تو خرم نے کہا۔ ''بھابی جی جشن ہو گئے آج تو۔''

''تمہاری جشن کے علاوہ بھی کوئی بات ہوا کرتی ہے۔'' نیرو نے ہنس کر کہا۔

''آپ کے ساتھ ہوں تو پھر جشن نہ ہو تو کیا ہو۔'' وہ دلکشی سے مسکرایا تو نیرو نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''باتیں نہ بنایا کرو زیادہ۔'' اس نے بظاہر خفگی سے کہا مگر انداز میں سو التفات چھلکتے تھے۔

''او بھابی۔'' اس نے اپنی مخصوص بے تکلفی سے کہا اور سگریٹ کا دھواں اس کی جانب چھوڑ دیا۔ ''ہم باتیں نہ بنائیں تو کیا کریں یعنی آپ ذریعہ اظہار پر کیوں سنسر شپ لگانے لگیں۔''

نیرو کے کانوں میں اک لمحے کو رس گھلنے لگا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔

''اظہار کا کسی کو ڈھنگ ہو جب ہے نا۔''

''او......'' اس نے پوری آنکھیں ایک بار کھول کر اس کی طرف دیکھا تو سامنے سے آنے والی گاڑیوں کی روشنی نے اس کی آنکھوں میں مشعلیں سی جلا دیں

اور نیرو کو محسوس ہوا کہ یہ مشعلیں اس کے سارے وجود میں جل بجھ رہی ہیں۔

''اظہار کا کوئی ڈھنگ بھی ہوا کرتا ہے۔''

''کیوں نہیں ہوتا۔'' ڈھنگ ہی تو اظہار کو دیرپا بناتا ہے ورنہ اظہار اظہار کہاں رہتا ہے۔''

''مثلاً کیسا ڈھنگ ہو۔'' وہ مسکرایا تو نیرو کے دل میں اک پھانس چبھ گئی۔ منظر صاحب دن رات اس پر بے ساختہ نچھاور ہوئے جاتے تھے۔ بات بات میں اس کے قصیدے پڑھتے تھے۔ ان کے اس بے تکے اظہار پر اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ کیا نہ کر دے۔ ان چاہے پیار کے اس ساگر میں بھی وہ پیاسی ہی تھی۔ اس نے بیکل ہو کر پہلو بدلا۔ اظہار ہی زندگی کا حسن ہے لیکن یہ حسن بھی کسی کسی کے حصے میں آتا ہے۔'' خرم نے ایک بار رخ پھیر کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ ڈھنگ ساختہ نہیں بے ساختہ ہوتا ہے۔''

''ہوں ہوں۔'' اس نے ہلکی سی سیٹی بجائی۔ بھابی جی حسن کو بھی بناؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہیرا اپنی چمک سے ہی دل لبھاتا ہے۔ ہزار پہلو ہوں۔ اکھ بناؤ ہوں تب ہی وہ دل کو لبھاتا ہے ورنہ مطلب کو عیاں تو اک گنوار بھی کر سکتا ہے۔''

''پھر ـ پھر!!'' بالکل صحیح میں بھی زندگی میں حسن کا قائل ہوں اور یہ حسن ہر پہلو میں ہونا چاہئے بلکہ ہوتا ہے۔ بس حسن نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے۔'' نیرو کے دل میں جیسے جھکڑ سے چل رہے تھے۔ اک عجیب سے حسرت ناک لہجے میں بولی۔ ''لیکن حسن نگاہ شاید بہت کم لوگوں کو ملا ہے۔''

''کیا ان کم کم لوگوں میں میرا نام ہے۔'' اس نے ذرا سا رخ اس کی جانب پھیرا اور آنکھوں کو دلکشی سے جھپکا۔ نیرو کا جی چاہا کہ اس کے شانے سے لگ کر وہ کچھ کہہ دے جو اس نے من ہی من میں اک انجانی ہستی سے کئی بار کہا تھا۔ وہ ایک جانب جھکی لیکن سنبھل گئی۔ بے ساختہ اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''ہاں''

اس کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوتی تھی۔ خرم نے پلٹ کر نہیں دیکھا نہ ہی کوئی جواب دیا۔ شاید وہ اس کے دل کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ اس نے شانے پہ گردن جھکائی جس پر اس کا چھوٹا سا گداز سفید ہاتھ رکھا تھا اور اپنے گال کے نیچے اس

کے سفید نم ہاتھ کو بھینچ لیا۔

☆ ☆ ☆

رانی کا چہرے کھلا کھلا سا تھا۔ من میں اک مدھر سا نغمہ گونجتا تھا جو اس کے لبوں تک آ کر لطیف سی گنگناہٹ میں ڈھل رہا تھا اور یونہی اک ہفت روزہ دیکھ رہی تھی۔ ورنہ اس کا ذہن تو کہیں اور تھا۔ آنکھوں میں کچھ جانی پہچانی سی تصویریں ابھر اور نکھر رہی تھیں۔ وہ پلکیں جھپکاتی تو وہی تصویر اک نئے زاویے میں ڈھل جاتی اور یہ نئے انداز' نئے زاویے اس کے دل میں جاگزیں تھے۔ ایسی سرور انگیز لذت سے وہ اب تک ناآشنا تھی۔ اس کی آنکھوں نے ایسے سپنے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اس کو پڑھنے لکھنے سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ کالج تو وہ اسی لئے جاتی تھی کہ سبھی لڑکیاں کالج جاتی ہیں۔ اماں بی چاہتی تھیں کہ ان کی لڑکیاں پڑھ لکھ کر کسی قابل ہو جائیں تاکہ بڑے بڑے گھرانے ان کی دہلیز پر آ کر ماتھا ٹیکیں۔ ماں کی یہ خواہش اس کے اپنے رنگین سپنوں کا محور بھی تھی۔ اسی لئے وہ انتظار کی ایک کیفیت میں تھی کہ کب وہ شہزادہ چپکے سے ان کے آنگن میں اترتا ہے اور مہکتی جے مالا اس کے گلے میں ڈال دیتا ہے اور اب تو وہ شہزادہ اس کے سپنوں سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا تھا۔ اسی لئے تو وہ بے چینی سے آرزو کرنے لگتی۔ ''آج کبھی نیرو آیا آ جائیں۔''

باہر گڑیا اور تمت میں زور کی لڑائی ہو رہی تھی۔ گڑیا نے تمت کے بال مٹھی میں دبا رکھے تھے اور زور زور سے کھینچ رہی تھی۔ تمت سہمی سی کوئی مزاحمت بھی نہیں کر رہی تھی۔ اپنے اپنے کمروں سے دونوں ایک ساتھ نکلیں شبو نے آتے ہی دونوں کو الگ کیا۔ گڑیا جلد جلد اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔ تمت کی شکایتوں کے دفتر کھلنے لگے۔

''لعنت ہے تم پر۔'' شبو جھنجلائی۔ ایک تھپڑ تمت کے رسید کیا۔ گڑیا موقع دیکھ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے محسن بھائی اوپر آ گئے۔

''شبو تم ہمیشہ تمت کو مارتی ہو حالانکہ قصور ہمیشہ گڑیا کا ہوتا ہے۔'' شبو کا پارہ اور بھی چڑھ گیا۔ تنک کر بولی۔ ''آپ بڑے آئے ہیں ہمدرد بن کر۔ ماروں گی' ماروں گی اور ماروں گی۔'' اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ تمت کے بال کھینچ کر اسے تھپڑ لگانے کو ہاتھ بڑھایا تھا کہ محسن بھائی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور سختی سے جھٹک کر بولے۔ ''تمت

تمہارے نزدیک انسان نہیں۔'' شبو ان کی غیر معمولی سختی سے کچھ پشیمان تو ہوئی لیکن پھر غصے سے کانپتی ہوئی بولی۔

''آپ کون ہوتے ہیں ہمارے گھر کے معاملے میں بولنے والے؟''

محسن بھائی کا چہرہ یوں اتر گیا جیسے اونچائی سے گر پڑے ہوں۔ آہستگی سے بولے۔ ''گھر کا معاملہ ہو تو اور بات ہے یہ انسان کا معاملہ ہے اور یہاں شاید کسی کو انسان سمجھا ہی نہیں جاتا۔''

رانی کو اپنے سپنے بکھر جانے کا ملال تھا۔ چڑ کر بولی۔ ''اس گھر میں آپ جو ہیں سب سے بڑے انسان۔''

محسن بھائی نہ جانے کس خیال میں تھے بے ساختہ کہہ گئے۔ ''انسان کو دیکھنے کیلئے بھی آنکھوں کی ضرورت ہے۔''

شبو حقارت سے ہنس پڑی اور تمسخر سے بولی۔ ''اور وہ آنکھوں والے بس آپ ہی ہیں۔''

رانی نے لقمہ دیا۔ ''اب تو آپ بھی بات کرنے کے قابل ہو گئے۔''

محسن بھائی کا چہرہ ایک دم سے سرخ ہو گیا۔ پٹ کر انہوں نے رانی کی طرف دیکھا۔ ''بات کرنے کے قابل تو سبھی ہوتے ہیں۔ سننے کی تاب کسی کسی میں ہوتی ہے۔''

''اپنی حد میں رہا کر لڑکے سمجھا۔ پیچھے سے اماں بی کی زہر بھری آواز آئی تو سبھوں نے مڑ کر دیکھا۔ ''کیوں خواہ مخواہ لڑکیوں سے الجھتا ہے۔ تو تمت کا زیادہ ہمدرد ہے۔ ہماری وہ کچھ نہیں لگتی۔'' محسن بھائی کے چہرے پر اک رنگ آتا اور اک جاتا تھا۔ ضبط کی کوشش میں ان کے ہونٹوں کے گوشے لرز رہے تھے۔

تمت دیوار کے ساتھ چپکی کھڑی تھی۔ خوف سے اس کی آنکھوں میں آنسو خشک ہو گئے تھے اور گالوں پر آنسوؤں کے نشان اب تک موجود تھے۔ انگوٹھا اس کے حیرت سے کھلے ہوئے منہ میں تھا لیکن وہ اسے چوسنا بھول گئی تھی۔

''اب جا یہاں سے دفعان ہو۔ کھڑا ہمارا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔'' اماں بی نے حقارت سے کہا تو وہ لنگڑاتے ہوئے مڑے۔ اماں بی نے جھٹکے سے تمت کا انگوٹھا اس

کے منہ سے نکالا۔ ''اب تو بچی نہیں جو چوبیس گھنٹے انگوٹھا منہ میں لئے رکھتی ہے۔ ان کو سمجھاتے سمجھاتے تو ہمارا دماغ خراب ہو گیا کہ ہر وقت کی لڑائی بھڑائی اچھی نہیں۔ منت میں گھر کو تماشا بنا رکھا ہے۔ اماں بی کا جلال دیکھ کر رانی اور شبو بھی چپ چاپ کھسک گئیں۔ اماں بی گئیں تو تمت وہاں گھٹنوں میں سر دے کر بنا آواز کے چپکے چپکے رونے لگی۔ اچانک کسی نے اس کے بال کھسوٹ لئے۔ یہ گڑیا تھی جو جتنی خاموشی سے آتی تھی اتنی ہی تیزی سے بھاگ گئی۔

☆ ☆ ☆

رانی نے رسالہ اٹھایا اور شبو گانے کی تلاش میں ریڈیو کی سوئی گھمانے لگی۔

رانی کچھ دیر بے دلی سے رسالے میں الجھی رہی پھر رک رک کر بولی۔ ''شبو آج نیرو آپا کی طرف چلتی ہو۔''

رانی نے حیرت سے سوچا کہ مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ خرم کو دیکھے جیسے صدیاں بیت گئیں اور شبو کہہ رہی ہے کہ وہ کچھ دن ہوئے آئے تھے۔ کچھ جھینپی جھینپی سی بولی۔ ''یونہی میں نے کہا تھا' ذرا آؤٹنگ ہو جاتی۔''

شبو کھل کھل کر ہنس دی۔ ''آؤٹنگ یا کچھ اور؟''

''کچھ اور کیا؟''

''نہ سمجھے وہ اناڑی ہے۔'' شبو گنگنائی۔

''تم تو ہر بات میں ہی۔'' رانی نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کو کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر رسالہ سامنے کر لیا اور بات ادھوری چھوڑ دی۔ شبو ریڈیو چھوڑ کر اس کے قریب آئی رسالہ اس کے ہاتھ سے چھین کر بولی۔

''مجھے مشک وغیرہ کی خوشبو آ رہی ہے' جو تم مان جاؤ تو پھر آج ہی چلے چلیں گے۔ اماں بی سے اجازت لینا میرا کام۔''

رانی ہونٹوں کا اک گوشہ دانتوں تلے دبا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی میں بلبل کی سی دلربا چہچہاہٹ سنائی دی اور نظریں چراتی ہوئی بولی۔ ''بک بک نہ کر۔''

☆ ☆ ☆

سرما کی آمد کے ساتھ ہی بارش کا ایک زور دار چھینٹا ایسا آیا کہ ہواؤں کو یخ

بستہ کر گیا۔ ٹھنڈی ہوا میں نشتر کی سی کاٹ پیدا ہو گئی تھی۔ آفتاب بھی بھیگا بھیگا سا ٹھٹھرا ہوا کہر میں لپٹا تھا۔ اس کی ضیاء بار کرنیں' گہرے کہرے میں بھی کہیں گم ہو گئی تھیں۔ دن بھر بادلوں کی تہوں میں لپٹا وہ روشنی کے کسی سفیر کو دھرتی تک نہیں بھیج پایا تھا۔ ٹھٹھرا ہوا وقت منجمد ہو گیا تھا۔

سیاہ شال میں لپٹی ہوئی نیرو کا چہرہ کچھ سوچتا ہوا سا محسوس ہوتا تھا۔ اس کی سوگوار آنکھوں میں ایک جستجو جھانکتی تھی۔ اس نے دریچے سے باہر دیکھا' دور شاخوں کو اپنی چھڑی سے چھیڑتے' اچک کر پتے توڑتے اور انہیں بکھیرتے چہل قدمی کرتے ہوئے خرم کو اس نے پہچان لیا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے ہیٹر کے قریب بیٹھے ہوئے منظر صاحب کو دیکھا جو کچھ دیر ہوئی سو کر اٹھے تھے۔ اب کسلمندی سے ہیٹر کے قریب بیٹھے جمائیاں لے رہے تھے۔ نیرو کو معلوم ہوا جیسے ساری کائنات جمائیاں لے رہی ہے۔ موسم کے حسن' سرما کی خنک چھیڑ چھاڑ سے بے خبر وہ سستی کے سمندر میں ڈوبتی جا رہی ہے۔ اس کا جی چاہا کہ چمن میں لاابالی پن سے ٹہلتے ہوئے خرم کے بازوؤں میں بازو ڈال دے۔ کوٹ کے کالر اٹھائے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چلتی جائے' بنا یہ سوچے کہ اس کی منزل کہاں ہے؟

منظر صاحب نے اک نظر اس پر ڈالی۔ دریچے سے سر ٹکائے خواب گوں آنکھوں والی یہ نیرو ایک تصویر سی نظر آتی تھی۔ انہیں اپنی قسمت پر رشک آنے لگا۔ وہ دنیا کے خوش قسمت ترین انسان تھے۔ اتنی خوبصورت بیوی پا لینے سے متعلق تو انہوں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ خدا ان پر کتنا مہربان تھا۔ انہوں نے خوش ہو کر سوچا اور محبت پاش نظروں سے اس کی طرف دیکھتے چلے گئے۔

''نیرو!!'' وفور جذبات نے خاموشی کو توڑ دیا۔ نیرو کو محسوس ہوا جیسے یہ خوابناک سناٹا نہیں ٹوٹا۔ وہ خود چکنا چور ہو گئی ہے۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا لیکن معلوم ایسا ہوتا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہی۔

منظر صاحب نے پھر پکارا۔ ''نیرو میری جان یہاں آؤ۔''

☆ ☆ ☆

نیرو نے خالی خالی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اپنا فقرہ دہرایا۔ نیرو نے محسوس کیا کہ وہ ہولے ہولے دانت پیس رہی ہے۔ اس گھٹیا طرز کلمہ سے اسے کتنی چڑ تھی۔ جس میں گرم جوشی کے بجائے سوقیانہ پن جھلکتا تھا۔

''آؤ نا۔'' انہوں نے اصرار کیا۔

نیرو نے یوں ادھر ادھر دیکھا جیسے کوئی جائے پناہ تلاش کر رہی ہو۔ ان ان چاہی چاہت سے وہ بچ کر کہاں جائے۔ اس کے گھر والوں نے اسے بے ڈھنگی چاہت کے طوفان میں تن تنہا چھوڑ دیا تھا کہ وہ اپنے اکھڑتے قدم بڑی دقت سے جما پاتی تھی۔ انہوں نے پھر پکارا تو نیرو نے ٹھنڈے یخ ہاتھوں کو ایک دوسرے میں جکڑ لیا اور ہولے ہولے چلتی ان کے قریب چلی آئی۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑی اور اسے صوفے پر اپنے قریب بٹھا لیا۔

اس کے گرد بازو لپیٹتے ہوئے وہ اپنا چہرہ بالکل اس کے برابر لے آئے اور آہستہ سے بولے۔

''نیرو میں کتنا خوش قسمت ہوں، مجھے تم جیسی بیوی ملی۔''

نیرو کے حلق میں کڑواہٹ گھل گئی۔ اس نے اپنا سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔ ایسے براہ راست اظہار سے اسے کتنی کراہت محسوس ہوتی تھی۔ وہ رومانی طبیعت کی لڑکی، اشاروں کنایوں کی قائل تھی۔ چھپا چھپا سا، آنکھ مچولی کھیلتا ہوا طرز الفت جس میں انوکھا پن ہو۔ جس میں مچلتی ہوئی تمناؤں کا دلکش رنگ ہو جو کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ جائے۔ اس نے ہمیشہ اس کی تمنا کی تھی لیکن حسن کی یہ کھلی توصیف اظہار کے یہ بے باک انداز اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ اس گنوار پن سے کہے گئے فقرے نے ایک بار پھر اس کی شخصیت کو تار تار کر دیا تھا۔ ہونٹ کاٹتی ہوئی نیرو جو ان کی طرف ایک ٹک دیکھے جاتی تھی منظر صاحب کو پہلے سے بڑھ کر پیاری معلوم ہوئی۔ اس کی یہ دلربا خاموشیاں، سپردگی کے یہ معصومانہ انداز تو ان کی جان تھے۔

''تم کتنی خوبصورت ہو، میری جان۔'' انہوں نے والہانہ انداز میں اسے اور بھی قریب کر لیا کہ نیرو کا دم الجھنے لگا۔

نیرو کی آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے، جیسے آنسو ضبط کرنے کی

کوشش میں سرخ ہو جاتی ہیں۔ منظر صاحب نے کوٹ پہنا۔ باہر ہلکی ہلکی سی بارش ہو رہی تھی۔ گاڑی پورچ میں کھڑی تھی۔ ''سردی بڑھ گئی ہے۔'' انہوں نے کوٹ کے کالر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں گاڑی تو نہیں چاہئے۔''

نیرو ابھی خاموش ہی تھی کہ انہوں نے از خود جواز ڈھونڈا۔ ''چھوڑو آج ایسے گندے موسم میں کہاں جاؤ گی۔ اب اندر چل کر بیٹھو ہیٹر کے پاس کہیں ٹھنڈ نہ کھا جانا۔'' انہوں نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ نیرو اب بھی خاموش تھی۔ انہوں نے الوداعی ہاتھ ہلایا تو اس نے بھی جواباً الوداع کہا۔

☆......☆......☆

وہ گاڑی بڑھا لے گئے لیکن نیرو وہیں پشیمان سی کھڑی رہ گئی۔ جیسے کوئی گم کردہ راہ منزل کی تلاش میں ہو۔ وہ چپ چاپ کھڑی دور سبزے پر نگاہیں جمائے تھی۔ ہوا کے جھونکے سرد تھے لیکن دبیز شال کی گرمی میں وہ اک بڑی ہی خوشگوار سی نرم گرم کیفیت پیدا کر رہے تھے لیکن نیرو کا دل خزاں زدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ اس کے خواب اس طرح بکھرے تھے کہ وہ خود بھی ان کے ساتھ ریزہ ریزہ ہو گئی تھی۔ منظر صاحب کی ناگوار صحبت میں زندگی کا یہ سفر کتنا طویل اور تھکا دینے والا معلوم ہوتا تھا۔

جب وہ نئی نئی دلہن بنی تھی تو اس نے اس ماحول میں اپنے آپ کو ڈھال لینا چاہا تھا۔ اپنا وجود اس گھر کی فضا میں کھو دینا چاہا تھا۔ اس نے اپنی پیاسی فطرت کو کہیں سلا دینا چاہا تھا لیکن نباہ کی ہر صورت نے اس کی شخصیت کو بھی بگاڑ دیا تھا۔ محبت کے ہر انداز نے نفرت کے سوچلن بخشے تھے۔ منظر صاحب کی فطرت بدل دینا ناممکنات میں سے تھا۔ وہ تو اک ایسے مرد تھے جو گھروں میں بیوی کو صرف دل بہلانے کا اک کھلونا سمجھتے ہیں۔ جس سے اظہار محبت اک انوکھی و سرشار کیفیت کا حامل نہیں۔ محض ایک معمول ہے۔ بیوی کی تعریف کر دینا بھی ایسا ہی ہے، جیسے کوئی کھانے میں نمک مرچ کے متوازن ہونے کی تعریف کرے۔

وہ لطیف محسوسات سے کوسوں دور تھے۔ محسوسات کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ خوبصورتی کا احساس نفاست کا شعور، دلکشی کی لگن ان میں مطلق نہیں تھی۔ کاروباری گفتگو، بے ڈھنگا اظہار محبت، پست ذوقی، نیرو جیسی نازک احساسات کی

مالک لڑکی کیلئے اک قیامت سے کم نہیں تھا۔ نزاکت و لطافت تو انہیں چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔

ننھی ننھی بوندوں کے برسنے میں تیزی آ رہی تھی۔ گھٹاؤں کے جھک آنے سے اندھیرا اجالے پر چھا رہا تھا۔ ہوا سرد اور تیز تھی۔ نیرو نے ایسے رنگین موسم میں موم بتی کی لرزتی میٹھی سی روشنی میں گرم کافی پیتے ہوئے دلکش نرم سروں والی موسیقی سننے کی آرزو کی تھی۔ تو منظر صاحب وہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے خراٹے لینے لگے تھے۔ موسیقی کی نرم لہروں کے زیر و بم میں منظر صاحب کے خراٹوں نے جو ناگوار کیفیت پیدا کی تھی اس کا تصور کر کے آج بھی نیرو کی پلکیں بھیگ جاتی تھیں۔ یہ تو اکثر ہوا تھا کہ اس کے لطیف رومانی موڈ کو منظر صاحب کی بدذوقی نے غارت کر کے رکھ دیا۔

کسی کے دوڑنے کی آواز سے وہ چونکی۔ سامنے ہی خرم ہنستا ہوا بھاگ کر برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ اس کی ناک سردی سے سرخ ہو رہی تھی۔ سارٹ سا اوورکوٹ کہیں کہیں سے بھیگ گیا تھا۔ فر کی ٹوپی میں وہ اپنی عمر سے کہیں چھوٹا نظر آتا تھا۔ اس نے اک نگاہ نیرو پر ڈالی۔ سنہرے کام کی سیاہ شال میں اس کا گلابی چہرہ کتنا دلکش معلوم ہوتا تھا۔

خرم نے ٹوپی اتار کر جھاڑی۔ بالوں میں ہاتھ پھیرا ٹوپی پہن کر کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بولا۔ ''بھابی جی۔ ابھی بارش اور کتنی دیر ہوگی۔''

''مجھے کیا معلوم ہے؟'' نیرو نے شانے اچکائے۔

''اور آپ یہاں کب تک کھڑی رہیں گی؟''

''کیوں؟''

''جب تک کھڑی رہیں گی بارش برستی رہے گی۔''

''کیوں؟؟'' وہ حیران ہوئی۔

''جب تک کالی گھٹا رہے گی بارش تو ہوگی۔'' وہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دلکشی سے خم ہوا تو نیرو اس کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اس نے ایسی ہی انوکھی باتیں کرنے والے ساتھی کی تمنا کی تھی۔ جس کی باتیں سنتے ہوئے یہ معلوم نہ ہو کہ اگلے ہی لمحے وہ کیا کہنے والا ہے۔

وہ ہولے سے ہنسا۔ ''میں سوچ رہا تھا کہ بارش اتنی تیز کیوں ہو گئی اور معلوم نہیں کہ کالی گھٹا یہاں جلوہ افروز ہے۔'' وہ ہولے سے ہنسا اور پھر دونوں ہتھیلیاں رگڑ کر بولا۔ ''بہت ٹھنڈ ہو گئی ہے۔''

''تم کہاں تھے؟'' نیرو نے یوں ہی پوچھ لیا۔

''ایسے شاندار موسم میں سیر کے علاوہ کیا کیا جا سکتا ہے۔ ایسے حسین موسم کی رعنائی تو بس محسوس کرنے کی چیز ہے۔ کیوں بھابی جی؟''

نیرو تڑپ سی گئی بولی۔ ''چلو اندر چلیں۔ ہوا تیز ہو گئی ہے۔''

''شوق سے خرم نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور خم ہو کر اسے آنے کا اشارہ کیا۔ نیرو چپ چاپ آگے بڑھ گئی۔

خرم جلد ہی کپڑے تبدیل کر کے آ گیا۔ ہیٹر کے قریب صوفے پر پاؤں اٹھا کر آرام سے بیٹھتے ہوئے ذرا خوشامد سے بولا۔ ''بھابی جی اس وقت ذرا کڑک سی کافی ہو جائے تو کیسا رہے۔''

☆......☆......☆

نیرو دروازے میں ہی مڑ کر کچن کی سمت چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں وہ کافی لے کر پلٹی تو اس کے ساتھ خشک میوہ کی پلیٹ دیکھ کر وہ کھل اٹھا۔ ''واہ واہ بھابی جی ابھی کچھ اور بھی مانگ لیتا تو ہماری شہنشاہ بھابی حاضر کر دیتیں۔'' نیرو نے اک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی اور پیالی اس کے ہاتھ میں دے دی۔ خرم نے ایک ہاتھ میں پیالی پکڑ کر صوفے کے بازو پر رکھی اور نیرو کا ہاتھ پکڑ لیا۔ نیرو نے ہونٹ کاٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے معصومیت سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

''بھابی جی تکلیف تو ہو گی ذرا غزلوں کا ایل پی تو لگا آئیں۔''

نیرو نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا اور اپنا دوسرا ہاتھ بھی اس کے ہاتھ میں رکھ دیا اور آہستہ سے بولی۔ ''خرم میرے دل کی بات تمہاری زبان پر کیسے آ جاتی ہے۔''

خرم نے ایڑی اچکائے اور پوری سچائی سے کہا۔

''عنایت ہے جناب کی ورنہ ہم کس قابل ہیں۔''

نیرو نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ریکارڈ لگا کر اس نے کافی کی پیالی اٹھائی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ کمرے میں رسیلی موسیقی کی لہریں بکھر بکھر گئیں۔ باہر برستی بوندوں کی ہلکی ہلکی موسیقی نے سروں میں گھل مل کر اک امر نغمے کی تخلیق کر دی تھی۔ نیرو نے کبھی ایسی ہی تمنا کی تھی لیکن آج جب یہ آرزو پوری ہوئی تھی تو اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ ہنسے یا روئے۔

اس نے ایک بوجھل سی نگاہ خرم پر ڈالی جو کافی کی چسکیاں لیتا ہوا نغمے میں کھو کر رہ گیا تھا۔

کافی دیر سے محسن بھائی کپڑے استری کر رہے تھے۔ گھر بھر کے کپڑے وہی استری کرتے تھے۔ ذرا سی بھول چوک ہو جاتی تو اماں بی گھر سر پر اٹھا لیتیں۔ اب تو وہ انہیں کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیتے تھے۔ خود ہی کپڑے استری کر کے اماں بی کے کمرے میں پہنچا آتے۔ حد یہ تھی کہ بڑی اماں بھی استری کے بغیر کپڑا تن سے نہیں لگاتی تھیں۔

استری کچھ ٹھیک کام نہیں کر رہی تھی۔ سوچا اسے بھی لگے ہاتھوں ٹھیک کر ہی دیں۔ پیچ کس لینے کو انہوں نے شیلف میں رکھی کتابیں الٹ پلٹ کیں تو نیچے پاؤں کسی کے پاؤں پر آ گیا۔ عجلت میں پیچھے ہٹے اور جس میز کے اوپر شیلف رکھا تھا۔ اس کے نیچے جھانکا۔

سمٹی سکڑی تمت کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر انہوں نے باہر کھینچ لیا۔ تمت ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ انہوں نے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھا کر اس کے چہرے سے بال ہٹائے۔

''تمی! کیا کر رہی تھیں یہاں۔'' وہ خاموش رہی۔ بولی کچھ نہیں۔ انہوں نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے رخسار پر انگلیوں کے نشان واضح تھے۔ آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں بار بار اس کا نچلا ہونٹ ٹیڑھا ہو جاتا تھا۔ رنج سے ان کا دل کٹ کر رہ گیا۔ فرش پر اکڑوں بیٹھے تو اس کے برابر آ گئے۔ پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ ''تمو! چندا تجھے کس نے مارا ہے؟'' کبھی کے رکے ہوئے آنسو ایک دم ہی بہہ نکلے۔ جنہیں وہ بڑی بے دردی سے ہاتھوں سے

پونچھنے لگی۔

''تمہی بتاؤ نا کسی نے کچھ کہا۔'' وہ اب بھی سہمی ہوئی ٹکر ٹکر ان کی جانب دیکھتی چلی گئی۔

''اچھی سی منی ہے نا بتاؤ گڑیا نے مارا۔ اماں بی نے' اچھا تو شبو نے......''

''بڑے لاڈ ہو رہے ہیں۔'' اس طنزیہ لہجے پر محسن بھائی نے گھوم کر دیکھا اور تمت نے دبک کر اس کی قمیض کا کف پکڑ لیا۔ شبو کھڑی تھی۔

''میرا نام کیوں لے رہے تھے؟'' اس نے اکھڑ پنے سے پوچھا۔

محسن بھائی نے ناراضی سے منہ پھیر لیا اور تمت کا ربن باندھنے لگے۔

''جواب کیوں نہیں دیتے کیوں لے رہے تھے میرا نام؟'' شبو تنک کر ان کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

انہوں نے اک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی اور لاپروائی سے بولے۔ ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارا نام لینے پر پابندی ہے۔'' شبو کو بڑا طیش آیا۔ محسن بھائی کا غصہ تمت پر نکالنے کو وہ تمت کی طرف بڑھی۔ زیادہ ہمدردی نہ جتایا کریں اس کے ساتھ آپ ہی نے اسے بگاڑا ہے۔''

محسن بھائی نے دانت پیس کر اس کی طرف دیکھا ''اور تمہیں کس نے بگاڑا ہے۔ تمہارے ساتھ تو میں نے کبھی ہمدردی نہیں جتائی۔'' ان کے انداز پر شبو کو پتنگے لگ گئے۔

''آپ بکواس نہ کریں زیادہ۔'' وہ چلائی تو محسن بھائی نے بڑے سکون سے اس کی طرف دیکھا اور نرمی سے بولے۔ ''واقعی تم بہت بگڑ گئی ہو۔ پتہ نہیں تمہیں کس نے اتنا بگاڑ دیا ہے کہ تمہیں بڑوں کے ساتھ بات کرنے کی بھی تمیز نہیں۔''

''ساری تمیز تو آپ کو ہی ہے۔'' تعریف کا شکریہ۔ خلاف معمول محسن بھائی نے مسخرے پن سے اسے آداب کر دیا تو شبو کو اور کچھ نہیں سوجھا تو قریب کھڑی تمت کو دھکا دے کر دروازے کی طرف بڑھایا۔ ''تو تو یہاں سے دفعان ہو۔ ہر وقت شکایتیں لگانے پہنچی ہوتی ہے۔'' تمت کے گرنے سے پہلے ہی محسن بھائی نے اسے سنبھال لیا۔ غصے اور رنج سے ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ انہوں نے بڑھ کر زور سے شبو کی

کلائی پکڑی اور اک اک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولے۔ ''شبو آئندہ میرے سامنے تمت کو کچھ مت کہنا۔ سمجھیں تم۔ وہ بھی انسان ہے آخر چلو اب باہر یہاں سے۔'' انہوں نے اسے دروازے کی طرف دھکیلا شبو نے حیرت سے ان کی جانب دیکھا۔ اسے محسن بھائی سے ایسی توقع تو ہرگز نہیں تھی۔

''فکر نہ کریں میں اماں بی سے آپ کی یہ اکڑ نکلواؤں گی۔ بڑھتے ہی جاتے ہیں۔'' اس نے دانت پیس کر کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

تمت لرز کر رہ گئی۔ان کا بازو تھام کر بولی۔ ''محسن بھائی اماں بی آپ کو ماریں گی۔''

''ارے بہن تمو میں تو اتنا بڑا ہوں بھلا مجھے کیسے مار سکتی ہیں۔'' محسن بھائی نے اس کے گال تھپتھپائے۔

''پر محسن بھائی شبو آپا تو کہتی تھیں۔'' اس کی آواز رندھ گئی۔

ارے بہن وہ تو یونہی کہتی رہتی ہیں۔ بس ظالم سی ہیں۔ چلو اب تم کھیلو میں ذرا استری کے ایک دو اسکرو ٹھیک کر دوں' انہوں نے ایک طرف بیٹھتے ہوئے کہا۔ تمت بھی سٹول پر ان کے قریب ہی بیٹھ گئی اور بڑی دلچسپی سے انہیں کام کرتے دیکھنے لگی۔ پھر ڈرتے ڈرتے بولی۔ ''محسن بھائی آپ کو استری ٹھیک کرنی کس نے سکھائی۔''

''مجھے خود ہی آ گئی۔''

''اور ریڈیو۔''

''وہ بھی مجھے خود ہی آ گیا۔''

''محسن بھائی آپ کو تو اتنے سارے کام آتے ہیں۔ اور مجھے کچھ بھی نہیں آتا۔''

''تم تو ابھی چھوٹی سی منی ہو پڑھ لکھ کر بہت بڑی سی ہو جاؤ گی تو تمہیں سارے کام آ جائیں گے۔''

''اچھا!!! محسن بھائی۔'' اس نے چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ان کی طرف دیکھا۔

''Sure'' وہ مسکرائے۔ ''پر اماں بی' رانی آپا' شبو آپا' گڑیا کہتی ہیں میں

نالائق ہوں۔ مجھے کچھ نہیں آتا۔'' کچھ بھی نہیں۔''

''انہیں خود کچھ نہیں آتا اس لئے تمہیں بھی کہتے ہیں۔''

تمت نے جواب نہیں دیا خاموشی سے کچھ سوچتی رہی۔ محسن بھائی نے اسے بقراط بنا دیکھا تو بے ساختہ مسکرائے۔ ''تمو مجھے ایک بات تو بتاؤ۔''

''جی......!!!'' اس نے ٹھوڑی تلے دونوں ہاتھ رکھے اور ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''چندا جب تم بڑی سی ہو جاؤ گی تو کیا بنو گی؟''

''ہیں۔'' تمت کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''ہاں...... ہاں بتاؤ بھلا۔'' وہ استری کی تاریں ٹھیک کرنے میں مشغول تھے۔ اس لئے اس کی طرف نہیں دیکھا۔

''محسن بھائی میں تو اب بن گئی ہوں تمت۔ اب میں کچھ اور تو نہیں بن سکتی نا۔'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔ محسن بھائی کو ہنسی آ گئی۔ ''کیوں نہیں تم تو بہت کچھ بن سکتی ہو۔''

''اچھا۔'' اس نے کچھ کچھ حیرانی اور خوشی کے لہجے میں بیقراری سے پوچھا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' انہوں نے بغیر اس کی طرف دیکھے کہا۔

''اچھا تو محسن بھائی۔ اچھا تو محسن بھائی تو پھر میں بتا دوں۔ بتا دوں۔''

''ہوں۔ ہوں۔'' انہوں نے ہمت سندھائی لیکن وہ پھر بھی کچھ جھجک گئی اور رک رک کر بولی۔

''تو محسن بھائی۔'' میں سچ مچ بن جاؤں گی۔''

''ہاں ہاں بھئی اب بتا بھی چکو۔ بنو گی اور تم ضرور بنو گی۔'' انہوں نے پیچ کس دانتوں میں پکڑ رکھا تھا۔ اس لئے عجیب سی آواز میں بولے۔

تمت کچھ دیر لفظ منہ میں تولتی رہی۔ کچھ تذبذب اور جھجک کا شکار بھی رہی پھر آگے کو جھک کر آہستہ سے بولی۔ ''محسن بھائی میں تو...... میں تو گڑیا بنوں گی۔''

''کیا؟؟'' محسن بھائی نے دفعتاً سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ سراسیمہ سی ہو گئی۔ جلدی سے بولی۔

''اچھا تو پھر محسن بھائی میں نہیں بنتی' آپ نے ہی تو کہا تھا کہ میں سب کچھ بن سکتی ہوں۔''

محسن بھائی نے چیزیں ایک طرف رکھیں اور اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولے۔ ''تمو' تم گڑیا کیوں بننا چاہتی ہو۔''

تمت شپٹا گئی تھی جیسے کوئی بہت بری بات کہہ گئی ہو۔ اس لئے جلدی جلدی صفائی پیش کرنے لگی۔ ''محسن بھائی وہ اتنی اچھی ہے اسے سارے کام آتے ہیں اور' اور اسے اسے۔'' وہ جھجکی تو محسن بھائی نے فوراً پچکارا۔ ''ہاں ہاں کہو اور اسے کیا ہے۔''

''اور' اور اسے' اسے سب پیار کرتے ہیں۔'' اس نے گردن ایک جانب جھکا دی اور ہونٹ کاٹنے لگی۔

محسن بھائی نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھاما۔ اس کا سانولا چہرہ کتنا معصوم تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی سیاہ آنکھیں بالکل خاموش تھیں۔ اس کے سادہ نقوش سہمے سہمے تھے۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ رک رک کر بولے۔ ''تمو' اب کبھی نہ کہنا کہ تم گڑیا بنو گی سمجھیں۔ اچھا چندا تم تمت ہو اور بہت اچھی ہو' بہت پیاری ہو' تمہیں جو کچھ بننا ہے' تمت کی حیثیت سے بننا ہے۔ تمہیں تمت ہی رہنا ہے۔ تم ایسی اچھی بنو' اتنی بڑی ہو کہ سب تمہیں پیار کریں۔ سب تمہاری عزت کریں' تمہارے ساتھ خوش رہیں' اچھا۔ !!!! اپنا نام نہیں بدلا کرتے' جو کچھ بھی بنیں' اپنے نام ہی سے بنتے ہیں۔''

تمت حیرت سے منہ کھولے ان کی طرف دیکھے جاتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی سی نمی جھلک رہی تھی۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''تو پھر محسن بھائی میں کیا بن جاؤں؟''

''تم' تم چندا پڑھ لکھ کر پروفیسر بننا' ڈاکٹر بن جانا' کوئی بہت بڑی آفیسر بن جانا' وکیل بننا۔''

''اچھا محسن بھائی۔'' وہ حیران رہ گئی۔

''ہوں!!!'' انہوں نے پیار سے کہا۔

''تو پھر میں ڈاکٹر بن جاؤں۔''

''ڈاکٹر' اچھا ڈاکٹر' وہ بھلا کیوں؟''

"وہ۔ وہ محسن بھائی۔" وہ شرما کر مسکرائی۔ "پھر میں آپ کے پاؤں علاج کروں گی' تو آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ بالکل' پھر آپ میرے ساتھ دوڑ لگائیں گے تو آگے نکل جائیں گے۔" وہ اٹھلائی۔

محسن بھائی کی آنکھیں ایک دم ہی بھر آئیں۔ اس کی یہ معصومانہ اپنائیت' یہ والہانہ شیفتگی ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی تھی۔ نفرتوں کے وار سہتے سہتے' پیار کی یہ نرم پھوار انہیں تروتازہ کرگئی۔ کچھ دیر وہ انہی جذبات میں سرشار رہے پھر بے ساختہ جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

اپنی اوقات میں رہا کرلڑکے۔ ہمارے ٹکڑوں پر پل کر آج تو بھی ہمارے منہ آنے لگا ہے۔ نہ چھوٹے کی شرم نہ بڑے کا لحاظ۔ تیرا کیا کام ہے لڑکیوں کے منہ لگنے کا۔ اماں بی کا غصہ کم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ بیچ میں بڑی اماں بھی لقمے دے رہی تھیں۔

"چھوٹے میاں نے ہی اسے سر چڑھایا ہے بہن کی بہن کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اب یہ جن کی اولاد ہے ان کے حوالے کریں۔ اولاد تو باپ کی ہوتی ہے۔ انہوں نے کاہے کو یہ ذمہ داری سر لے لی۔"

"ان کی تو بھلی پوچھی کسی کی سنتے ہوں تو تب ہے نا۔ کبھی پرائی اولاد بھی اپنی بنی ہے۔"

بڑی اماں نے تسبیح چھوڑ کر کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "توبہ ہے۔ آج کل تو اپنی اولاد بھی اپنی نہیں بنتی تو پرائی اولاد کا کیا بھروسہ لڑکے اب تو کہیں اور ٹھکانہ کر اپنا۔"

محسن بھائی نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا۔ "میں تو کب سے چلا گیا ہوتا لیکن ماموں رضامند نہیں ہوئے۔ ان کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں۔ میں انہیں ناراض نہیں کرنا چاہتا۔"

یہ بھی خوب رہی۔ جہاں فائدہ نظر آیا ماموں بنا لیا۔ ایسے ہی تو فرماں بردار ہیں۔"

"جس طرح نوکروں سے بدتر یہاں میرے ساتھ سلوک ہوتا ہے۔ مجھے ماموں کا خیال نہ ہوتا تو کبھی کا چلا گیا ہوتا۔"

"توکل کا جاتا آج چلا جا۔ دو وقت کی روٹی ملتی ہے تبھی بڑی بڑی باتیں بناتا ہے۔" بڑی اماں نے چڑ کر کہا۔ اماں بی کو بھی قہر چڑھا۔

"دور ہو میری نظروں کے سامنے سے اور خبردار جو تو نے آئندہ سے ہمارے گھر کے معاملے میں دخل دیا۔ اپنے کام سے کام رکھا کر۔ اس تمو کی بچی کے بھی کان کھینچوں گی۔ ہر وقت اس کی بغل میں گھسی رہتی ہے۔ اچھی بھلی لڑکی کو لاڈ کر کر کے بگاڑ دیا۔"

"آپ اس سے کچھ مت کہیں میں اس کو خود منع کر دوں گا۔" انہوں نے لجاجت سے کہا' انہیں تمت کی شامت سر پر کھڑی نظر آتی تھی۔

"ہاں تو تو اس گھر کا چوہدری ہے' سب کو سمجھاتا پھرتا ہے۔" اماں بی نے سختی سے کہا تو محسن بھائی کا خون کھول اٹھا جس دن سے وہ اس گھر میں آئے تھے۔ اماں بی کی زبان سے کبھی کوئی محبت بھرا کلمہ نہیں سنا تھا لیکن اب یہ باتیں ان کیلئے ناقابل برداشت تھیں۔ کئی بار انہوں نے جانے کا فیصلہ کیا لیکن جاتے بھی کہاں مشکل سے ابھی بی اے میں پڑھ رہے تھے۔ اس دوران میں تو انہیں کہیں کلرکی بھی نہ ملتی۔ وہ تو اس وقت ذلت کی زندگی سے چھٹکارا حاصل کر کے مزدوری بھی کر لیتے لیکن صمدانی صاحب ہر بار آڑے آئے۔ خاندان بھر میں ان کی ناک کٹتی تھی کہ بھانجے کو بڑے شوق سے گود لیا تھا لیکن بعد کو نبھا نہ سکے۔ عورتوں سے دب گئے۔ اس لئے انہوں نے پیار سے' دھمکی سے' منت سے' اسے ہر طرح سے سمجھایا تھا کہ وہ گھر سے باہر قدم نہ نکالے اور محسن بھائی چپ چاپ تقدیر کا ہر ستم سہتے جاتے تھے لیکن اب ممانی کے طعنے ان کی انا' ان کا ضمیر' ان کی خودداری یہ سب برداشت کرنے کو تیار نہیں تھی۔ فوج میں جانے کی سب سے بڑی آرزو کی راہ میں ان کی معذوری حائل تھی جس نے انہیں اور بھی احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ گھر بھر میں تمت ہی تھی' جو پیار کی بھوکی ان کے پاس آ جاتی تھی اور وہ بھی اس کی معصوم اور بھولی بھالی باتوں میں کھو کر اپنے آپ کو اس زہرناک ماحول سے بہت دور لے جاتے تھے۔

برآمدے میں سے گزرتے ہوئے انہوں نے اک اچٹتی سی نگاہ سامنے والے کمرے میں ڈالی جہاں سے باتیں کرنے اور ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

سامنے ہی خرم ساری لڑکیوں میں راجہ اندر بنا بیٹھا تھا۔ انہیں دیکھا تو وہیں سے چلایا۔
''آیئے نا محسن بھائی' کبھی ہمیں بھی خدمت کا موقع دیا کیجئے۔''

محسن بھائی پژمردگی سے ہنس دیئے۔ یہ خرم کتنا خوش قسمت ہے ہر وقت خوشیوں کے جھرمٹ میں گھرا' قہقہے بکھیرتا پھرتا ہے۔ دور سے ہاتھ ہلا کر وہ آگے بڑھنے کو تھے کہ اس نے لپک کر انہیں جا لیا۔ ''محسن بھائی ایسا بھی ہم سے کیا پرہیز تشریف لایئے نا۔''

انہوں نے مڑ جانا چاہا لیکن اس کا اصرار بڑھتا گیا۔ ایک تو موڈ ان کا پہلے ہی آف تھا اور پھر وہ سب لڑکیوں کے سامنے جانا بھی نہیں چاہتے تھے۔ وہ خرم کے ہمراہ ہی بیٹھ گئے تو سب لڑکیوں نے ناک بھوں چڑھائی۔ ''اے شبو!!'' خرم نے کشن اس کی طرف اچھالا۔ ''چلو جی ذرا چائے پلا دو تو محفل گرم ہو جائے۔''

شبو نے کشن ہاتھوں میں سنبھال لیا اور ناگواری سے بولی۔ ''ہاں جی فری سروس کی تو آپ کو عادت پڑی ہے۔''

''فری سروس ہی سہی لیکن ہو تو۔'' خرم نے اس کا منہ چڑایا۔

''ہم کسی کے نوکر نہیں لگے جو ہر وقت چائے بنایا کریں۔ آپ رانی سے کہیں وہ بنا دے گی۔'' شبو نے ترچھی آنکھوں سے رانی کی طرف دیکھا۔ وہ اخبار میں الجھ گئی۔

''خیر جی وہ تو ہوئیں رانی بلکہ مہارانی تمہارا نام بھی رانی ہوتا تو تم بھی مزے کرتیں۔ شبو قسم کے نام تو ہوتے ہیں' نوکرانیوں کے' مغلانیوں کے۔''

شبو کا پارہ ہائی ہوا۔ ''خرم بھائی جو میں قیامت تک بھی چائے بنا دوں' تو سہی۔''

خرم نے اسے اور چڑایا۔ ''شبو بیگم قیامت تو دور کی بات ہے ہم تو ابھی چائے پئیں گے اور تمہارے ہاتھوں کی پئیں گے۔''

''اور اس کے بعد آپ کی آنکھ کھل جائے گی'' شبو نے منہ چڑایا۔

بھئی محسن بھائی کے سامنے تو کچھ ہماری لاج رکھ لو۔'' خرم نے شرارت سے کہا تو شبو نے منہ پھیر لیا۔

نیرو نے ڈانٹا۔ ''شبو گھستی نہیں تو گھس نہیں جائے گی چائے بناتی ہوئی۔''

خرم کو بڑا لطف آیا۔ ''بھابی بس آپ کے گھر میں ہماری یہی عزت ہے۔''

''شبو اٹھ جا جلدی سے چائے بنا کر لا۔'' نیرو نے پھر کہا تو شبو بڑبڑاتی اٹھی۔ وہ تو کبھی نہ اٹھتی لیکن بات بڑھ جانے کا اندیشہ تھا اور خرم بھی ایسا حرفوں کا بنا تھا کہ کوئی بعید نہیں جو اماں بی سے بھی جا اس کی شکایت کرتا۔ اسی لئے وہ ناگواری سے اٹھی اور دروازے میں سے نکلتی ہوئی بولی۔ ''خرم بھائی آئندہ مجھ سے ہرگز بات مت کیجئے گا۔''

خرم بڑا محظوظ ہوا اور اسے چڑاتا ہوا بولا۔ محسن بھائی ایسی ندیدی لڑکی بھی کہیں دیکھی ہے آپ نے' گھر آئے مہمانوں کو چائے کا بھی نہیں پوچھتی۔''

☆......☆......☆

وہ گئی تو چائے کے انتظار میں ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ محسن بھائی بھی ہوں ہاں کی حد تک حصہ لے رہے تھے کہ اماں بی ادھر سے گزریں تو اندر آ گئیں۔ خرم ذرا مؤدب ہو بیٹھا۔ محسن بھائی بھی پہلو بدلنے لگے جیسے ہی ان کی نگاہ محسن پر پڑی ان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

''محسن!'' انہوں نے دبنگ لہجے میں کہا۔ ''تم نازی کا چشمہ لے آئے جو بننے کو دیا تھا۔''

محسن بھائی کھڑے ہو گئے۔ ''اس نے شام کا وقت دیا تھا۔''

''تو پھر جاؤ اب اور شام کونسی ہو گی۔''

''جی اچھا۔'' محسن بھائی ان کے طرز تخاطب پر بے حد خجل ہوئے۔ جلدی سے بغیر کسی کی طرف دیکھے وہ کمرے سے عجلت میں نکلے کہ ان کی بے لگام زبان کوئی اور زہر نہ گھولے لیکن ان کی آواز ان کا پیچھا کرتی رہی۔

''مجال ہے جو کام کوئی کر جائے کوئی بات اس کے دماغ میں رہتی ہی نہیں۔''

آواز کے ان بے رحم حلقوں میں وہ پس کر رہ گئے تھے۔ یہ تحقیر آمیز لہجہ ان کی شخصیت کو چور چور کر رہا تھا۔ تیزی سے وہ چلتے ہوئے گیلری سے باہر نکلے تو سامنے

سے آتی ہوئی شبو کے ساتھ زور کی ٹکر ہو گئی۔ دونوں کو دن میں تارے نظر آ گئے۔ شبو بڑے زور سے گرتی لیکن محسن بھائی نے سنبھال لیا۔ اس نے گھبراہٹ میں آنکھیں جھپک کر دیکھا۔ محسن بھائی اس کے کتنے قریب تھے۔ دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھے وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔ شبو ٹپٹا سی گئی۔ انہوں نے آہستہ سے سر جھکایا اور ہولے ہولے بولے۔

''دیکھ کر چلا کرو نا' بہت سے اور لوگ بھی راستے میں ہوتے ہیں۔''

شبو اپنی حالت پر حیران رہ گئی۔ محسن بھائی کی نگاہوں میں نہ جانے کیا تھا کہ وہ گنگ سی ہو گئی۔ بس ہونٹ کاٹنے لگی۔ کچھ کہہ نہیں سکی۔ انہوں نے اسے چھوڑ دیا اور آگے بڑھ گئے۔ شبو پشیمان آہستہ آہستہ چلتی کچن کی طرف نکل گئی۔

☆......☆......☆

محسن بھائی کچھ سوچتے ہوئے نپے تلے قدم لیتے' برآمدے کی طرف آ گئے۔ سامنے نظر اٹھائی تو تمت کو دیکھا۔ وہ کھڑکی کے قریب کھڑی نہ جانے کیا کر رہی تھی۔ انہیں دیکھا تو فوراً آہٹ آئی اور اضطراری میں انگوٹھا چوسنے لگی۔

''تمو تو یہاں کیا کر رہی ہے۔'' انہوں نے انگلیوں سے اس کے بال چھوئے۔

''کچھ نہیں محسن بھائی میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔'' اس نے دونوں ہاتھ ان کے سامنے پھیلا کر کہا۔

''آؤ چلتی ہو۔'' اس کے بھولے بھالے چہرے کی طرف دیکھ کر انہیں پیار آ گیا۔

''کہاں محسن بھائی؟'' تمت نے اشتیاق سے پوچھا۔

''بازار!!! اپنی تازی آپا کا چشمہ لینے۔''

''سچ مچ۔'' اس نے بڑھ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

☆......☆......☆

ان دنوں نیرو کتنی پریشان تھی۔ ان انجانی سوچوں' ان عجیب و غریب

وسوسوں کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ یہ زہریلی سوچیں اس کے انگ انگ میں بس بھر رہی تھیں۔ وہ مجبور تھی۔ وہ بے بس تھی۔ تقدیر کے فیصلوں نے اس کے ہاتھ کاٹ دیئے تھے۔ اس کو گونگا اور بہرہ بنا دیا تھا۔

اس دن اماں بی کی طرف گئی تھی تو انہوں نے موقع دیکھ کر اسے تاکید کی تھی کہ خرم اچھا خاصا کماؤ لڑکا ہے اور پھر کنوارا بھی۔ آگے پیچھے بھی کوئی نہیں اس لئے جانے نہ پائے۔ اس کا عندیہ معلوم کرو' کچھ سن گن لو تو رانی کو بھی چلتا کریں۔''

اماں بی کے اس سیدھے سادے فقروں نے جیسے اسے پیس کے رکھ دیا تھا۔ نہ جانے کیوں خرم کے متعلق ایسی بات سوچنا بھی اسے ناگوار معلوم ہوتا تھا۔ وہ منظر صاحب کی بیوی تھی ان کی بیاہتا تھی۔ انہی کی پابند۔ خرم سے بظاہر اس کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن قلبی رابطہ اندر ہی اندر کچھ ایسا استوار تھا جس کے ٹوٹنے کی آوازیں ابھی سے اس کی روح میں گونجنے لگی تھیں۔ اس طرح کہ اس کے دماغ کی نسیں پھٹنے لگیں۔

اسے معلوم تھا کہ خرم اس کا نہیں ہو سکتا لیکن یہ بھی دل گوارا نہیں کرتا تھا کہ وہ کسی اور کا ہو جائے۔ جس اپنائیت' محبت اور لگن سے وہ اس کے ساتھ پیش آتا تھا۔ نیرو کا جی چاہتا تھا کہ کسی کے ساتھ بھی وہ ایسا التفات روا نہ رکھے۔ اس کے ساتھ ایسی وابستگی تو نیرو کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی مگر جب سے اماں بی نے رانی کے متعلق اس کی رائے معلوم کرنے کو کہا تھا تو عجیب سی بیکلی اس کی رگ و پے میں سرایت کر رہی تھی۔ جس نے اس کے روئیں روئیں میں اک کرب انگیز ٹیس جگا دی تھی۔

خرم سے قربت اس کیلئے سوہان روح تھی۔ جس سے وہ پریشان ہو رہی تھی۔ اس کی حالت اس قیدی پرندے کی سی تھی جو قفس کی دیواروں سے باہر کی فضا کو اپنے بے حد قریب پاتا رہے لیکن قفس کی دیواریں اسے باہر کی فضا کو چھونے نہیں دیتیں۔ بے قراری کے عالم میں آج اسے دنیا کی ہر چیز سے نفرت ہو رہی تھی۔

منظر صاحب اسے اپنے مقدموں کی کارروائی سنانا چاہتے تھے لیکن اس نے سردرد کا بہانہ بنا دیا۔ انہوں نے پریشانی سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو نیرو نے بے التفاتی سے جھٹک دیا۔ اس کا موڈ آف دیکھ کر وہ شب بخیر کہنے کو اس پر جھکے تو اس نے

چہرہ تکئے میں چھپالیا۔ وہ کچھ دیر پریشان سے کھڑے رہے۔ جب ان کے قدموں کی چاپ دور ہوگئی تو بے اختیار نیرو کی آنکھوں سے دل کا درد ٹپکنے لگا۔ جس کا سبب وہ تھے لیکن اس سے بے خبر۔

صبح اٹھی تو رات کا درد وکرب تیز بخار بن گیا تھا۔ بے خوابی کا خمار سرخ آنکھوں سے عیاں تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ہمت نہیں پڑی۔ منظر صاحب جواس کے برابر ہی لیٹے تھے بیدار ہوئے تو خلاف معمول اسے بستر میں دیکھا تو انہیں یاد آ گیا کہ رات کو نیرو نے طبیعت خراب ہونے کی شکایت کی تھی۔ پریشان ہوکر وہ کہنی کے سہارے اس کی طرف جھک آئے۔ ''نیرو طبیعت ٹھیک نہیں کیا۔''

انہوں نے اس کا ہاتھ چہرے سے ہٹانے کو پکڑا تو بخار کی حدت محسوس کر کے جلدی سے اٹھ بیٹھے۔ نیرو خاموشی سے لیٹی رہی۔ ارے تمہیں کتنا تیز بخار ہے۔ انہوں نے گھبرا کر کہا اور جلدی سے ڈریسنگ گاؤن لینے کو لپکے۔ گاؤن اچھی طرح پہنے بغیر ہی انہوں نے ریسیور اٹھایا اور کھٹکھٹا نمبر گھمانے لگے۔

وہ پریشان تو خاصے ہوئے لیکن ڈاکٹر نے آ کر تسلی دی کہ ''موسمی بخار ہے شاید کسی بے احتیاطی کی وجہ سے شدت اختیار کر گیا۔''

''ڈاکٹر صاحب ویسے تشویش کی تو بات نہیں۔'' انہوں نے جتنا فکرمند ہوکر پوچھا۔ نیرو کو اتنا ہی کھلا۔ ڈاکٹر بھی کہتا ہوگا یہ شخص بیوی کے پیچھے مرا جاتا ہے۔

''جی بالکل نہیں۔'' ڈاکٹر نے پوری پیشہ ورانہ خوش اخلاقی سے یقین دلایا۔
''ایسی فکر کی بات نہیں۔ ان دنوں میں کام کی زیادتی ہو یا تفکرات کا بوجھ تو معمولی حرارت ہو ہی جاتی ہے۔ انشاءاللہ شام تک ٹھیک ہو جائیں گی لیکن انہیں مکمل آرام کی تاکید ہے۔''

☆......☆......☆

نیرو کا دل بیٹھ سا گیا لیکن منظر صاحب کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ گھبراہٹ میں منہ کھول کر انہوں نے پوچھا۔ ''کن دنوں میں ڈاکٹر صاحب۔''

ان کی سادگی پر ڈاکٹر بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ منظر صاحب' آپ کی بیگم نے آپ کو یہ خوشخبری نہیں سنائی کہ آپ باپ بننے والے ہیں۔''

منظر صاحب کی کیفیت ایسی ہوگئی جیسے کسی غریب شخص کی لاٹری نکل آئی ہو۔ بے یقینی سے انہوں نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور پھر نیرو پر جھک کر بولے۔

''نیرو تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔''

نیرو کی آنکھوں سے آنسو برس پڑنے کو تھے۔ اس نے تکئے میں چہرہ چھپا لیا۔ ڈاکٹر منظر صاحب کی بے صبری اور نیرو کی پشیمانی پر بڑا محظوظ ہوا۔ منظر صاحب کچھ سنبھلے تو ڈاکٹر کو فیس چکا کر جلدی جلدی رخصت کیا۔ ان کی خوشی سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔ بھاگے ہوئے کمرے میں آئے۔ تیزی سے نیرو کے پلنگ پر جھکے لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔

غسل خانے سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ نیرو کو ان کی حالت کا اندازہ تھا اسی لئے اس نے ان کی بے لگام محبت سے بچنے کیلئے غسل خانے میں پناہ لی تھی۔

آئینے کے سامنے بیٹھی وہ بڑے غور سے اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر نے جو خبر سنائی تھی اس نے اسے چکرا کے رکھ دیا تھا۔ اپنی زندگی سے وہ اتنی اوب گئی تھی کہ اس کی کبھی تمنا نہ کی تھی۔ منظر صاحب کو جس طرح اس پر مسلط کیا گیا تھا تو اس نے اک جنت جیسے گھر کا تصور ہی مٹا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی حیثیت تو اک قیدی کی سی تھی جو قید کے بے رنگ دن گن گن کر گزارتا ہے اور رہائی کے خوش آئند تصور میں کھو کر سپنوں کے محل تعمیر کرتا رہتا ہے لیکن وہ تو ایسی قیدی تھی جسے رہائی کی کوئی امید نہ تھی۔ عمر قید کی اس سزا نے اسے سپنوں اور خوابوں سے بہت دور کر دیا تھا' جو اک پیاری زندگی کا ماحصل ہوتے ہیں۔ اس نے سن رکھا تھا کہ عورت کی معراج ماں بننا ہے۔ ماں بننے والی عورت اپنی ہی نگاہ میں اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ باقی دنیا اسے بہت نیچے نظر آتی ہے۔ بہت پست معلوم ہوتی ہے۔ تخلیق کی مسرت خالق کی روح کا نغمہ بن جاتی ہے۔ ہر ایک پل فردوسی تصور میں ڈھل جاتا ہے۔ خوش آئند لمحوں کے تصور کے ہجوم میں ماں' اس جنت کو دیکھ لیتی ہے' جو اس کے قدموں تلے آنے والی ہے۔

لیکن نیرو تو ایک عجیب سی نفرت و کراہیت محسوس کر رہی تھی۔ اپنی ہی نگاہوں میں سبک ہوئی جاتی تھی۔ وہ جو منظر صاحب سے اب بھی اجنبیوں کی طرح

بیگانہ تھی لیکن آج یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس پر حاوی ہو گئے ہیں۔ اس پر چھائے جا رہے ہیں۔ زندگی اور بھی بے رنگ اور پھیکی ہو گئی تھی۔ منظر صاحب اس میں در آئے تھے

☆......☆......☆

اس کی بیماری کا سن کر اماں بی بھی دیکھنے آئی تھیں اور اسے سو احتیاطیں بتا گئی تھیں۔ بڑی اماں نے ابھی سے وظیفے شروع کر دیئے تھے کہ خدا لڑکی کا منہ نہ دکھائے اور نیرو نے تڑپ کر سوچا تھا۔ ''اگر لڑکی کو مجھ جیسی ان چاہی زندگی بتانی ہے تو خدا اس صنف کو پیدا ہی نہ کرے۔ جاتے جاتے اماں بی خرم کی بات پھر یاد دلا گئی تھیں۔

''لڑکا اچھا ہے' دیکھنا ہاتھ سے نکل نہ جائے۔''

اتنے دنوں کی کشمکش میں اس نے فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ وہ جب تنہا تھی تب بھی خرم کا ہو جانا ناممکن تھا اور جب سے اس کے اندر اک نئی زندگی نے سانس لینا شروع کیا تھا وہ خود کو منظر صاحب کی محکوم سمجھنے لگی تھی۔ اسے اپنے آپ سے شرم آنے لگی تھی۔ خرم کا سامنا کرنا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ وہ تو بڑے خلوص سے اس کا حال پوچھتا۔ اس کی دلچسپی کی باتیں کرتا رہتا۔ اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتا لیکن اس کی طبیعت گرتی ہی جاتی تھی۔

منظر صاحب بہت فکرمند رہتے' انہیں اپنی بے حد خوبصورت بیوی اور آنے والے بچے دونوں کی بے حد فکر تھی۔ اسی لئے وہ اس کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھتے تھے۔ جس سے نیرو کو اور بھی الجھن ہوتی لیکن اس گھٹے ہوئے ماحول سے چھٹکارا حاصل کرنا اس کیلئے ناممکن تھا۔ حالات کی زنجیروں میں رسم و رواج کے بندھنوں میں وہ اس طرح جکڑی ہوئی تھی کہ آزادی کا اک سانس لینا بھی دشوار تھا۔

آنے والے ننھے مہمان نے یہ دشواریاں اور بھی بڑھا دی تھیں۔ اس کی ناآسودگیوں میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ خرم اسے بہت دور ہٹتا نظر آتا تھا۔ وہ دور بہت دور چلا جا رہا تھا اور وہ اسے بولے سے بھی نہیں پکار سکتی تھی۔

''کاش وہ رانی ہوتی۔'' اس نے تڑپ کر سوچا' تو خرم کس آسانی سے اس کا

نصیب بنتا۔ وہ جو اتنی رومانی اور نازک احساسات کی مالک تھی اسے منظر صاحب جیسے بدذوق کے پلے باندھ کر گھر والے بہت خوش تھے کہ دولت کی ریل پیل اور فرماں بردار شوہر کے ساتھ وہ بہت خوش ہے لیکن رشتوں کی ہم آہنگی سے کہیں دل بھی ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ وہ مقدر کی ستم ظریفی پر حیران تھی۔ رانی تو اس کے برعکس ہر حال میں خوش رہنے والی لڑکی تھی۔ جیون ساتھی سے متعلق اس نے تہہ در تہہ نازک احساسات کا آئینہ خانہ نہیں سجا رکھا تھا جو تقدیر کی ایک ہی ٹھیس سے چکنا چور ہو جائے۔ خرم چپکے چپکے اس کے جیون میں در آیا تھا۔ جس کی صورت میں اس نے اپنے آئیڈیل کو مجسم دیکھا تھا۔ چپ چاپ اسے اپنی زندگی سے دور بہت دور جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

ڈریسنگ روم سے ٹائی کی گرہ لگاتے ہوئے منظر صاحب برآمد ہوئے تو نیرو بستر میں اٹھ بیٹھی۔ انہوں نے دیکھا تو وہیں سے بولے۔ ''نیرو تم آرام کرونا۔''

نیرو کو بہت ناگوار گزرا۔ بھلا اب وہ ایسی ہی چھوئی موئی تھی کہ ذرا سا چھونے سے مرجھا جائے گی۔ وہ اس کے قریب چلے آئے اور پلنگ کی ٹیک کے پاس کھڑے ہو گئے۔

''نیرو' انشاء اللہ ہمیں بیٹا ملے گا۔'' انہوں نے پیچھے سے اس کے گلے میں بازو ڈالے اور اس کا سر ذرا سا پیچھے کو جھکایا۔ نیرو نے ہانپ کر آنکھیں بند کر لیں۔

''نیرو تم بھی بیٹا ہی چاہتی ہو نا۔''

نیرو نے یونہی ہوں ہاں کر دی اور آہستہ سے ان کے ہاتھ علیحدہ کر دیئے۔

''اپنا خیال رکھا کرو۔'' انہوں نے کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔

''میں جا رہا ہوں' کوئی ضرورت ہو تو فون کر لینا۔''

''جی اچھا۔'' نیرو نے مختصر سا جواب دیا۔

کتنے ہی لمحے وہ آنکھیں موندھے نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی کہ کھنکارنے کی آواز سے چونکی۔ سامنے ہی خرم کھڑا تھا۔ اسے متوجہ دیکھا تو وہ جھک کر آداب بجالایا۔ مسکراتا ہوا بولا۔

''بھابی' کب تک ناز برداریاں کروائیں گی' اب بستر کی خطا معاف کریں۔''

وہ بے دلی سے مسکرا دی۔

''جناب بھابی جی!'' اس نے نیرو کا ہاتھ پکڑا اور اپنی ہتھیلی پر رکھ لیا۔ نیرو کو محسوس ہوا جیسے اس کے مردہ جسم میں زندگی کی رمق آہستہ آہستہ آ رہی ہے۔

''نمبر ون' اتنے دنوں سے بستر پر لیٹے لیٹے آپ بور نہیں ہوئیں۔'' اس نے انگلیوں پر گننا شروع کیا۔ ''نمبر ٹو' کمرے کی گھٹن سے آپ کا جی نہیں بھرا۔''

نمبر تھری آپ کب سے اتنی بد ذوق ہو گئیں کہ دن بھر کمرے میں بند رہیں۔''

''نمبر فور' آپ کو علم نہیں کہ بیماری میں تازہ ہوا کی بھی ضرورت پڑتی ہے تھوڑی سی۔''

نیرو کو اس کے مزاحیہ انداز پر ہنسی آ گئی۔ اس سے ہاتھ چھڑاتی ہوئی بولی۔

''مجھے کیا پتہ تھا کہ تم سے اپنا علاج کرواتی۔''

''عنایت' عنایت۔'' وہ داد لینے کے انداز میں جھکا اور پھر بولا۔ ''اب آپ اٹھ کر فوراً میرے ساتھ چلئے' ذرا لان میں چہل قدمی ہی کرتے ہیں' ورنہ آپ تو کمرے میں پڑی پڑی باسی ہو جائیں گی۔''

نیرو کا دل پھول کی طرح ہلکا ہو گیا۔ کھڑکی سے باہر کی فضا میں کئی بار اس نے جانے کا سوچا لیکن منظر صاحب تو ہلنے نہیں دیتے تھے۔ پھر دل بھی تو اس کا بجھا بجھا سا تھا کہ اس نے خود بھی کوشش نہیں کی۔

شال اچھی طرح لپیٹ کر وہ اس کے ہمراہ باہر نکل آئی۔ تازہ ہوا کے خنک جھونکوں نے اس کے پژمردہ دل کو کھلا سا دیا تھا۔ خرم خوش گپیوں میں مصروف تھا اور نیرو سوچ رہی تھی کہ اگر قسمت نے مجھے اس کی رفاقت سے محروم کر دیا ہے تو میں رانی کے راستے کا پتھر کیوں بنوں؟ مجھے خرم کو رانی کے حوالے کرنا ہی پڑے گا۔ اس نے بڑی دلیری سے سوچا لیکن دل کے کسی گوشے میں یہ خیال کیوں چٹکیاں لے رہا تھا کہ شاید اس کی حالت بھی میرے ہی جیسی ہو۔ یہی میٹھی چبھن اس کے دل میں بھی جاگتی ہو۔

''بھابی جی۔'' وہ چلتے چلتے رکا اور بولا۔ ''آپ کو بانسری بجانی تو آتی ہو گی۔''

''یہاں بانسری کا کیا ذکر۔'' نیرو حیران ہوئی۔

''اور بربط؟؟؟'' اس نے مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا لی۔

"اب تجھ سے سیکھوں گی۔"

"کمال ہے آنی تو چاہئے۔"

"کیوں؟؟" نیرو نے حیرانی سے اس کے شریر چہرے کی طرف دیکھا۔

"کتابوں میں تو یہی لکھا ہے۔"

"کیا لکھا ہے؟"

"کہ جب روم جل رہا تھا تو نیرو۔" اس نے مسکرا کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ تو نیرو نے مارنے کو ہاتھ اٹھایا۔ "کیسا نکما ہے تو۔"

"آداب عرض ہے' ویسے دیور تو آپ کا ہوں۔"

☆……☆……☆

نیرو کچھ دیر خاموش رہی پھر نہ جانے کیوں اس کے ہونٹوں پر وہ بات آ گئی جس کو سینکڑوں بار اس نے لبوں پر روک لیا تھا۔ "خرم تو شادی کیوں نہیں کر لیتا۔"

"آپ کراتی ہی نہیں۔" اس نے بے ساختہ کہا۔ نیرو نے حیرت سے اس کا منہ دیکھا۔ وہ زور سے ہنس پڑا۔ دیوروں کی شادیاں بھابیاں کرایا کرتی ہیں کہ وہ خود مولوی لئے لئے پھرتے ہیں۔"

"لے میں کہیں تیری بات کر بیٹھوں اور تجھے پسند نہ آئے تو؟"

"واہ پسند کیوں نہ آئے پر شرط یہ ہے کہ آپ جیسی ہو۔ یا آپ سے کچھ کچھ ملتی جلتی۔"

"چل شریر!!!" نیرو کے چہرے پر ایک رنگ سا آ گیا۔

"ارے نہیں بھابی جی بس مجھے تو ایسی ہی لڑکی چاہئے۔ قسم ہے آپ کی۔"

"اب جھوٹ بولنے میں تو میری قسمیں کھاتا ہے۔"

"آپ کی جھوٹی قسم کھا کر مجھے کیا جہنم میں جانا ہے۔ میں تو سچ کہہ رہا ہوں اور سو فیصدی سچ۔"

"تو پھر تو نے ایسی ہی کوئی لڑکی دیکھ رکھی ہوگی۔" نیرو نے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن اس کی اگلی متوقع بات سننے کیلئے اپنے آپ کو تیار کرنے لگی۔

"آپ برا نہ مانیں تو بتاؤں۔" وہ جھجکا اور نیرو کو اپنے دل کی دھڑکنیں

بڑھتی معلوم ہوئیں۔

"ہوں۔!!!" بڑی مشکل سے خود پر قابو پا کر اس نے ہنکارا بھرا۔

"تو پھر بتا دوں؟ کچھ کہیں گی تو نہیں۔" اس نے خوفزدہ ہونے کی اداکاری کی۔

"بتاؤ تو سہی۔" وہ کچھ جھجک سی رہی تھی۔

وہ اس کے قریب چلا آیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے بولا۔ "بھابی جی۔ بتاؤں؟؟"

نیرو کانپ گئی۔ اسے خرم سے ایسی توقع ہرگز نہیں تھی۔ اسے بہت عجیب سا لگ رہا تھا لیکن اس کا رواں رواں وہ سب سننے کو بے تاب تھا جو اگلے ہی لمحے خرم کی زبان پر آنے والا تھا۔ خرم نے آہستہ سے کہا۔ "شبو!!!"

نیرو کو محسوس ہوا جیسے وہ ایک لمحے بکھر گئی۔ فضائیں یکایک ساکت ہو گئی ہیں۔ شبو۔ شبو کی خوفناک آوازیں ہر طرف سے اس پر یلغار کر رہی ہیں۔ خرم کے ہاتھ میں دبا اس کا ہاتھ تو سرد ہونے لگا۔ خرم نے اس کے چہرے کا رنگ بدلتا دیکھا تو شپٹا سا گیا جلدی سے بولا۔ "بھابی آپ تو ناراض ہو گئیں۔" نیرو جیسے حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئی۔ "نہیں تو۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔"

"تو چلئے جناب واپس کہیں منظر بھائی آ کر مجھے بھی نہ پکڑ لیں۔"

نیرو بے دلی سے مسکراتی اس کے ساتھ چل پڑی تو پھر شبو سے تیری بات کرا دوں۔"

☆……☆……☆

صمدانی صاحب کے کمرے سے نکل کر محسن بھائی باہر آئے تو عجیب سے تذبذب کا شکار تھے۔ مجبوری نے انہیں باندھ رکھا تھا۔ بے دلی سے چلتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں آ کر پلنگ پر بیٹھ گئے۔ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر وہ ان گنت سوچوں میں الجھے ہوئے تھے۔

صمدانی صاحب ہر بار اپنے احسانوں کی اک باڑھ سی ان کی راہ میں لا کھڑی کرتے تھے جس کو پھلانگ جانے کو ان کا ضمیر گوارا نہیں کرتا تھا اور اس بار تو انہوں نے

اپنی مجبوریاں ان کے سامنے کھول کھول کر رکھ دی تھیں۔ گھر بھر کی دیکھ بھال کرنے کو ان کی بھی ضرورت تھی۔ ورنہ اتنی ڈھیر لڑکیوں کے گھر برے بھلے سبھی لوگوں کی نظر رہتی ہے۔ اسی لئے وہ مجبوراً اسی گھٹی گھٹی سی فضا میں رہنے پر مجبور تھے جس نے ان کا سانس تک مسموم کر دیا تھا۔ ان کے پاؤں میں صمدانی صاحب کے احسانات کی زنجیر بندھی تھی۔ اسی گھر میں انہوں نے پرورش پائی تھی۔ اب یوں ٹھکرا کر کس طرح چل دیتے۔

انہی سوچوں میں گھرے وہ چپ چاپ بیٹھے تھے کہ معلوم ہوا جیسے کسی نے ان کے شانے پر نرم نرم سا ہاتھ رکھا۔ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ تمت پشیمان سی ان کے قریب کھڑی تھی جس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

محسن بھائی نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے پاس بٹھا کر بولے۔ ''تمی کیا بات ہے؟''

تمت بے ساختہ رو پڑی۔ زور زور سے سسکیاں لیتی وہ ان کے بازو سے لگ گئی۔ محسن بھائی نے اسے کبھی اس بیقراری سے روتے نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور پیار سے چمکارتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے وہ اور بھی مچل کر روئی اور محسن بھائی سوچنے لگے کہ نہ جانے اس ننھی سی جان سے سب کو کیا بیر ہے۔ وہ جو ایسی بے ضرر تھی چپ چاپ اپنے آپ میں مگن رہتی تھی اس کو دکھ دے کر سب کیوں تسکین پاتے تھے۔

وہ کچھ پرسکون ہوئی تو محسن بھائی نے بڑے پیار سے پوچھا کہ اسے کیا ہوا ہے۔ وہ سوجھی ہوئی سرخ آنکھوں سے کچھ دیر ان کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی اور ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ''محسن بھائی آپ چلے جائیں گے۔''

محسن بھائی کو یقین نہ آیا۔ ''کیا بات ہے چندا۔'' انہوں نے گویا تصدیق کرنے کو پوچھا۔

''محسن بھائی آپ چلے جائیں گے۔'' اس کی آواز پھر رندھ گئی۔

محسن بھائی کو معلوم ہوا جیسے ریتیلے صحرا میں چلتے چلتے اچانک خنک ہوا کا اک خوشگوار جھونکا انہیں تر و تازہ کر گیا ہے۔ اسے بے ساختہ اپنے ساتھ لپٹا کر بولے۔

''تمت تم اس لئے رو رہی ہو۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور ایک بار پھر رو پڑی۔

''ارے نہیں چندا۔'' انہوں نے اس کے آنسو پونچھے۔

''اتنی اچھی سی، پیاری سی، ننھی منی تمت کو چھوڑ کر میں کہاں جاؤں گا۔ ہیں۔ پاگل ہوئی ہو جو روتی ہو۔ ہیں شاباش خاموش ہو جاؤ جلدی سے۔''

تمت کے سانولے چہرے پر خوشی کے رنگ آہستہ آہستہ نکھرنے لگے۔ بے ساختہ مسکرا کر بولی۔ ''محسن بھائی آپ نہیں جائیں گے نا؟''

''بالکل بھی نہیں ہرگز نہیں۔''

وہ مسرت سے کھل اٹھی۔ ان کے ہاتھ کی انگلیاں گنتے ہوئے بولی۔ ''تو محسن بھائی آپ بالکل بھی مت جائیں۔''

محسن بھائی اس انبساطی کیفیت میں کھوئے کھوئے سے تھے۔ اب سے پہلے جو پژمردگی ان پر چھائے جاتی تھی رفتہ رفتہ اس کا اثر زائل ہو رہا تھا۔ مایوسی ہولے ہولے ختم ہو رہی تھی۔ تمت کی معصومیت نے انہیں سہارا دے دیا تھا جو ان کیلئے اک آسرا سا بن گیا تھا۔ تیز دھوپ، اک ہلکے سے خنک جھونکے سے کسی حد تک گوارا ہو جاتی ہے۔ تمت جو گھر بھر میں سب سے حقیر سی مخلوق تھی۔ اس کے اس معمولی سے لگاؤ نے انہیں نئی زندگی دے دی تھی۔

تمت اپنے آپ ہی مسکرائے جاتی تھی۔ بار بار سر اٹھا کر ان کی طرف یوں دیکھتی تھی جیسے یقین کر رہی ہو کہ واقعی وہ موجود ہیں۔ محسن بھائی مسکرائے۔

''ارے چندا! تمہیں کس نے کہا کہ میں جا رہا ہوں۔''

تمت گڑبڑا سی گئی۔ تھوک نگل کر بولی۔ ''محسن بھائی! محسن بھائی میں تو میں نے سن لیا تھا آپ ابا میاں سے کہہ رہے تھے۔''

''اور تم بلی کی طرح کہاں چھپی ہوئی تھیں۔''

''میں تو۔ میں باہر سے گزر رہی تھی تو مجھے آواز آ گئی۔''

''اور پھر تم رونے لگیں۔ تمہیں چور میں نے کہا ہے کہ یونہی نہیں رویا کرتے۔ آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں۔''

''محسن بھائی آپ چلے جائیں اور میں پھر بھی نہ روؤں۔''

محسن بھائی نے اس کے پرخلوص چہرے کی طرف پیار سے دیکھا۔ گھر بھر میں یہی معصوم ہستی تھی جو انہیں جینے کی آس دلاتی تھی۔

''بہنا تمو تم کبھی مت رویا کرو رونے والے بزدل ہوتے ہیں اور تم تو اتنی بہادر ہو۔'' تمت چپ چاپ ان کی باتیں سنتی رہی اور ہولے ہولے سر ہلاتی رہی۔

شبو نپک جھپک کمرے میں آئی۔ ''تمو کہاں ہے؟''

''معلوم نہیں۔'' محسن بھائی نے جان بوجھ کر لاعلمی کا اظہار کیا۔ ورنہ تو وہ ابھی ابھی ان کے پاس سے اٹھ کر گئی تھی۔

''گلاں تو کہہ رہی تھی وہ آپ کے کمرے میں ہے۔'' وہ جھنجھلائی۔

''تو پھر دیکھ لو۔'' محسن بھائی نے اسے چڑایا۔

ایک قہر آلود نگاہ ان پر ڈالی۔ ''ہر وقت تو یہاں گھسی رہتی ہے۔ اب کدھر دفعان ہوگئی۔''

☆.....☆.....☆

محسن بھائی اپنی جگہ سے اٹھ آئے اور اس کے قریب پہنچ کر بولے۔ ''شبو تم اتنی بڑی ہوگئیں اور تمہیں بات کرنے کی تمیز اب تک نہیں آئی۔''

''اب آپ سے سیکھوں گی۔'' وہ تنک کر بولی۔

انہوں نے زور سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولے۔

''چاہے تم مجھ سے سیکھو یا کسی اور سے لیکن سیکھو تو سہی۔''

شبو تلملا کر دو چار قدم پیچھے ہٹ گئی اور محسن بھائی کے سنجیدہ چہرے کی طرف دیکھا اور کچھ لاجواب سی ہوکر بولی۔ ''آپ اپنی خیر منائیں۔''

محسن بھائی نے شانے جھٹکے ''تمہارے ہوتے میری خیر کہاں۔ اب جاؤ اماں بی سے کہو کہ محسن نے مجھ سے جھگڑا کیا ہے۔'' شبو نہ جانے کیوں خجل سی ہوگئی لیکن ڈھٹائی سے بولی۔ ''ایک بار نہیں سو بار کہوں گی۔''

''درست ہے۔'' محسن بھائی نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ ''تمہاری اماں

بی۔ تمہارا گھر۔ تم ہزار بار بھی کہہ سکتی ہو۔ لیکن ہم کس سے کہیں ہمارا تو کوئی گھر نہیں۔ اماں بی بھی نہیں۔''

شبو پشیمان سی ہوگئی لیکن وہ دونوں ہاتھوں پر چہرہ ٹکائے جیسے کسی سوچ میں منہمک تھے۔ ان کے چہرے سے ایسے کرب کا اظہار ہوتا تھا جیسے انہیں دل کا دورہ پڑا ہوا ہے۔ شبو خوفزدہ ہوگئی۔ بے ساختہ اس کے ہونٹوں سے نکلا۔ ''محسن بھائی۔''

انہوں نے ایک بار سر اٹھا کر اس کی طرف ایسی عجیب نگاہوں سے دیکھا جیسے پہچان نہ پا رہے ہوں۔ لفظ شبو ان کے حلق میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود کچھ نہ کہہ سکی۔ وہیں کھڑی ہاتھ مسلتی رہی۔

☆.....☆.....☆

محسن بھائی خود میں ہی کھوئے ہوئے تھے۔ جیسے کوئی بھولی بسری بات یاد کر رہے ہوں۔ شبو کو زندگی میں شاید پہلی بار ان سے اک گہری ہمدردی محسوس ہوئی۔ عجیب سا دکھ اس کے دل کی کھٹک بن گیا نہ جانے اس کا دل کیوں چاہا کہ ان کے دونوں ہاتھ پکڑ کر انہیں خوشیوں سے سجی اور شادمانیوں سے مہکتی دنیا میں اپنے ساتھ ساتھ لے چلے۔ جتنے دکھ انہوں نے آج تک پائے تھے اس سے کہیں بڑھ کر خوشیاں ان کی جھولی میں ڈال دے۔

وہ ایک قدم آگے بڑھی اور مبہم سی آواز میں بولی۔ ''محسن بھائی!!!'' محسن بھائی نے نظر اٹھا کر دیکھا اور لاتعلقی سے بولے۔ ''شبو تم چلی جاؤ یہاں سے مجھے تمہاری ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ مجھے اپنا مقام معلوم ہے' چلی جاؤ تم۔''

شبو ہک بک رہ گئی۔ چند لمحے پہلے کی گہری ہمدردی نے اسے جو جرأت عطا کی تھی محسن بھائی کی سرزنش نے اسے پھر بزدلی میں بدل دیا تھا۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑی کچھ سوچتی رہی اور پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆.....☆.....☆

اجلی اجلی دلکش چاندنی نے یہاں وہاں بکھر کر اک خوابناک سی پراسراریت پیدا کر دی تھی۔ کھڑکی کے ساتھ اگی ہوئی رات کی رانی کی لطیف مہک احساس کو اک عجیب سی لذت بخش رہی تھی جیسے کسی معصوم دوشیزہ کو پہلی بار کسی نے پیار سے دیکھا

ہو۔ چاندنی میں لان یوں نہایا ہوا تھا کہ دل چاہے تو چاندنی سے جھولی بھر لیجئے۔

لیکن نیرو کے وجود کا بوجھ اس کے دل کا بوجھ بن گیا تھا۔ پہلی بار ماں بننے والی لڑکیوں کی طرح اس کے دل میں کوئی لطیف احساس نہیں تھا۔ کوئی چاہت اس ان دیکھے وجود کیلئے دل میں جاگزیں نہیں تھی۔ یہ ان دیکھی ننھی سی ہستی اس کیلئے کتنی ان چاہی تھی جس سے چھٹکارا پانا اب بہت مشکل ہو گیا تھا۔ وہ جو چاندنی کی دیوانی تھی' چاندنی کی پرستار تھی آج چاندنی جیسے اسے جلائے دیتی تھی جیسے اس کے دل کے زخموں کو داغ رہی تھی۔

منظر صاحب ڈریسنگ روم سے کپڑے تبدیل کر کے نکلے۔ اس نے ایک نگاہ ان پر ڈالی اور اسے ایک ایک کر کے وہ سارے تلخ لمحے یاد آ گئے جب اس نے منظر صاحب کا ہاتھ پکڑ کر انہیں ہم قدم کر لینا چاہا تھا لیکن ان کے ہاتھ کی سختی و کرختگی نے اسے وہیں رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر ان کی طرف ایک والہانہ طلب سے دیکھا تھا لیکن ان کی اجنبی نگاہوں نے اس طلب کو تشنگی میں بدل دیا تھا اور وہ تھکی تھکی سی یوں ہانپ کر رہ گئی تھی جیسے زندگی کی بازی ہار گئی ہو۔ پورے چاند کی یہ اجلی چاندنی اس کے دلکش چہرے پر دکھ بن کر بکھر گئی تھی۔

منظر صاحب الماری میں کپڑے رکھ کر اس کی جانب ہی چلے آئے۔ اس کی غیر معمولی اداسی اور پژمردگی کو انہوں نے محسوس کر لیا تھا۔ متفکر سے ہو کر بولے۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔''

''ہوں۔'' نیرو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تو انہوں نے اس کی کلائی پکڑ کر دیکھی کہ اسے بخار تو نہیں۔ ''چلو اب آرام کرو کافی رات ہو گئی۔''

نیرو نے اک نظر کھڑکی سے باہر چاندنی سے چھلکتے ہوئے لان پر ڈالی اور اک نگاہ کمرے کی گھٹی ہوئی فضا پر پھر پورے چاند کے روشن چہرے کی طرف دیکھا اور ایک نظر منظر صاحب کے جذبات سے عاری چہرے پر اف!!! یہ منظر صاحب حسن اور اس کی لطافتوں کو محسوس کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ اک اذیت کی لہر سی اس کے خوبصورت چہرے پر لہرا گئی۔ تو منظر صاحب اور بھی متفکر ہوئے۔ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ ''نیرو تمہاری طبیعت ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔''

''اب آرام کرو۔ اب تو تمہیں اور بھی اپنا خیال رکھنا چاہئے۔''

نیرو کو معلوم ہوا جیسے اس کی سانس رکی جاتی ہے۔ اس نے ان کے ہاتھ جھٹک کر پیچھے کر دیئے اور گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی۔ ''یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔ میں ذرا باہر ٹہلوں گی۔''

''باہر ہوا چل رہی ہے۔ تمہیں زکام نہ ہو جائے۔''

نیرو اور بھی چڑ گئی بغیر کچھ کہے وہ پچھلے دروازے میں اس کے پیچھے پیچھے ہی باہر نکل آئے۔ وہ سبز روشنیوں پر چلتی ہوئی شہزادی سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتے اس کے قریب چلے آئے۔ نیرو نے ان کی موجودگی کو محسوس تو کر لیا لیکن ان کی طرف دیکھا نہیں۔ منظر صاحب بھی شاید اس کی جھنجھلاہٹ محسوس کر چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے بھی اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔

دونوں خاموش کچھ سوچ رہے تھے لیکن بظاہر ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دونوں کتنے دور تھے۔ دونوں کی سوچوں میں کتنا تضاد تھا۔ نیرو چاندنی کے حسن میں کھوئی ہوئی تھی اور منظر صاحب کو رات کی رانی اور چنبیلی کی مہک سے لدی ہوا کے جھونکوں سے نیرو کو زکام ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ نیند سے ان کی پلکیں بوجھل ہوئی جاتی تھیں لیکن نیرو کے پاگل پن کی وجہ سے انہیں بھی اس کا ساتھ دینا پڑ رہا تھا۔

چاندنی میں نہایا فوارہ موتی برساتا یوں معلوم ہوتا ہے وہ پگھلی ہوئی چاندنی اگل رہا ہے۔ نیرو کا من کھل سا گیا۔ ''یہ آج وحید نے فوارہ بند نہیں کیا۔'' منظر صاحب نے اچانک کہا تو سارا طلسم بکھر گیا۔ جادو ٹوٹ گیا۔ نیرو کا جی چاہا ایک زوردار تھپڑ انہیں رسید کرے کہ ان کا منہ پھر جائے لیکن نہ جانے وہ کیونکر خاموش رہی۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ اس چاندنی اگلتے فوارے کے قریب بیٹھی بیٹھی خود بھی پگھل کر چاندنی میں ڈھل جائے اور چپ چاپ چاند کے حسین چہرے کو تکتی رہے کہ وہ کیونکر ڈھلتا اور ڈوبتا ہے لیکن نغموں سے لبریز ماحول میں۔ منظر صاحب کی کرخت آواز ان رسیلے نغموں پر چھا جاتی تھی۔

وہ وہیں پتھر کی نشست پر بیٹھ گئی۔ ''کاش!!! اس چاندنی رات میں کوئی ستار پر میٹھا سا نغمہ چھیڑ دے۔'' اس نے اس طرح سوچا جیسے پیاسا یخ بستہ پانی سے

چھلکتے میٹھے چشمے کے متعلق سوچتا ہے اور از خود اس کی نگاہ منظر صاحب پر پڑی جو جمائیوں پر جمائیاں لے رہے تھے۔ اس لمحے کو تو اسے شدت سے قہر چڑھا۔ پھر اپنے انداز میں اک مفاہمت پیدا کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو نیند آ رہی ہے۔ آپ چل کر آرام کریں۔ کمرے میں مجھے کچھ گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر میں آ جاؤں گی۔''

منظر صاحب نے ایک بار غور سے اس کے دلکش چہرے کی طرف دیکھا جو ہر طرح کے تاثر سے پاک تھا۔ ان کا ذہن اتنا دوررس بھی نہیں تھا جو نیرو کے اندرونی ہیجان کا مفہوم سمجھ سکے اور پھر دن بھر کے کام اور تھکاوٹ نے انہیں اس قدر مضمحل اور نیند سے بوجھل کر دیا تھا کہ ان میں تجزیہ کرنے یا توجہ دینے کی ہمت ہی نہیں رہی تھی۔ انہوں نے بڑے پیار سے اس کے شانوں پہ ہاتھ رکھے اور بولے۔ ''تم زیادہ دیر یہاں نہ رکنا۔ جلدی آ جانا۔ تھک جاؤ گی۔''

نیرو نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ چاہتی تھی کہ ان سے جلدی پیچھا چھڑا کر اپنی اس سوگوار تنہائی کو چاندنی سے روشن کرے۔

وہ کتنی ہی دیر بیٹھی دیوانی چکوری کی طرح چاند کو تکتی رہی۔ عجیب سی سوچوں نے اسے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ لیکن ایسی سوچیں جو تصورات کو تو رنگین بناتی ہیں لیکن زندگی کو تلخ تر حقیقت بنا کر اجاگر کرتی ہیں۔ اس کے جذبات متضاد سے تھے۔ کبھی اس کا جی چاہتا کہ مسکراتی جائے اور کبھی آنکھوں میں آنسو بھر بھر آتے۔

ایسے میں اسے ستار کی مدھر آواز نے چونکا دیا۔ وہ اس مدبھری لے میں کھو کر رہ گئی۔ آہستہ خرامی سے نغمے کی سمت چلی اور کچھ دور پہنچ کر ٹھٹک گئی۔ خرم سامنے ہی درخت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندھے بیٹھا تھا۔ چھوٹے سے ٹیپ ریکارڈ میں چلتی ہوئی ٹیپ ان رسیلے نغموں کو فضا میں بکھیر رہی تھی۔ وہ کچھ دیر خرم کے روشن چہرے کی طرف دیکھتی رہی جو چاندنی میں چمک رہا تھا۔

نہ جانے اسی وقت خرم نے کیوں آنکھیں کھول دیں۔ شاید اسے لاشعوری طور پر نیرو کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں لاتعداد خواب گڈمڈ ہو رہے ہیں۔ اس نے سامنے کھڑی نیرو کی طرف دیکھا جس کے خوبصورت چہرے کو چاندنی نے وینس کے چہرے میں ڈھال دیا تھا۔ اور چند لمحے تکتا ہی رہا پھر دفعتاً اٹھ

کھڑا ہوا اور اس کے قریب آ کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''بھابی جی! آپ؟''

نیرو نے چونک کر اجنبی سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش رہی۔ خرم نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اشتیاق سے بولا۔ ''بھابی جی آیئے آپ کو ایسے جشن کے ٹیپ سنائیں۔'' نیرو میکانکی انداز میں وہیں گھاس پر بیٹھ گئی۔ خرم ٹیپ چننے لگا۔

''خرم تمہیں بھی ستار پسند ہے؟''

''کیا بات کرتی ہیں بھابی جی۔ قسم سے جو امیر خسرو کہیں مل جائیں تو ساری عمر ان کے قدموں میں گزار دوں۔ ستار کے تار چھیڑتے ہیں تو لگتا ہے دل کے تار چھڑ گئے ہیں۔''

''خرم تم کہاں تھے؟'' نیرو کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی لیکن لبوں تک نہ آ سکی۔ جب منظر صاحب میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے خشک اور بے آب و گیاہ ویرانے میں لے گئے تھے جہاں میں سر اور رس کو ترس کر رہ گئی ہوں۔ ببول کے کانٹوں میں الجھ کر گلاب کی لطافت کو بھول گئی ہوں۔

چٹکی ہوئی اجلی چاندنی میں ستار کے نغمے طلسم بن کر بکھر رہے تھے۔ خرم درخت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندھے بیٹھا تھا اور نیرو بت بنی بیٹھی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ سوگواروں کا درد موتیوں کی لڑیوں کی طرح اس کے رخساروں پر بہہ رہا ہے۔

☆......☆......☆

گھر میں اچھا خاصا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بڑی اماں خرم کے جنوں کو کوس رہی تھیں اور اماں بی اسی ادھیڑ بن میں تھیں کہ اب کیا کیا جائے۔ دراصل نیرو نے گھر میں بتا دیا تھا کہ خرم شبو کی مانگ کر رہا ہے۔

رانی باقی بہنوں سے بڑی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اب شادی کا نمبر اسی کا تھا۔ اس سے چھوٹی بہن کی شادی ہو جاتی تو گویا آئندہ کیلئے رشتوں کا در اس پر بند ہو جاتا کہ لڑکی میں ہی کوئی نقص ہے جو چھوٹی بہن پہلے بیاہی گئی۔ اب یہ فلسفہ خرم کو کون سمجھاتا۔ اماں بی نے ہزار کوسنے دیئے۔ کم بخت کی عقل الٹی۔ بھلا رانی بھی تو لاکھوں میں ایک ہے مگر بدبخت کہتا ہے کروں گا شادی تو شبو ہی سے کروں گا۔ نیرو نے تو

بہتیرا سمجھایا کہ اب ہم کسی کو باندھ کے تو نکاح نہیں پڑھوا سکتے۔ اس کے دل کی بات ہے لیکن اماں بی کو ابھی بہت اونچ نیچ دیکھنی تھی۔ اس لئے انہوں نے تو فی الحال ہاں کر کے نہیں دی۔

ساتھ کے کمرے میں شبو اور رانی یہ باتیں صاف صاف سن رہی تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف ایک ساتھ دیکھا۔ رانی کا چہرہ سپید پڑ گیا۔ اور شبو حیران سی رہ گئی تھی۔ اس نے تو ہمیشہ خرم کو رانی کے ناطے سے چاہا تھا۔ اس سے بے تکلف تھی تو محض اس لئے کہ رانی اسے آنکھوں میں بسائے بیٹھی تھی۔

☆......☆......☆

اس نے تصور ہی تصور میں اسے کئی بار رانی کے ساتھ دیکھا تھا اور بے اختیار دولہا بھائی پکار رہی تھی لیکن خرم اس کے متعلق کیا سوچتا تھا؟؟؟

کوئی لطیف جذبہ بھی تو اس کے دل میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ رانی کے کانپتے لبوں اور آنکھوں میں جھلکتی نامعلوم سی نمی نے اس کے دل میں ہلچل سی مچا دی تھی اور رانی سوچ رہی تھی کہ شاید میری طلب' میری چاہت کامل نہیں جو خرم نے مجھے یوں نظر انداز کر دیا ہے۔

شبو نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔ ''رانی خرم کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑے گا۔''

''شبو نہیں!!!'' رانی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ ''ہمیں کسی کو مجبور کرنے کا حق نہیں اور پھر میرے دل میں ایسا کوئی خیال بھی نہیں۔'' وہ یہ سب کہہ رہی تھی لیکن اس کا ٹوٹا ہوا لہجہ دل کو پارہ پارہ کر رہا تھا۔

''واہ۔ وہ ہمیں مجبور کر سکتا ہے تو ہم کیوں نہ کریں۔ میں نیرو آپا نہیں جو چپ چاپ جس نے کہا اس کی دلہن بن بیٹھیں۔ آخر ہم بھی انسان ہیں ہمیں بھی تو اپنی زندگی کے فیصلے کرنے کا اختیار ہے۔''

رانی کچھ دیر ہونٹ کاٹتی رہی پھر دھیمے سے گویا ہوئی۔ ''شبو کیا فائدہ۔''

''فائدے کی بات نہیں۔ بات تو ساری دل کی ہے۔''

شبو ابھی اور بھی کچھ کہتی کہ باہر اماں بی آواز پر آواز دینے لگیں۔ ''ابھی آتی ہوں۔'' کہتی ہوئی وہ باہر لپکی اور رانی منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

کالج سے وہ جلد اکیلی ہی چل پڑی۔ اتفاق سے رکشہ بھی جلد مل گیا۔ خرم کے دفتر میں چپڑاسی کے ہاتھ اس نے چٹ بھجوائی تو دوسرے ہی لمحے خرم حیران پریشان لپک جھپک باہر آیا۔ شبو کی طرف اس نے بے یقینی سے دیکھا اور پریشانی سے بولا۔ ''تم.....؟؟ خیریت تو ہے۔''

''بالکل۔'' شبو مسکرائی۔ ''شکر ہے تم نے تو مجھے ڈرا دیا تھا۔''

''ہوں۔'' شبو نے تمسخر سے آنکھیں پھیلائیں تو خرم بھی ہنس دیا۔ ''کوئی کام تھا تمہیں؟''

''جی ہاں کچھ بات کرنی تھی آپ سے۔'' شبو نے بڑی بردباری سے کہا۔

''زہے نصیب۔ میرا خیال ہے کسی ریسٹورنٹ میں نہ چلے چلیں۔ یہاں اطمینان سے بات نہ ہو سکے گی۔''

''جیسے آپ مناسب سمجھیں۔''

شبو نے چائے بنا کر اس کے سامنے رکھی تو خرم نے اک ذومعنی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''شبو آج مجھے یقین ہو گیا کہ خواب بھی سچے ہوتے ہیں۔''

شبو اس کی بات سمجھ تو گئی لیکن یوں انجان بنی چپ چاپ چائے کے گھونٹ پیتی رہی۔ اسے خاموش دیکھ کر خرم نے خود ہی بات چھیڑ دی۔ ''شبو کیا بات کرنی تھی تمہیں۔''

شبو نے کئی بار پلکیں جھپکائیں اور بڑی خود اعتمادی سے بولی۔ ''آپ نے جو بات نیرو آپا سے کہی ہے نا وہ مجھے بالکل پسند نہیں۔''

خرم کا چہرہ جواب سے کچھ دیر پہلے کھلا کھلا سا تھا یک دم متغیر ہو گیا۔ سوالیہ نظروں سے اس نے شبو کی طرف دیکھا۔ شبو اک لمحے کو گڑبڑا گئی پھر سنجیدگی سے بولی۔

''خرم بھائی آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا۔''

''ہوں۔'' خرم نے سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کیا میں اس کی وجہ معلوم کر سکتا ہوں؟''

''اس کی وجہ بظاہر کچھ بھی نہیں ہے اور جو میں بتاؤں تو آپ شاید سمجھ نہ

پائیں۔''

''نہیں شبو۔ تم پوری بے تکلفی کے ساتھ مجھ سے ہر بات کر سکتی ہو۔''

''بس آپ اتنا سمجھ لیں کہ میں کسی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتی۔''

''اتنا بڑا فیصلہ کر لیا جائے تو اس کے پس منظر میں اس کا کوئی جواز بھی ہوتا ہے۔''

''جواز تو خیر کیا ہو گا بہرحال دوسروں کی زندگی کے فیصلے کرنے کا اختیار آپ کو تو نہیں۔ ہمارے یہاں یہی تو مصیبت ہے کہ لڑکیوں کے دل سے کوئی نہیں پوچھتا۔ جس نے مانگ کی اسی کے ہاتھ میں اس کا آنچل جا تھمایا۔''

خرم نے پہلی بار اسے ایسی سنجیدہ باتیں کرتے سنا تھا۔ وہ بے اختیار مسکرایا۔

''بھئی یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ اس لڑکی کے دل میں کیا ہے؟''

شبو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا جواب دے رانی کا نام وہ لے نہیں سکتی تھی۔ اک بار اس نے روشن آنکھوں والے خرم کی طرف دیکھا جو بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچا کہ وہ بھی تو اتنا برا نہیں آخر کیا وجہ بتائے اس کو۔

وہ چڑ سی گئی۔ ''اب میں نیرو آپا نہیں کہ چپ چاپ ہر بات برداشت کر لوں۔'' ''کیوں؟؟؟ نیرو آپا کو منظر بھائی پسند نہیں تھے کیا.....؟''

''منظر بھائی کچھ پسند کرنے کی چیز ہیں۔'' وہ بے ساختہ کہہ گئی اور پھر پشیمان ہو گئی کہ اسے اتنی بڑی بات نہیں کہنی چاہئے تھی۔

''کیوں؟؟؟ انہوں نے کیا قصور کیا ہے۔ ویسے تم بے فکر رہو میں یہ باتیں کسی سے نہیں کہتا۔''

''نیرو آپا تو شاعرانہ طبیعت کی لڑکی تھیں اور منظر بھائی کو عدالت اور مقدموں کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ پھر انہیں بی۔ اے تک نہیں کرنے دیا۔ شادی کی ایسی جلدی مچائی۔''

خرم بڑی توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ کہتی گئی۔ ''یہ بھی کوئی بات ہوئی نہ اپنی مرضی سے پڑھ سکو' نہ زندگی کا کوئی فیصلہ ہی کر سکو۔ ہمارے یہاں تو آج بھی لڑکیاں دوسروں کے بس میں ہیں اور پھر کہتے ہیں زمانہ ترقی کر گیا ہے یہ خاک

ترتی ہوئی۔"

"دیکھو شبو۔" خرم نے مفاہمت کے انداز میں کہا۔ "مجھے ابھی تک یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ تم چاہتی کیا ہو۔ یعنی تم ابھی پڑھنا چاہتی ہو' تمہیں میں پسند نہیں یا تمہیں کوئی اور پسند ہے؟"

شبو گلابی سی ہو گئی وہ تو نٹ کھٹ سی کھلنڈری لڑکی تھی۔ ایسی سنجیدہ باتیں تو اس نے کبھی سوچی بھی نہیں تھیں اور اب خرم بیٹھا بڑی سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے دل میں جھانک رہا تھا۔ اس نے پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لی۔ دو چار گھونٹ اوپر تلے لے کر اس نے جھجک کر خرم کی طرف دیکھا اور ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ "دیکھئے خرم بھائی کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے لیکن میں ابھی پڑھنا چاہتی ہوں اور پھر رانی کی زندگی میں اپنی وجہ سے کیوں برباد کروں۔"

خرم نے ہک بک ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ بھولی بھالی شرمیلی سی رانی اس کے متعلق اس طرح سوچتی ہے۔ شبو سمجھ گئی عجلت میں بولی۔ "آپ کوئی اور مطلب نہ لیں آپ کو شاید علم نہیں کہ بڑی بہنوں کی موجودگی میں چھوٹی بہنیں بیاہی جائیں تو بڑی بہنوں پر رشتوں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں بلکہ جاہل لوگ تو ایسی ویسی باتیں کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ میں نے کہا نا ہمارے یہاں لڑکی ہونا تو بس آفت ہی ہے۔"

خرم نے اطمینان کا سانس لیا اور بولا۔ "شبو تم ٹھیک کہتی ہو لیکن میں اس وقت تک انتظار کر سکتا ہوں۔ جب تک رانی کی بات نہ کہیں ہو جائے پھر تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا نا۔"

خرم نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اس کی پلکیں خود بخود جھک گئیں۔ اس نے کبھی بھول کر بھی نہیں سوچا تھا کہ اتنا سمارٹ' اتنا خوبصورت اور ایسا چلبلا نوجوان کبھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا عندیہ طلب کرے گا۔

ایک لمحے کو وہ ڈگمگا سی گئی۔ وہ خرم جس کی آنکھوں میں چاہت ہی چاہت تھی اور بظاہر اس میں کوئی بات بھی نہیں تھی جو اسے چاہنے سے روکے۔

ڈولتے ہوئے دل کو اس نے بڑی مشکل سے سنبھالا اور اٹکتی ہوئی زبان میں

بہ وقت تمام کہہ سکی۔ "دیکھئے خرم بھائی فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

خرم نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور اپنی بات میں زور پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "شبو کیا بات ہے جو تمہاری زبان پکڑتی ہے تمہیں اقرار سے روکتی ہے بتاؤ مجھے۔"

شبو کیلئے اس سے آنکھیں چار کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ چھڑاتی ہوئی بولی۔ "آپ کو تو یونہی غلط فہمی ہے ورنہ کوئی بات نہیں۔"

"کوئی بات ہے تو ضرور مجھ سے بھی چھپاؤ گی۔"

"کہہ جو دیا کہ نہیں ہے۔" وہ کچھ چڑ سی گئی پھر گھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔ "خرم بھائی ہم اچھے دوستوں کی طرح ہمیشہ مل سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ نے میری باتوں کا برا نہیں مانا ہوگا۔ ہر انسان کو اپنے متعلق سوچنے کی تو آزادی ہونی چاہئے۔"

خرم بالکل خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا بولا کچھ نہیں۔ کرسی دھکیل کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "دیر ہو رہی ہے اب میں چلوں گی۔"

راستہ بھر دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ جب وہ کالج کے قریب ٹیکسی سے اترنے لگی تو خرم نے کہا۔ "شبو تمہیں خود بھی نہیں معلوم کہ تم کیا چاہتی ہو۔ میرا خیال ہے تم اس پر سنجیدگی سے سوچنا اور پھر کسی وقت مجھ سے بات کرنا۔"

شبو نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ "میرا خیال ہے اب اس کی ضرورت نہیں۔" اور اپنے ڈولتے ہوئے دل کو بمشکل سنبھالتی ہوئی نیچے اتر آئی۔ خرم نے شیشے میں جھانک کر ہاتھ ہلایا تو اس نے بھی جواباً ہاتھ ہلا دیا۔

☆......☆......☆

"شبو! لو تمہاری تصویریں آ گئیں۔" محسن بھائی نے لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔

"ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیں۔" شبو جو بظاہر تو کتاب پڑھ رہی تھی لیکن سوچ کچھ اور ہی رہی تھی۔ چونک کر بولی۔

"میرے کمرے سے کتابیں تم لائی تھیں۔" انہوں نے پوچھا۔

"جی۔" کھوئی سی شبو نے ایک بار سر اٹھا کے دیکھا۔ "نہیں میں تو نہیں نیرو آپا پڑھنے کیلئے لے گئی تھیں۔ میرا خیال ہے' کل واپس لائی تو تھیں۔" وہ اٹھ کر شیلف دیکھنے لگی۔

محسن بھائی وہیں کھڑے ایک رسالے کی ورق گردانی کرنے لگے۔ "واپس لے آئی ہوں تو دے دو۔ لائبریری کی ہیں۔"

"دیکھتی ہوں۔ تھیں تو یہیں۔" شبو نے جھک کر شیلف دیکھتے ہوئے کہا۔

اچانک برابر کے کمرے سے صمدانی صاحب کی آواز آئی۔ "بھئی جو لڑکے کی یہی مرضی ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ ویسے لڑکا بھی اچھا ہے۔ دیکھا بھالا ہے۔"

"خاک ٹھیک ہے۔" اماں بی کی کڑکتی ہوئی آواز آئی۔ "آپ کا مطلب ہے بڑی کو چوکھٹ پر بٹھائے رکھیں اور چھوٹی کو بیاہ دیں تو دنیا کیا کہے گی۔"

"ہمیں دنیا دیکھنی ہے کہ اپنا بھلا سوچنا ہے۔ اب ہم لڑکے کو مجبور کرنے سے تو رہے۔"

"یہی تو آپ سے کہتی ہوں کہ رانی کیلئے بھی کوئی لڑکا دیکھیں۔ بات پکی ہو جائے تو دونوں کے فرض سے سبکدوش ہوں۔" محسن بھائی نے چونک کر ایک بار شبو کی طرف دیکھا۔ اس نے رخ پھیر لیا۔

صمدانی صاحب کی آواز پھر آئی۔ "لڑکا تو ہے میری نظر میں۔"

"کون؟" اماں بی نے بے صبری سے پوچھا۔

"محسن کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ گھر کا لڑکا ہے۔ سادہ طبیعت' نیک اور شریف ہے اور پھر میری مرحوم بہن کی نشانی ہے۔"

"کیا کہا؟" اماں بی جیسے کاٹ کھانے کو دوڑیں۔ "وہ مواہ لنگڑا اب ہم لاوارثوں کو داماد بنائیں گے؟"

محسن بھائی کے دل میں جیسے ایک پھانس سی چبھ گئی۔ شبو کو بھی اماں کی بات بہت بری لگی۔ وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ صمدانی صاحب کی آواز آئی۔

"زبان سنبھال کر بات کرو۔ اس بے چارے لڑکے سے نہ جانے تمہیں کیا بیر ہے؟"

"ہاں مجھے ہی تو اس منحوس سے بیر ہے۔ یتیم لاوارث ہی کیا میری بیٹیوں کیلئے رہ گئے ہیں۔"

"خدا کا خوف کرو بیگم بات کرنے سے پہلے سوچ لیا کرو۔"

"آپ بھی تو سوچ کر بات کیا کیجئے۔ نہ کام کا نہ کاج کا اور آپ اسے بیٹی دینے پر تلے ہیں۔"

بات طول کھینچ گئی۔ اماں بی نہ جانے کیا کیا زہر اگلتی رہیں اور شبو کو محسن بھائی سے آنکھ ملانا محال تھا۔ بے شک اس نے کبھی محسن بھائی کی عزت نہیں کی تھی۔ لیکن اماں بی سے ایسی زہریلی باتیں سن کر وہ پانی پانی ہو رہی تھی اور محسن بھائی یوں ساکت سے کھڑے تھے جیسے وہ محسن بھائی نہ ہوں ان کا مجسمہ نصب ہو۔ وہ کچھ دیر خاموش کھڑے رہے پھر جیسے اپنے آپ سے گویا ہوئے۔

"اس گھر میں میرا بوجھ بڑھتا ہی جاتا ہے۔" وہ مبہم سی آواز میں بڑبڑائے۔

شبو بے اختیار ان کے قریب چلی آئی۔ ان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہمدردی سے بولی۔

"محسن بھائی مجھے اماں بی کی باتوں کا بہت افسوس ہے لیکن خدا کی قسم ہم تو آپ کو ایسا نہیں سمجھتے۔"

محسن بھائی نے اس کی طرف دیکھے بغیر اس کا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹا دیا اور خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئے اور شبو وہیں کھڑی رہی۔

☆......☆......☆

محسن بھائی کو لگتا تھا جیسے آج ان کی دونوں ٹانگیں مفلوج ہو گئی ہیں۔ بڑی مشکل سے اپنا بوجھ سنبھالتے ہوئے وہ لنگڑاتے ہوئے اپنے کمرے میں آئے۔ ابھی وہ فیصلہ بھی نہیں کر پائے تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہئے کہ تمت بدحواسی میں بھاگتی ہوئی آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے گڑیا تھی۔ جو شاید اس سے کوئی چیز چھیننا چاہتی تھی۔ محسن بھائی نے چونک کر انہیں دیکھا۔ گڑیا نے تمت کو جا لیا اور اس کے بال کھینچنے لگی۔ تمت ایک ہاتھ میں کوئی چیز چھپائے ہوئے تھی اور دوسرے ہاتھ سے گڑیا کو الگ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ محسن بھائی نے بڑھ کر بیچ بچاؤ کرایا۔ بال کھینچنے سے تمت کا سانولا چہرہ تمتما

رہا تھا۔ گڑیا اب بھی اس کی طرف جھپٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تمت محسن بھائی کا دامن پکڑ کر ان کے پیچھے دبک گئی۔ محسن بھائی نے گڑیا کو بازو سے پکڑ کر ایک جانب ہٹایا اور سختی سے بولے۔ ''گڑیا کیوں لڑ رہی ہو اس سے۔''

''واہ...... اس نے میرا رومال کیوں لیا۔'' گڑیا نے تنک کر کہا۔

''نہیں...... نہیں میں نے تو خود بنایا ہے۔ میرا رومال ہے۔'' تمت کی آواز بھرا گئی۔

''کوئی نہیں وہ میرا ہے۔'' گڑیا نے ڈپٹ کر کہا۔

''جھوٹ نہ بولو گڑیا۔'' محسن بھائی نے جھڑکا ہمیشہ اس کی چیزوں پر قبضہ جماتی ہو۔ بری بات ہے۔''

گڑیا کچھ مرعوب تو ہوئی لیکن پھر بھی ڈھٹائی سے بولی۔ ''اس نے میرا رومال لیا ہے۔ میں تو لے کر چھوڑوں گی۔'' وہ پھر تمت کی طرف جھپٹی۔

''محسن بھائی قسم سے یہ میں نے بنایا ہے۔'' تمت نے التجا آمیز لہجے میں کہا اور رومال کو اور بھی کس کے مٹھی میں بھینچ لیا۔ محسن بھائی کو علم تھا کہ گڑیا جھوٹ بول رہی ہے لیکن اگر اسے کچھ کہہ دیتے تو وہ آسمان سر پر اٹھا لیتی۔ دونوں اب سمجھ دار تھیں لیکن بچوں کی طرح لڑنے کی عادت نہیں گئی تھی۔ زیادتی ہمیشہ گڑیا ہی کی جانب سے ہوتی لیکن طرفداری بھی سب اسی کی کرتے۔ اور تمت کسی کونے میں آنسو بھری آنکھیں لئے بیٹھی۔ انگوٹھا چوستی جاتی۔

گڑیا کو سو طرح کے لالچ دے کر محسن بھائی نے بڑی مشکل سے ٹالا اور تمت سہمی سہمی سی وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس کی ہراساں صورت دیکھ کر محسن بھائی اپنی پریشانی بھول گئے۔ تمت نے اک چور سی نگاہ ان پر ڈالی اور روہانسی ہو کر بولی۔ ''محسن بھائی قسم سے میں جھوٹ نہیں بولتی۔''

محسن بھائی نے پیار سے اس کے بال سمیٹ دیئے۔ ''پتہ ہے مجھے اب تم جاؤ کھیلو جا کر۔''

ان کے کانوں میں اب تک اماں بی کے فقرے گونج رہے تھے۔ وہ اطمینان سے بیٹھ کر سوچنا چاہتے تھے۔ تمت دروازے کی طرف بڑھی اور پھر ہولے سے پلٹ

آئی اور آہستہ آہستہ چلتی ان کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ معصومیت سے اس نے مٹھی کھول کر ان کے سامنے کر دی۔ جس میں پسینے میں بھیگا مڑا تڑا رومال پکڑ رکھا تھا۔

''دیکھیں تو ساری استری خراب ہو گئی۔''

محسن بھائی نے دھیان نہیں دیا۔ یوں ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے جھجکتے ہوئے رومال ان کی گود میں رکھ دیا اور لجاجت سے بولی۔ ''محسن بھائی' یہ آپ لے لیں۔''

''نہیں چندا تم ہی رکھو۔''

وہ پشیمان سی ہو کر بولی۔ ''ہائے محسن بھائی یہ تو میں نے آپ کیلئے بنایا ہے اور آپ لیتے ہی نہیں۔''

محسن بھائی نے اک نگاہ اس کے پرخلوص چہرے پر ڈالی جو تاسف کی اک کیفیت میں ڈوب رہا تھا۔ اس کی تیزی سے جھپکتی آنکھوں میں نمی آہستہ آہستہ اتر رہی تھی۔ انہوں نے جلدی سے رومال کھول کر دیکھا۔ جس پر چھوٹا سا خوبصورت پھول کڑھا ہوا تھا۔ انہیں اپنے تپتے وجود پر شبنم کی سی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔

''اوہو یہ تم نے بنایا ہے۔'' انہوں نے مصنوعی حیرانی سے آنکھیں پھیلائیں تو تمت کا سانولا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا۔ کچھ کچھ شرماتی ہوئی بولی۔

''محسن بھائی میں تو سیونگ میں فرسٹ آئی ہوں۔''

''آہا!!!'' انہوں نے پیار سے اس کے گال تھپتھپائے۔ ''اتنا اچھا رومال بنایا ہے تم نے۔ واہ واہ۔ تمت اور بھی شرما گئی اور آہستہ سے بولی۔ ''محسن بھائی یہ میں نے صرف آپ کیلئے بنایا ہے۔''

اس کے لہجے میں بچپن کی معصومیت جھلکتی تھی۔ محسن بھائی کا ٹوٹا ہوا دل جیسے آپ سے آپ جڑ رہا تھا۔ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر بٹھا لیا۔ یہ بھی شاید میری ہی جیسی قسمت لے کر آئی ہے۔ میں تو غیروں میں گھرا ہوں اور یہ اپنوں میں رہ کر بھی کتنی تنہا ہے۔ وہ بچپن کی حدود سے آگے بڑھ رہی تھی لیکن اب تک اس گھر میں اس کی حیثیت اک فالتو چیز کی سی تھی۔ بے جا سختی' روک ٹوک اور گڑیا کی برتری نے اس کو ذہنی طور پر بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ وہ شعور کی حدود میں قدم رکھ رہی تھی لیکن اب

بھی وہ بچوں کی طرح معصوم اور بھولی بھالی تھی۔ ان بچوں کی طرح سہمی ہوئی جو نادانستگی میں کوئی شرارت کر بیٹھے ہوں اور اب متوقع سزا کے خوف سے سہمے جاتے ہیں' نہ جانے تحفظ کے کس احساس تلے وہ ان کے بازو سے لگ گئی اور ان کی گود میں پڑا رومال اٹھا کر ان کی جیب میں ڈالنے لگی۔

''تمو چندا بھئی یہ رومال تو بہت اچھا ہے۔'' محسن بھائی نے اس کے بے حد سیاہ بالوں میں انگلیاں الجھا کر کہا۔ جو گڑیا کے کھینچنے سے الجھ کر بے ترتیب ہو گئے تھے۔ خوشی کے بے پناہ جذبات سے سرشار ہو کر اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور ان کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں مسرت کے دیپ سے جل رہے تھے اور وہ بنا پلک جھپکے ان کی طرف دیکھتی جاتی تھی۔ محسن بھائی کو اس کا سادہ سا معصوم چہرہ کسی ننھی منی پری کا چہرہ معلوم ہو رہا تھا۔ جو دوسروں کو چھوٹی چھوٹی خوشیاں دینے کو اس دنیا میں چلی آئی ہو۔ انہوں نے جھک کر اس کی پیشانی پر پیار کر لیا اور مبہم سی آواز میں بولے۔

''تمو......تو مجھے بہت یاد آئے گی۔''

دو ایک روز تو کسی کو خیال ہی نہیں آیا کہ محسن بھائی صبح کے گئے پھر نہیں پلٹے ہاں تمت کئی بار ان کے کمرے میں جھانک آئی تھی۔ بہت دیر تک ان کی کرسی پر بیٹھی ان کی چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی تھی۔ یوں ہی اک کونے میں کھڑی چپ چاپ انگوٹھا چوستی رہی تھی لیکن محسن بھائی تو ایسے غائب ہوئے تھے کہ پلٹ کر نہیں دیکھا۔

صمدانی صاحب کے نام ڈاک سے ان کا ایک معذرت نامہ ملا تھا جس میں صمدانی صاحب سے یوں چپ چاپ چلے آنے پر معذرت کی گئی تھی۔ صمدانی صاحب تو سر پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ مرحومہ بہن کی یاد کا زخم ایک بار پھر ہرا ہو گیا لیکن سب لا حاصل۔ محسن بھائی نے کالج بھی چھوڑ دیا تھا اور اپنا پتہ بھی خط میں نہیں لکھا تھا۔ ان کے دوستوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔

اماں بی نے اطمینان کا سانس لیا کہ خواہ مخواہ کے بوجھ سے خود ہی نجات مل گئی۔ بڑی اماں بھی اس خوشی میں برابر کی شریک تھیں۔ ہاں شبو چند دنوں تک کھوئی کھوئی سی رہی تھی۔ تصور میں محسن بھائی کا دکھی چہرہ جھلکتا تو وہ تاسف سے سوچتی۔

''واقعی ہم انسان نہیں۔''

تمت کو کسی نے بتانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ گھر کا کوئی ایسا اہم فرد بھی نہیں تھی جو اس کو ہر بات بتائی جاتی۔ خالی کمرے میں کئی بار جا کر وہ پلٹ آئی تھی۔ ان کے بغیر وہ کمرہ کتنا سونا تھا۔ گھنٹوں وہ گیٹ پر کھڑی رہی تھی کہ شاید محسن بھائی کہیں سے آ جائیں گے تو وہ دوڑ کر ان کا ہاتھ تھام کر ان کے بازو سے جھول جائے گی اور وہ اس کے بکھرے بال سمیٹ کر اس کے منہ سے انگوٹھا نکال کر کہیں گے۔

''ارے تمو۔ اتنی بڑی ہو کر انگوٹھا چوستی ہو۔ ہیں۔''

سکول میں بھی جی نہیں لگتا تھا۔ ہر دم محسن بھائی کی صورت نگاہوں میں پھرتی رہتی ہے۔ ان کا وہ بے لوث پیار اسے رہ رہ کر یاد آتا تو اس کا جی چاہتا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی کو بتائے بغیر محسن بھائی کو ڈھونڈنے نکل کھڑی ہو۔ دنیا کے کونے کونے میں انہیں ڈھونڈتی پھرے۔ انہیں پکارے اور وہ کہیں چھپ کر کھڑے ہوں تو پیچھے سے ہولے ہولے جا کر ان سے لپٹ جائے۔ ''ہائے دیکھیں تو محسن بھائی آپ کے بغیر میں کتنی اداس ہوں۔ کوئی میرا خیال نہیں رکھتا۔ کوئی مجھ سے بات نہیں کرتا۔ گڑیا مجھے مارتی ہے تو کوئی نہیں چھڑاتا۔ کوئی مجھے پیار نہیں کرتا۔'' اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر بھر آئیں اور وہ ادھر ادھر دیکھ کر انہیں بڑی بے دردی سے پونچھ لیتی۔

ایک دن موقع دیکھ کر اس نے گلاں سے پوچھ ہی لیا۔ ''گلاں محسن بھائی کدھر چلے گئے؟''

''تمت بی بی وہ تو چلے گئے۔''

'کہاں......؟'' اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

''ناراض ہو کر گئے ہیں۔ شاید جبھی بتا کر نہیں گئے۔''

''مجھ سے بھی۔'' اس نے مبہم سی آواز میں پوچھا جو گلاں کی سمجھ میں نہیں آیا اور وہ پھر سے کام میں مصروف ہو گئی۔

تمت کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ کبھی اس کا جی چاہتا کہ چیخ چیخ کر

روئے۔ اتنی زور سے چلائے کہ محسن بھائی جہاں کہیں بھی ہوں اس کی آواز سن کر آ جائیں اور وہ ان کے گلے میں باہیں ڈال کر انہیں منا لے کبھی وہ دل ہی دل میں دعائیں کرتی کہ محسن بھائی اسے خواب میں ہی مل جائیں۔

ان کا کمرہ تو اب مکمل سٹور روم کا کام دیتا تھا۔ اس میں پہروں تنہا بیٹھی وہ نہ جانے کیا کیا سوچا کرتی۔ محسن بھائی کے پیار نے محبت کی کمی کا اسے کبھی احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ گھر بھر میں نظر انداز کر دی گئی تھی لیکن اس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ ان کی موجودگی میں اس نے کبھی خود کو تنہا محسوس نہیں کیا تھا لیکن اب وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کرتی تھی۔ رات کو سوتے میں ڈر کر اس کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ خوف کے مارے پڑی کانپتی رہتی لیکن آواز تک نہ نکالتی۔ ہر وقت سہمی سہمی رہتی۔ کسی سے کچھ نہیں کہتی تھی جو کوئی کچھ کہہ دیتا اسے چپ چاپ تسلیم کر لیتی۔ چمن کے دور دراز گوشے میں بیٹھی ہوئی کتابیں پڑھتی یا پچھلے برآمدے میں نکل جاتی اور کھڑکی میں سے جھانکتی رہتی یا اماں بی کے کمرے میں کسی بہانے سے چلی جاتی اور چوری چوری نگاہوں سے ان کی جانب دیکھتی اس کا کتنا دل چاہتا تھا کہ اماں بی کے قریب جا بیٹھے۔ وہ گڑیا کی طرح اس کے بالوں میں کنگھی کریں، کبھی پیار سے اس کی پیشانی چوم لیں۔ وہ ان کا آنچل کھینچ کھینچ کر گڑیا کی طرح ضد کرے۔ اپنی باتیں منوائے لیکن اماں بی اسے دیکھتیں تو انہیں کوئی نہ کوئی کام یاد آ جاتا۔

''تمو یہ کپڑے استری کر لے۔ قمیض کو بٹن لگا دے یہ دوپٹہ ذرا دھو کر پھیلا دے۔ گلاس کے ساتھ ذرا کباب تلوا دے۔'' اور وہ سر جھکائے ان کے حکم کی تعمیل میں مصروف ہو جاتی۔''

لیکن محسن بھائی کو آنا ہوتا تو وہ جاتے ہی کیوں؟ اور یونہی ان کیلئے اداس ہوتی رہی۔ گڑیا اکثر اس کا مذاق اڑاتی کہ اچھا ہوا جو محسن بھائی اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ وہ جو ان کی بڑی لاڈلی بنتی تھی۔ تمت ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھتی رہتی اور کچھ بھی نہ کہہ سکتی۔

دو بہنوں میں جو دوستی اور بہناپا ہوتا ہے وہ دونوں میں مطلق نہیں تھا۔ جیسے جیسے دونوں بڑی ہو رہی تھیں گڑیا اور بھی نکھرتی جاتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا

غرور، ضد، بے جا شوق بھی عروج پر تھا۔ گھر بھر میں وہ سب سے خوبصورت تھی۔ اس کے سنہرے بال سونے کے تاروں کی طرح چمکتے تھے۔ اس کی گڑیوں جیسی دلکش نیلی آنکھیں اور گلابی رنگت دیکھ کر تو عام شکل وصورت کی لڑکیاں بھی احساس کمتری کا شکار ہو جاتی تھیں۔

یہی من موہنی شکل وصورت تھی جس نے سبھی کو اس کی جانب ملتفت کر دیا تھا اور اس لاڈ و پیار نے اس کی فطری شوخی اور چونچال پن کو زبان درازی اور بے لگام ضد میں ڈھال دیا تھا۔ وہ خوب کھل کر باتیں کرتی، قہقہے لگاتی اور کسی بات سے نہیں جھجکتی تھی۔ بچپن سے جو وہ سب کا پیار سمیٹتی آئی تھی آج بھی اس کا مقدر تھا۔ وہ ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھی۔ اس کی بہت سی سہیلیاں تھیں۔ استانیوں میں وہ مقبول تھی اور ہر ڈرامے میں ہیروئن بنتی اور ہر تقریب میں پیش پیش ہوتی۔

جب گھر میں یا باہر سب لوگ اس کا مقابلہ تمت سے کرتے تو تمت اپنے آپ کو مجرم تصور کرنے لگتی۔ جیسے اس کی معمولی شکل وصورت بھی اس کا قصور ہے۔ بچپن سے جو وہ نظر انداز ہوتی آئی تھی تو اس کے اپنے نزدیک بھی اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ اس کی اپنی کوئی شخصیت نہیں بن پائی تھی۔ وہ جیسے دوسروں کی طرف دیکھنے، ان کے فیصلے سننے اور تعمیل میں سر جھکانے کیلئے پیدا ہوئی تھی۔ اس میں سوچنے اور خود سے کچھ کرنے کی صلاحیت ہی پیدا نہیں ہو پائی تھی۔ وہ کوئی بھی کام کرتی اسے لگتا، جیسے غلط کر رہی ہے۔ جیسے ابھی اسے کوئی ٹوک دے گا کام بگاڑنے پر اسے ڈانٹنے لگے گا۔

☆......☆......☆

گڑیا سے تو وہ خاص طور پر بہت دبتی تھی۔ گڑیا تو گھر بھر کی ملکہ تھی اور تمت اس کی سب سے کمتر رعایا۔ مسلسل محرومیوں نے اسے اک دکھی روح بنا دیا تھا اور اب اس کی سب سے بڑی محرومی محسن بھائی کا چلا جانا تھا۔ ان کے جانے سے وہ اس طرح سہم گئی تھی جیسے ہر آن اسے دھڑکا ہو کہ کوئی اس کا وجود کچلنے چلا آ رہا ہو۔

اک طوفان نے سارے گھر کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں تھیں۔ اس اچانک سانحے نے سب کو حیران اور ششدر کر دیا تھا۔ ایک طویل عرصے سے اس گھر نے کوئی

ایسا سنگین غم نہیں سہا تھا تو اب اس غم کے پہاڑ نے انہیں چکنا چور کر کے رکھ دیا تھا۔ پورے گھر کا نظام ہی بدل گیا تھا۔

نیرو کرب تخلیق میں جان ہار گئی تھی جو تخلیق دل میں بسی ہو وہ خون جگر مانگتی ہے۔ تو ان چاہی تخلیق جان کا نذرانہ طلب کرتی ہے۔ ایک دن کا معصوم بچہ جس نے ماں کی صورت نہیں دیکھی ممتا کے لمس سے محروم رہا تھا۔ تقدیر کے فیصلوں اور بزرگوں کی دور اندیشوں نے رانی کی گود میں لا ڈالا تھا۔

منظر صاحب کے کوئی قریبی عزیز تو تھے نہیں رشتہ داری تھی تو یہیں پر۔ نیرو کے غم میں وہ نڈھال تھے اس پر بچے کی فکر الگ ان کی جان کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ ان کی عمر بھی ایسی نہیں تھی کہ باقی زندگی یاد الٰہی میں صرف کرتے۔ اماں بی اور بڑی اماں کو الگ سے یہ غم مارے دیتا تھا کہ سوتیلی ماں بچے کا نہ جانے کیا حال کرے۔

بچہ دو چار مہینے رانی کی گود میں ہی پلتا رہا۔ منظر صاحب الگ نیرو کی یاد میں جان ہلکان کیے دیتے تھے پھر وہی ہوا جو ہوتا آیا۔ بنا جانے' بنا سمجھے' بنا پوچھے لڑکی کی تقدیر کا فیصلہ ہو گیا اور منظر صاحب کون سے ایسے برے تھے۔ شکل صورت کے وہ اچھے تھے۔ کھاتے پیتے تھے اور پھر نیرو کو انہوں نے بڑے سکھ میں رکھا تھا اور پھر رانی کو بھی نہ کہیں بیاہنا ہی تھا۔

شبو نے بھتیرے ہاتھ پاؤں مارے رانی کی جگہ اپنے آپ کو پیش کیا لیکن رانی بہنوں سے بڑی تھی۔ بچہ بھی اس سے ملا ہوا تھا۔ اس لئے پہلا حق اسی کا بنتا تھا اور رانی نے یوں غیر متوقع طور پر دلہن بنتے ہوئے سوچا کہ ہم جیسی لڑکیوں کا کیا ہے۔ کسی نہ کسی کے پلے تو بندھنا ہی ہے اور عمر بھر اسی کے اشاروں پر آنکھ بند کیے چلنا ہے تاکہ وہ سپنے جو کبھی آنکھوں میں سجا رکھے تھے ان کی وصولی کوئی دیکھ نہ لے۔ تو پھر کیا منظر صاحب یا کوئی اور سب ہی برابر ہیں۔ منا بھی زندگی گزارنے کو اک بہانہ بن گیا تھا ورنہ زندگی کی ان انجانی راہوں پر چلتے ہوئے اسے مڑ مڑ کر دیکھنا پڑتا۔

صمدانی صاحب اس صدمے سے گنگ ہو کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے بیٹیوں کو کبھی اس شفقت سے نہیں چاہا تھا جو باپ کی ذات سے وابستہ ہوتی ہے۔ بیٹے کی آرزو میں ناکامی نے انہیں جہاں ہر چیز سے دل برداشتہ کر دیا تھا وہیں بیٹیوں کا یہ ان

چاہا بوجھ بھی ان کی زندگی کا روگ بن گیا تھا۔ وہ طبعاً زود رنج اور خشک تھے لیکن نیرو کے اچانک بچھڑ جانے نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اک متاع عزیز کے چھن جانے نے احساس ملکیت کو جگا دیا تھا۔ ملکیت سے وابستگیاں پھر تازہ ہو گئی تھیں۔ شاید پہلی بار بیٹی کی الفت ان کی روح میں اتر گئی تھی۔ غم نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ کل کی ہنستی کھیلتی نیرو ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گئی تھی۔

رانی کے بعد شبو کا نمبر آیا تھا۔ خرم نے تو پہلے ہی مانگ کر رکھی تھی۔ اب کیا قباحت رہ گئی تھی۔ شبو نے بہت واویلا مچایا کہ وہ ابھی پڑھنا چاہتی ہے لیکن اس کی کون سنتا تھا جب لڑکی کیلئے اچھا رشتہ دہلیز پر آ لگا ہو تو پھر ان جھمیلوں کی ضرورت نہیں رہتی اسی لئے شبو کو دلہن بنتے دیر نہیں لگی اور وہ پشیمان سی شرمائی ہوئی اپنے جذبات نہ سمجھ پائی تھی کہ وہ خوش ہو یا آنسو بہائے؟''

تمت کو خالی خالی گھر بڑا عجیب سا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے غم والم کی لہروں میں ہچکولے کھا رہا ہو پھر اسے نیرو آپا یاد آنے لگتیں۔ سنجیدہ سی نیرو آپا۔ بالکل شہزادی معلوم ہوتی تھیں۔ انہوں نے کبھی اس سے بات نہیں کی تھی لیکن وہ انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو لیتی تھی۔ اماں بی بھی بہت خاموش رہتیں۔ اکثر تنہائی میں روتی رہتیں۔ بڑی اماں بھی اپنے کمرے سے کم نکلتی تھیں۔ وہ پہلے بات بات میں دخل دینا' نوکروں کو کوسنا اور بچوں کو ڈانٹنا سب موقوف ہو گیا تھا۔ جسمانی طور پر بھی وہ دن بدن کمزور ہوتی جاتی تھیں۔ گھر کی فضا کچھ عجیب تنی تنی سی رہتی تھی۔ سب ایک دوسرے سے دور دور اپنے اپنے انداز میں اپنی مرضی سے اس فضا میں سانس لے رہے تھے۔ ہاں کبھی رانی اور منظر صاحب' شبو اور خرم آ جاتے تو کچھ دیر کیلئے گھر کی فضا جاگ اٹھتی تھی۔

رانی نے زندگی کا محور منے کو بنا لیا تھا۔ وقت سے پہلے ہی اس نے عورت کے تمام تر جذبات کو مامتا کی چاہتوں میں مدغم کر دیا تھا۔ وہ عام مشرقی لڑکیوں کی طرح ماں باپ کے فیصلوں پر شاکر رہنے والی لڑکی تھی۔ ممتا کی معراج حاصل ہو جائے تو اسے پستیوں میں دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ الفت و چاہت اسے سارے رشتے بھلا دیتی ہے۔ اسی لئے رانی نے بھی جیسے سب کچھ منے کے روپ میں پا لیا تھا۔ منظر صاحب کی اہمیت اس کے نزدیک ثانوی تھی۔

منا جب اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کلکاریاں مارتا اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا تو اسے کسی اور خوشی کی تمنا ہی نہ رہتی۔ اب تو اسے خرم سے الفت کا وہ مختصر زمانہ ایک بے سروپا خواب معلوم ہوتا تھا۔ منے کی ماں ہونے کے احساس نے اسے عجیب سنجیدہ اور بردبار بنا دیا تھا۔ اس نے تو شبو کو بھی بڑی دور اندیشی سے سمجھایا تھا کہ تم کسی قسم کے احساس جرم میں مبتلا نہ ہونا۔ خرم کے ساتھ لگاؤ تو عمر کے اس دور کا تقاضا تھا۔ جب اس خاص محبت کی طلب کسی نہ کسی پیکر کی جستجو میں رہتی ہے۔ مرادوں کے دل تو یونہی رنگین خوابوں کے بہانے تلاش کرتے ہیں۔ لیکن خوابوں کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ وہ تو ایسے بے سروپا افسانے ہیں جو کوئی اناڑی کاغذ قلم لے کر تخلیق کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس سے مکمل کہانی کبھی نہیں بن پاتی۔

اسی لئے شبو جو خرم کی بے پناہ محبت میں کھو کر بھی چونک چونک جاتی تھی اس کی بے لوث چاہتوں پر اعتماد کر کے بھی بے ٹھکانہ تھی۔ اس کے مضبوط ہاتھوں میں ہاتھ دے کر بھی وہ گم کردہ راہ تھی۔ رانی کے چہرے پر سچائی کا نور دیکھ کر سنبھل سنبھل گئی۔ اسے شاید پہلی بار احساس ہوا کہ خرم اس کا ہے اور صرف اس کا اپنا۔!!!

☆......☆......☆

گڑیا نے بھی میڈیکل گروپ لیا تھا۔ ڈاکٹر بننا' سفید براق اور آل پہنے جیب میں سٹیتھسکوپ ڈالے' فراٹے بھرتے ہوئے راؤنڈ لگانا۔ نوخیز لڑکیوں کیلئے بڑا ارمان انگیز ہوتا ہے لیکن صحت کی دیوی بننے کیلئے جس ریاضت کی ضرورت پڑتی ہے وہ راہ میں ہی جذبات ٹھنڈے کر دیتی ہے۔

یوں تو گڑیا ذہین تھی۔ کالج میں سر آنکھوں پر بٹھائی جاتی تھی۔ جلد ہی وہ کالج بذر کی جان سمجھی جانے لگی۔ غیر نصابی سرگرمیوں کی سرخیل بھی وہی ہوتی تھی۔ کھیلوں میں وہ آگے' ڈراموں میں وہ حصہ لے۔ الیکشن میں وہ کھڑی ہوئی تو پڑھائی کی طرف دھیان دینے کا وقت ہی نہیں بچا پھر بھی پاس تو اچھے نمبروں سے ہوئی لیکن میڈیکل کالج میں اسے داخلہ نہیں ملا۔

چپ چاپ ہر وقت اک کونے میں گھسی ہوئی پڑھنے والی تمت جس کی کالج میں کوئی گہری دوست نہیں تھی' جو کلاس کی سب سے غیر معروف لڑکی تھی اور جو کالج میں

عجوبہ روزگار کے طور پر دیکھی جاتی تھی کہ وہ گڑیا جیسی خوبصورت لڑکی کی بدصورت بہن تھی جو دوسری لڑکیوں سے بات کرتے بھی ہچکچاتی تھی۔ وہ کوئی ایسی دلچسپ ساتھی نہیں تھی کہ لڑکیاں اس کی دوستی کی تمنا کریں۔ جس نے سب سے الگ تھلگ اک دنیا بسا رکھی تھی۔ اس نے کسی سے بھی کوئی امید وابستہ نہیں کی تھی۔ خلاف توقع اس کے بہت اچھے نمبر آئے تھے اور امید تھی کہ اسے میڈیکل کالج میں داخلہ مل جائے گا۔

گڑیا نے گھر بھر سر پر اٹھا لیا کہ اگر اسے میڈیکل میں داخلہ نہیں مل سکتا تو تمت کو بھی اس کا کوئی حق نہیں۔ وہ بھی اس کی طرح بس بی۔ ایس سی ہی کرے اور پھر ایسی ڈاکٹر کو دیکھ کر تو مریض بغیر کلوروفارم کے بیہوش ہو جائیں گے۔ ہو سکتا ہے بعض کا خوف سے ہارٹ فیل ہی ہو جائے۔ اس لئے تمت کا ڈاکٹر بننا یوں بھی کچھ ٹھیک نہیں۔ تمت نے سنا تو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی۔ گڑیا کیا کسی کے آگے بھی اس کی زبان نہیں چلتی تھی۔ وہ دوسروں کے حکم کی تعمیل پر جیسے مجبور تھی۔ اسے اپنی شخصیت کے اظہار کا ڈھنگ ہی نہیں آتا تھا۔ اس کی ٹوٹی پھوٹی شخصیت میں ان عناصر کی تشکیل ہی نہیں ہونے پائی تھی جو اسے کوئی فیصلہ کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کی جرأت عطا کرتے۔ بے جا روک ٹوک نے اسے باغی بنانے کے بجائے اک مظلوم روح بنا دیا تھا جو ظلمتوں میں اس طرح مقید ہو کر رہ گئی تھی کہ روشنی کی پہچان تک بھول گئی تھی۔

اسی لئے تو جب گڑیا نے اس کے میڈیکل کالج میں داخل ہونے کے خلاف واویلا مچایا تو وہ یوں ششدر ہو گئی کہ اس کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ بات گڑیا کی ہی مانی جائے گی' گھر بھر میں اس کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے وہ گویائی سے محروم ہے لیکن اس آرزو کے ساتھ تو اس کے بچپن کی کتنی ہی سہانی سی یادیں وابستہ تھیں۔ تنہائیاں جو اس کی جنم جنم کی ساتھی تھیں۔ کبھی ان میں اک مہربان چہرہ بھی چھن سے جھانکا کرتا تھا۔ تو وہ روتی روتی ہنس پڑتی تھی۔ اداس ہوتی تو مسکرانے لگتی۔ وہ محسن بھائی کا مانوس چہرہ تھا جس کے تصور سے ہی وہ پھر وہی معصوم بھولی بھالی' سہمی ہوئی سی بچی بن جاتی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر لیتی اور سوچتی کاش کبھی محسن بھائی آ جائیں تو وہ ان سے لپٹ ہی تو جائے۔ اتنی مضبوطی سے ان کی قمیض کے دامن کو پکڑے کہ پھر کبھی

نہ چھوڑے اور جلدی جلدی انہیں ساری باتیں سنا دے۔ ''دیکھیں تو محسن بھائی گڑیا مجھے میڈیکل کالج میں ایڈمیشن نہیں لینے دیتی۔'' اور وہ اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اس کے کان میں کہیں۔ ''چندا ہم تمہیں کالج میں داخل کروائیں گے۔ پر تم بتانا کسی کو نہیں۔'' اور وہ مسرت سے کھلکھلاتی ہوئی ان کے ساتھ ساتھ دوڑتی ہوئی چلی جائے۔

لیکن محسن بھائی تو سب کی زندگی سے چپ چاپ اس طرح نکل گئے تھے جیسے کبھی اس گھر میں ان کا وجود تھا ہی نہیں۔ وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی تو دیکھتی کہ اکیلی بیٹھی انگوٹھا چوسے جاتی ہے۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہے چلے جاتے ہیں۔

اس کو تو گڑیا کی ان لایعنی ضدوں کے خلاف احتجاج کرنے کا حق بھی نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی بات لائق توجہ سمجھی ہی نہیں جاتی۔ بڑی اماں تو پہلے ہی ہول رہی تھیں۔ ''کیا فائدہ لڑکیوں کو ڈاکٹر بنانے کا۔ آخر کو تو انہیں چولہا ہی جھونکنا ہے تو نگوڑے مردوں کی چیر پھاڑ کرنا کیا ضروری ہے۔''

اماں بی نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ ''میڈیکل کالج گھر سے دور ہے۔ دونوں کا ساتھ ہو جاتا تو اور بات تھی ویسے بھی کیا فائدہ مغز ماری کا۔ لڑکیوں کیلئے بی۔ اے تک پڑھ لینا ہی بہت ہے۔''

تمت ٹکر ٹکر سب کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ جیسے اسے کچھ کہنے پر قدرت نہ ہو۔ جیسے کوئی بے بس مجرم اپنی تقدیر کا فیصلہ سن رہا ہو۔ چپ چاپ چلتی ہوئی وہ چمن میں نکل آئی اور کسی دور دراز گوشے میں گھٹنوں بیٹھی روتی رہی۔ اس نے کتنا چاہا تھا کہ اماں بی کے گلے میں بازو ڈال دے اور گڑیا کی طرح ٹھنکتی ہوئی کہے۔

''اماں بی میری اس پہلی ضد کو آج تو مان لو کہ میں بھی ممتا کا شیریں مزہ چکھ لوں۔ ایک آرزو جو میں بچپن سے ساتھ لئے ہوں اسے یوں تو نہ کھو دو لیکن وہ گنگ کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ ایک لفظ بھی تو اس کی زبان سے نہیں نکلا تھا۔ اماں بھی اپنا فیصلہ سنا کر پھر سے کام میں مگن ہو گئی تھیں۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور تمت نے دکھی ہو کر سوچا تھا۔'' کہ وہ کیسی مائیں ہیں جو بیٹیوں کے دلوں کے بھید ان کے چہرے سے پڑھ لیتی ہیں۔ ان کے دکھوں کی کھنک وہ اپنے کلیجے پر محسوس کرتی ہیں۔ بیٹیوں کے آنسو ماؤں

کی آنکھوں سے بہتے ہیں لیکن اس کے مقدر میں ممتا کا ایسا روپ ہی نہیں تھا۔ وہ اس مہربان تصور سے بہت دور تھی۔ اس کی آنکھوں میں رکے آنسوؤں' اس کی شکستہ چال کا کوئی اثر بھی تو اماں بی پر نہیں ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

اسے یوں پسپا ہوتے دیکھا تو گڑیا کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ تمت جو اس کا احساس شکست بن گئی تھی خود ہی مفتوح ہو گئی تھی۔ گڑیا کی ضد کے آگے وہ کیونکر ٹھہرتی۔

روتی ہوئی تمت کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ روئے یا ہنسے۔ قسمت کبھی یوں بھی مہربان ہو سکتی ہے۔ محرومیاں اس نے اس قدر پائی تھیں کہ کسی چیز کے حصول کا خیال بھی اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ اس عجیب اتفاق' اس انہونی بات پر اعتبار کرنے کی بھی اس میں جرأت نہیں تھی۔

اس کی بیالوجی کی لیکچرار کے بے پناہ اصرار پر اماں بی کو ہتھیار ڈالنے ہی پڑے تھے۔ اس کی پروفیسر کا خیال تھا کہ وہ محنتی لڑکی ہے۔ اسے میڈیکل ضرور پڑھنا چاہئے۔ اماں بی تو اب بھی پس و پیش کر رہی تھیں لیکن انہوں نے ہی اسے کالج میں داخلہ دلوانے کی ذمہ داری لے لی۔

ان کے سامنے تو گڑیا کو بھی سانپ سونگھ گیا اور اماں بی یہ سوچ کر خاموش ہو گئیں کہ ایسی معمولی شکل و صورت کی لڑکی کو کسی قابل تو ہونا ہی چاہئے۔ کل کلاں کو رشتہ نہ ملا تو کم از کم اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے گی۔

☆.....☆.....☆

اصغری خالہ آج کل بہت آنے جانے لگی تھیں۔ وہ اماں بی کی دور پار کی رشتہ دار تھیں۔ اک عرصہ تک تو ان سے معمولی صاحب سلامت رہی تھی لیکن ان دنوں ان سے گاڑھی چھننے لگی تھی۔ مدت سے بھولا بسرا بہناپا پھر سے تازہ کیا جا رہا تھا۔

انہیں کچھ وہم کا مرض بھی تھا اسی لئے ہر تیسرے دن ڈاکٹر سے مشورہ لینے شہر چلی آتیں تو قیام انہی کے یہاں ہوتا۔ ہمراہ ان کے شاعرانہ طبیعت کے

صاحبزادے بھی اکثر ہوتے۔ خوش شکل اور سمارٹ طبیعت میں نازک خیالی اور شاعرانہ اوصاف خصوصیت سے ودیعت ہوئے تھے۔ ان کی تو بھلی پوچھی لیکن جس طرح اصغری خالہ انجم پر واری صدقے جاتی تھیں اس سے اماں بی کو اندازہ تو ہوگیا تھا کہ ان کے ارادے کیا ہیں لیکن جان بوجھ کر طرح دیئے جاتی تھیں کہ مطلب کی بات انمی کی زبان سے ادا ہو۔

عمران کو بھی انجم غزل کی محبوباؤں جیسی خوش ادا معلوم ہوتی تھی۔ اس میں معصومیت' شوخی' بھولپن اور ایسی کیفیت تھی کہ اک بار اس کی طرف دیکھ کر بار بار دیکھنے کو جی چاہتا اور اس طرح کہ نگاہ نہ ہٹے۔ اصغری خالہ نے بھی اسی غرض سے یہاں آمدورفت شروع کی تھی کہ صمدانی صاحب کی لڑکیاں خاندان بھر میں خوش شکل کہی جاتی ہیں۔ سوا تمت کے بھی چندے آفتاب چندے مہتاب تھیں اور پھر صمدانی صاحب کی مالی حالت بھی ایسی بری نہیں تھی لیکن اصغری خالہ بھی ایک ہی کائیاں تھیں۔ موقع دیکھ کر بات کرنا چاہتی تھیں۔ اور پھر انہیں عمران میاں کی مرضی بھی تو دیکھنا تھی۔ گڑیا جو بنی بنائی گڑیا تھی عمران میاں اس کی طرف بھی اشارہ کر دیتے تو وہ اس کا ہاتھ مانگنے میں بھی تامل نہ کرتیں۔ ساری بہنوں میں عمر کا تھوڑا ہی فرق تھا اور اب تو سب ہی ایک برابر نظر آتی تھیں۔ لڑکیوں کو بڑھتے کیا دیر لگتی ہے۔ پلک جھپکتی نہیں کہ انہوں نے بچپن کا ساتھ چھوڑا نہیں لیکن عمران میاں کو تو انجم ہی بھائی تھی۔ گڑیا کا ناز آمیز بچگانہ غرور انہیں کوئی خاص پسند نہیں آیا تھا۔ چھپی چھپی رہنے والی تمت پر تو کبھی انہوں نے اس انداز سے نگاہ ہی نہیں ڈالی تھی۔ چمکتی دمکتی صورتوں اور گڑھے گڑھائے نقوش میں وہ اور بھی کمتر معلوم ہوتی تھی اور پھر عمران جیسا نازک خیال لڑکا...... جو حسن کا دلدادہ اور خوبصورت چہروں کا پرستار تھا جس نے زندگی میں صرف حسن سے پیار کیا تھا۔ وہ چاندنی' لطافت اور خوشبو کا دلدادہ تھا۔ اسی لیے حسینوں کے درمیان رہنا' دلکش چہروں کا قرب اسے بہت پسند تھا۔

صمدانی صاحب کے یہاں حسن جو ٹوٹ کر بکھرا تھا تو عمران نے اپنی پسند کا موتی بے ساختہ چن لیا تھا۔ انجم ان کی نگاہوں میں ایسی سمائی تھی کہ چاندنی کے حسن

میں' پھولوں کی لطافت میں' خوشبو کے جھالوں میں انہیں انجم کا دلفریب چہرہ جھلکتا معلوم ہوتا تھا۔ وہ ان کے قلب و نگاہ میں بس کر رہ گئی تھی۔ اس کی دلکش متکلم آنکھیں' اس کے مسکراتے ہوئے رسیلے ہونٹ اور اس کی گنگناتی ہوئی مدھر آواز ...... جب وہ بات کرتی تو عمران کو یوں معلوم ہوتا جیسے ساری کائنات تھم کر اک دلکش نغمہ سمجھ کر سن رہی ہے۔ اس کا رکا رکا سا التفات' تھما تھما سا لگاؤ' حجاب آلود نامعلوم سی چاہت اسے نئی منزل روشناس کراتی ...... اس کی آنکھوں میں جھلملاتے سپنے...... اسے ان دیکھی تعبیریں سمجھاتے تھے۔

وہ فطری طور پر ہر خوبصورت چیز کا پرستار تھا اور بدصورتی سے نفرت کرنے پر مجبور...... بدزیب چیزیں اسے عجیب مضحکہ معلوم ہوتی تھیں اور وہ نفرت سے منہ پھیر لیتا یا ان کا مذاق اڑانے پر مجبور ہو جاتا۔

اسی لیے جب بھی وہ سرخ و سپید چہروں کے ہجوم میں سانولی سلونی تمت کو دیکھتا تو اس کا جی چاہتا کہ دل بھر کے اسے تنگ کرے...... اس کا مذاق اڑائے اور پھر گھر بھر میں تمت کا طرفدار ہی کون تھا بلکہ گڑیا تو عمران سے بھی دو ہاتھ آگے ہی تھی۔

ہر روز دونوں تمت کو تنگ کرنے کا ایک حربہ تلاش کر لیتے۔ عمران بڑی سنجیدگی سے تمت سے مخاطب ہوتا۔ ''ہاں تو تمت بیگم آپ میڈیکل پڑھ رہی ہیں۔'' اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی گڑیا اپنی نیلی نیلی آنکھیں گھماتی اور تمسخر سے کہتی۔ ''ہاں جی۔ یہ ڈاکٹر بنیں گی۔'' پہلے صورت تو دیکھیں اپنی۔ عمران زیرلب کہتا اور وہ ساکت سی ہو کر دیکھتی کی دیکھتی رہ جاتی۔

''اچھا ہے ملک و قوم کی خدمت ہوگی۔'' وہ بڑی عقیدت سے کہتا۔ تو سیدھی سادی تمت پچھلی بات بھول کر یونہی اک پل کو خوش ہو جاتی۔ گڑیا خوبصورت آنکھیں پھیلاتی۔

''وہ کیسے......؟؟؟''

''بھئی کلوروفارم کی بچت ہوگی۔ مریض تو اس کے بغیر ہی بے ہوش ہو جائیں گے۔ تمت کو دیکھ کر۔'' اتنا کہ کر وہ قہقہہ لگاتا تو گڑیا کی سریلی ہنسی بھی اس میں

شامل ہوتی اور تمت یوں پشیمان ہو جاتی جیسے اس کی بدصورتی اک ناقابل معافی جرم ہے اس کا جی چاہتا دونوں ہاتھوں میں اپنا بدصورت چہرہ چھپا کر کہیں بہت دور چلی جائے۔ جہاں اسے کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔ کچھ دیر وہ فیصلہ نہ کر پاتی کہ اسے کیا کرنا چاہئے اور پھر چپ چاپ اٹھ کر اپنے کمرے سے باہر نکل جاتی لیکن گڑیا کی سریلی ہنسی اب بھی اس کے تعاقب میں چلی آتی۔ وہ پہروں چمن میں ٹہلتی ہوئی نہ جانے کیا سوچتی رہتی۔ اپنے کمرے میں بیٹھی کتابوں میں کھوئی رہتی۔ نہیں تو سب کی نظر بچا کر پچھلے برآمدے میں کھڑی کھڑکی میں سے چپکے چپکے اندر جھانکتی رہتی۔ تحفظ کا اک ان دیکھا احساس اسے چپکے سے اپنی چھاؤں میں لے لیتا اور اس کے بیقرار چہرے پر ہولے ہولے طمانیت کے سندر رنگ نکھرنے لگتے۔

☆......☆......☆

اس نے اپنی اک الگ دنیا بسا رکھی تھی۔ اس میں وہ سب جیتے جاگتے چہرے جھلکتے تھے جو اس کے اردگرد رہتے بستے تھے لیکن وہ سب اس سے کس قدر دور تھے۔ کسی نے کبھی اسے لائق اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ لیکن وہ ایک ایک کو تصور میں بسائے ان سے سینکڑوں باتیں کرتی تھی۔ ایسی باتیں جو حقیقت میں کبھی اس کے لبوں تک نہیں آتی تھیں۔ لیکن تصورات میں وہ اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیتی تھی کہ وہ ان سے کتنا پیار کرتی ہے۔ انہیں کتنا چاہتی ہے۔ ابا میاں کو تو وہ دیکھ دیکھ کر جیتی تھی حالانکہ انہوں نے کبھی اس پر توجہ نہیں کی اور اماں بی جنہوں نے کبھی پیار کی نگاہ اس پر نہیں ڈالی تھی۔ گڑیا' نازی سب اسے کتنی پیاری تھیں اور انجم آپا۔ وہ سوچتی۔ ''دلہن بنیں گی تو کتنی اچھی لگیں گی۔''

جب سے اس نے عمران بھائی کو چمن میں انجم آپا سے ہولے ہولے باتیں کرتے سنا تھا تو اک خوشگوار سی حیرت نے اسے مسرور کر دیا تھا۔ عمران بھائی نے انجم آپا کے بالوں میں ایک پھول لگا دیا تھا۔ تو وہ گلابی گلابی ہو گئی تھیں اور دھیرے سے بولی تھیں۔

''ہٹ جایئے نا کوئی دیکھ لے گا۔'' اور تمت بھی سمٹ کر وہاں سے بھاگ آئی تھی۔ وہ اب شعور کی ان منزلوں پہ تھی جہاں ایسی باتیں ازخود اپنے معنی سمجھانے لگتی ہیں۔ اک اشارے' اک نگاہ اور اک لفظ میں کتنے ہی معنی جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ انجم آپا کا بار بار آئینہ دیکھنا' ذرا ذرا سی بات پر کھل کھل ہنس دینا' ہنستے ہنستے چونک پڑنا۔ تمت سب جانتی تھی کہ ان کی نگاہوں میں جو اک چمک سی جھلکتی ہے وہ کس کے نام پر بڑھ جاتی ہے۔ سرخ و سپید رنگت میں کس کے نام پر شفق سی لہرا جاتی ہے۔ ان کے تکلم میں ترنم ریزیاں کس کی موجودگی میں بڑھ جاتی ہیں تو وہ چپ چاپ آنکھیں بند کر کے

دل ہی دل میں دعا مانگتی کہ اللہ میاں ان دونوں کو یونہی خوش خوش رکھنا۔

جب وہ آنکھیں کھولتی تو وہ آنسوؤں سے نم ہوتیں۔ اس نے اپنے لئے تو کبھی کچھ نہیں چاہا تھا۔ اسے مانگنا یا چھیننا آتا ہی کب تھا۔ وہ تو باری کے انتظار میں رہتی جو کبھی نہیں آتی تھی۔ وہ ہمیشہ نظر انداز ہوتی آئی تھی۔ اب اگر کوئی اسے اہمیت دے دے تو یوں گنگ ہو کر اس کی طرف دیکھتی چلی جاتی جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ اسے خود پر اعتماد ہی کب تھا۔ وہ ہر کام ڈرتے ڈرتے کرتی تھی۔ جیسے وہ اگلے ہی لمحے بگڑ جائے گا۔ کالج میں وہ لیکچررز کے سوال کا جواب نہیں دے پاتی تھی۔ اس کے باوجود وہ پڑھائی بڑی توجہ سے کرتی۔ پرچوں میں اچھے نمبر لیتی تھی اسی لیے اس کی پروفیسرز نے اس سے کلاس میں سوال کرنے چھوڑ دیئے تھے۔ وہ اس کی دبی دبی سی طبیعت کو شرمیلے پن پر محمول کرتے تھے۔

اماں بی کا ناک میں دم تھا۔ یہ اصغری خالہ بھی ایسی حرفوں کی بنی تھیں کہ طرح دیئے جاتی تھیں اور کسی طرح بھی مدعا زبان پر نہیں لاتی تھیں اور خود اماں بی منہ بھر کر کس طرح کہہ دیتیں' آخر تو لڑکی والی تھیں۔ ادھر عمران میاں کا رجحان بھی اب کوئی ایسی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی لیکن پھر بھی معاملہ کچھ التوا میں ہی پڑا تھا۔

اماں بی ٹھنڈی سانس بھر کے سوچتیں کہ ایک یہ وقت بھی آنا تھا کہ ہمیں لڑکیوں کی بکاؤ مال کی طرح نمائش کرنا پڑ رہی ہے کہ اس کا رجحان رشتہ مانگنے کا ہے۔ اب تو لڑکے کو کھلی چھٹی تھی کہ سب لڑکیوں میں سے دیکھ بھال کر جس کو چاہے پسند کرے۔ اماں باوا کی مجال نہیں کہ ہوں ہاں کر جائیں لیکن مجبور بھی تو اتنی تھیں۔ اب بھی چار بیٹیوں کے بوجھ نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ صمدانی صاحب بھی الگ پریشان رہتے۔ ڈھلتی عمر کے ساتھ اب وہ پہلی سی ہمت اور برداشت نہیں رہی تھی۔ چار بیٹیوں کا بوجھ انہیں سر پر نظر آتا تو بعض اوقات وہ یہاں تک سوچ جاتے کہ نیرو کی جگہ ان میں سے کوئی مر گئی ہوتی۔ نیرو کو تو وہ بیاہ چکے تھے وہ اپنے گھر میں خوشحال تھی۔ لڑکیوں کی منزل تو گویا شادی ہی ہے۔ ایک مرد کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ دے کر سب یوں مطمئن ہو جاتے ہیں جیسے وہ سارا مسئلہ ہی حل ہو گیا ہو لیکن عورت کے دل میں کوئی جھانک کر نہیں دیکھتا کہ اس کی دھڑکنیں کیا کہتی ہیں۔

اماں بی تو بس انہی بکھیڑوں میں رہتی تھیں۔ بڑی اماں اکثر بیمار رہتیں۔ اپنے کمرے میں پڑی ہائے ہائے کیا کرتیں۔ بڑھاپے کی سبھی معروف بیماریوں نے ان پر اکٹھے آن کر حملہ کر دیا تھا۔ انہیں شکایت ہی رہتی کہ ان کا کوئی خیال نہیں کرتا۔ لڑکیاں ادھر سے ادھر چھلانگیں لگاتی پھرتی ہیں لیکن کوئی ان کے کمرے میں جھانکتی تک نہیں۔ رنگین سپنوں کے مرادوں بھرے دنوں میں بھلا ان کے پاس بیٹھی یہ کیونکر سنتیں کہ انہیں کہاں کہاں درد ہوتا ہے اور کس طرح سے درد کی لہریں پاؤں سے چلتی کانوں تک جا پہنچتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

اک تمت ہی تھی جو چار پانچ بجے کالج سے لوٹتی تو چپکے سے ان کے کمرے میں گھس جاتی۔ ان کی بیماریوں کی علامات سنتی رہتی۔ انہیں دوا لا دیتی۔ ان کے سر میں تیل ڈال دیتی۔ وضو کیلئے پانی دے دیتی۔ ان کا مصلیٰ بچھاتی۔ ان کی تسبیح پرو دیتی اور بڑی اماں اس کے سانولے سلونے خاموش چہرے کی طرف دیکھ کر سوچتیں کہ وہ خاموش لڑکی ان کے پاس آ کر چپ چاپ بیٹھی رہتی ہے۔ منہ سے کبھی کچھ نہیں کہتی لیکن یوں معلوم ہوتا ہے جیسے فرشتہ رحمت کسی گھر میں چپکے سے اتر آیا ہو کہ اس کے پروں کی سرسراہٹ تک سنائی نہیں دیتی لیکن اس کی رحمتوں سے اس گھر کے رہنے والے آسودہ ہو جاتے ہیں۔

اسے قبلہ رو مصلیٰ بچھاتے دیکھ کر بڑی اماں کو اس پر کتنا پیار آیا تھا۔ بچپن سے اب تک جسے انہوں نے کبھی نرمی سے مخاطب نہیں کیا تھا اب اس پر انہیں ٹوٹ کر پیار آ رہا تھا۔ وہ مصلیٰ بچھا کر سیدھی ہوئی تو بڑی اماں برداشت نہ کر پائیں۔ بے اختیار اسے گلے لگا لیا۔ چند لمحوں تک تو وہ سمجھ نہیں پائی' اک ٹک ان کی طرف دیکھتی پلکیں جھپکتی رہی پھر پشیمان سی ہو کر الگ ہو گئی اور آنکھوں میں امنڈتے آنسوؤں کو سنبھالتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس کیلئے یہ کتنا انوکھا تھا۔ اتنا عجیب و غریب کہ وہ خوفزدہ سی ہو گئی تھی۔ بچپن سے اب تک اس نے ایسے والہانہ پیار کا مزہ کہاں چکھا تھا۔ محسن بھائی کئی بار اسے پیار کرتے تھے۔ گود میں لے لیتے تھے لیکن کمسنی کے اس دور میں اسے یہ سب کبھی عجیب

معلوم نہیں ہوا تھا۔ محسن بھائی کو تو وہ اپنا سمجھتی تھی۔ لیکن بڑی اماں کے عتاب کا نشانہ وہ اکثر و بیشتر بنتی تھی۔ جن کی طرف دیکھتے ہوئے بھی اسے خوف آتا تھا۔ آج اچانک انہوں نے اسے محبت سے گلے لگا لیا تھا تو اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اگلے ہی لمحے وہ پاگل سی ہو جائے گی۔

بڑی اماں کو الگ تھلگ بے بس مجبور سا دیکھتی تو اس کا جی چاہتا وہ پھر پہلے سی بڑی اماں بن جائیں۔ ویسا ہی دبدبہ' وہی رعب داب لیکن اب وہ دن بدن بڑھتے ضعف کی اسیر تھیں۔ انسان کے بدن میں زور نہ رہے تو اس کا لہجہ ازخود کمزور پڑ جاتا ہے۔ اپنی مجبوری خاموش رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ اپنے آزار ہی پیچھا نہ چھوڑیں تو انسان دوسروں کیلئے آزار بن جاتا ہے۔ تمت ان کی کسمپری دیکھ کر خود ہی ان کے سارے کام کر دیتی ورنہ انہیں گھنٹہ بھر چیخنا پڑتا تب کہیں انجم یا نازی اپنے کمروں سے نکلتی تھیں اور گڑیا تو سامنے دندناتی پھرتی تھی لیکن ان کی آواز پر پلٹ کر بھی نہیں دیکھتی تھی۔

تمت نے جب سے اصغری خالہ کو اماں بی سے کہتے سنا تھا۔ ''بڑی اماں کے بھی اب دن تھوڑے ہی ہیں بس چل چلاؤ ہی سمجھو۔'' تو وہ کتنی سہم گئی تھی۔ اسے نیرو آپا کی شدت سے یاد آتی تھیں۔ وقت کے ساتھ سب انہیں کتنی جلدی بھول گئے تھے۔ منظر بھائی' رانی آپا کے ساتھ خوش تھے جیسے نیرو آپا ان کی زندگی میں کبھی آئی ہی نہیں تھیں لیکن اسے شہزادیوں جیسے وقار والی نیرو آپا کتنی یاد آتی تھیں جو ہر وقت خاموش خاموش رہتی تھیں لیکن یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ساری فضا تکلم سے بھر گئی ہے۔

یہاں کوئی کسی کو یاد نہیں کرتا تھا۔ اسے تو محسن بھائی بھی اس شدت سے یاد تھے کہ وہ رو پڑتی لیکن سب گھر والے کہیں بھول کر بھی ان کا نام نہیں لیتے تھے لیکن اسے تو اب بھی محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس پر جھکے اس کے بال سنوار رہے ہیں۔ اس کے آنسو پونچھ رہے ہیں۔ اسے پیار کر رہے ہیں تو وہ حیران ہو کر آنکھیں کھول دیتی اور اداسی سے سوچتی۔ ''پتہ نہیں وہ بھی مجھے یاد کرتے ہیں کہ بھول گئے ہیں اور میں ہوں بھی کونسا یاد رکھنے کی چیز سب سے بری' سب سے نالائق' اتنی بدصورت۔''

''میں شاید دنیا میں اسی لئے آیا تھا کہ تنہائی کا زہر پیوں۔ نفرت کے تیر

سہوں اور پیار کے امرت کی بوند بوند کو ترستا جان دے دوں۔ میں راہ میں پڑا ہوا ایک ایسا پتھر ہوں جسے ہر ایک ٹھوکر لگا کر گزرتا ہے۔ اس کراہت آمیز زندگی سے تو بہتر تھا کہ مجھے پیدا ہی نہ کیا جاتا۔ نہ جانے اس میں خدا کی کون سی مصلحت ہے۔''

ہائے محسن بھائی آپ کتنے دکھی ہیں۔ تمت نے ڈائری کے کئی ورق الٹ دیئے جب محسن بھائی کے کمرے کی چیزیں الٹ پلٹ کر اسے سٹور روم بنایا گیا تھا تو اس نے ردی کاغذوں کی ٹوکری میں یہ ڈائری پڑی دیکھی تھی تو جھٹ اٹھا کر اپنے فراک میں چھپا لی تھی۔ تب سے اب تک کئی بار وہ اسے پڑھ چکی تھی۔ اس وقت بچی تھی اس لئے کچھ سمجھ نہیں پائی تھی لیکن جیسے جیسے شعور کی منزل میں داخل ہوتی گئی تھی اسے ڈائری کے ایک ایک حرف میں محسن بھائی کا اداس چہرہ نظر آنے لگا تھا۔ اس گھر نے انہیں کتنے دکھ دیئے تھے۔ وہ پشیمان ہو کر سوچتی۔

''ماں کا لفظ کہہ دینا کتنا سہل ہے لیکن اسے پا لینا کتنا دشوار ہے۔ ماں کے لفظ میں پیار کا امرت چھلکتا ہے لیکن وہ دوسروں کو اس میں سے ایک بوند بھی نہیں دیتی۔ وہ اپنے دل کے ٹکڑوں کو ممتا کی پھوار سے سیراب کرتی ہے لیکن دوسروں کے لخت جگر کو پیاسا دیکھ کر اسے کیونکر قرار آتا ہے۔ اگر مائیں' اپنی پناہ میں آنے والے دوسروں کے بچوں کو پیار نہیں دے سکتیں تو خدایا! ان سے ممتا کا خزانہ چھین لے' ان کے پیروں تلے کی جنت کو دوزخ سے بدل دے۔''

اگلا صفحہ پڑھ کر اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ محسن بھائی۔ یہاں مائیں بھی ممتا بانٹنے سے پہلے صورت دیکھتی ہیں۔'' آگے کے کچھ خالی صفحے پلٹ کر اس نے ایک صفحے پر نگاہ ڈالی۔

''تمو بے چاری بیکل روح' کتنی معصوم ہے' سہمی ہوئی سی' بے ضرر سی بھولی بھالی لڑکی کو بھی میری ہی طرح انجانے جرم کی سزا مل رہی ہے۔ تقدیر نے مجھ سے والدین کا سایہ چھین لیا تو اس میں میرا کیا قصور اور تمت معمولی شکل و صورت لے کر پیدا ہوئی تو یہ اس کا ناقابل معافی جرم بن گیا۔ وہ بھی میری طرح پیار کو ترسی ہوئی سی روح ہے۔ میں تو ممتا بھری گود ڈھونڈوں بھی تو نہیں پا سکتا اور وہ ماں کو پا کر بھی اس کی ممتا سے محروم ہے۔''

تمت نے عجلت میں صفحہ پلٹ دیا جیسے کوئی بے حد بدصورت شخص اچانک آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر اپنی بدصورتی سے خائف ہو کر اسے توڑ ڈالے۔ اپنی محرومیوں کی یہ داستان اس کیلئے نئی نہ تھی لیکن اس کا بار بار سننا اس کے بس میں نہیں تھا۔

ورق گردانی کرتے ہوئے وہ اک صفحے پر پھر رک گئی۔

''شبو آج میرے کتنا قریب تھی۔ اس کا یہ شرمیلا سا روپ کتنا پیارا ہے۔ میری زندگی جو مسرتوں سے یکسر خالی ہے اس میں ننھی سی مسرت کی یہ کرن بھی کتنی سہانی معلوم ہوتی ہے۔ میں اتنی ڈھیر خوشیوں کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں مقدر کی ظلمتوں میں اسیر ہوں۔ میں نور کی تمنا نہیں کر سکتا۔''

تمت چونک سی گئی۔ تو شبو آپا؟؟؟ وہ جلدی جلدی صفحے پلٹ الٹ کر پڑھنے لگی اور پھر اگلے صفحے احتیاط سے دیکھنے لگی۔

''میری زندگی تو محبت سے ناآشنا رہی ہے۔ میرے حصے میں تو ماں کا پیار بھی نہیں آیا۔ جو کس آسانی سے دوسروں کا مقدر بنتا ہے۔ تو میں کسی اور محبت کی تمنا کیوں کروں۔ آج شبو کے لہجے میں اک ترحم جھلکتا تھا۔ اکھڑی شبو آج کتنی ہمدرد نظر آتی تھی۔ شاید اسے مجھ پر ترس آتا ہے لیکن مجھے اس کے رحم کی ضرورت نہیں دل بھی تو کتنا نادان ہے۔ ہمیشہ اس چیز کی تمنا کرتا ہے جس کو اپنا لینے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے خرم کی آنکھوں میں اک انوکھی چمک دیکھی ہے۔ خرم نہیں تو کوئی اور کسی نہ کسی کو تو میرے راستے میں آنا ہے۔ ہاں سب کو مجھ سے آگے نکل جانا چاہئے۔ میں لنگڑاتا ہوا کب تک کسی کا پیچھا کر سکتا ہوں۔''

اگلی تاریخوں میں لکھا تھا۔ ''شبو کو ممانی کی باتوں پر بڑی پریشانی ہو رہی تھی۔ اسے میری حالت پر رحم آ رہا تھا۔ وہ دل میں تو اس کو تسلیم کرتی تھی لیکن ممانی بیگم کے یوں صاف کہہ دینے پر بہت شرمندہ ہو رہی تھی۔ اس کی ایک پل کی یہ پشیمانی کل خوشیوں میں بدل جائے گی۔ ہاں اس جیسی لڑکی کو خوشیوں کے بیچ سرشار ہی رہنا چاہئے۔ مجھ جیسے سیاہ بخت کو اس کا خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہئے۔ میرا وجود اس گھر پر بوجھ بنتا جا رہا ہے۔ مجھے ان کی زندگی سے چپ چاپ نکل جانا چاہئے لیکن

تمو...... اس کی محبت میرا دامن پکڑتی ہے میرے بعد وہ شاید پیار کے اک بول کو بھی ترس جائے گی۔ وہ معصوم بھولی بھالی بچی اک پیاری یاد بن کر ہمیشہ میرے ساتھ رہے گی۔''

☆......☆......☆

تمت کی آنکھیں یوں چھلک اٹھیں جیسے اچانک پانی کا بند ٹوٹ گیا ہو اور بے قابو پانی بہا چلا آتا ہو۔ اس کا دل کٹ کٹ کر آنکھوں کے راستے بہا چلا آتا تھا۔ محسن بھائی اسے ٹوٹ کر یاد آئے تھے۔ ان کا مہربان چہرہ اس کی آنسوؤں سے چھلکتی آنکھوں میں جھلک جھلک جاتا تھا۔ محسن بھائی جن کی شفقت نے اسے پیار کا مفہوم سکھایا تھا ورنہ وہ اب تک اس سے ناآشنا ہی رہتی۔

کتنے دکھی تھے محسن بھائی' شبو آپا کو کیا معلوم کہ ان کی شبیہ کسی کی آنکھوں میں بستی ہے۔ ان کا نام کسی کے دل کی دھڑکن ہے۔ محسن بھائی سب میں رہتے ہوئے بھی کتنے تنہا تھے۔ اپنوں میں رہتے ہوئے وہ کتنے بیگانے تھے۔''

شبو آپا تو خرم بھائی کے ساتھ کتنی خوش و خرم ہیں اور محسن بھائی نہ جانے اپنے دکھوں کے ساتھ کہاں ہیں۔ کتنے اداس ہیں۔ اس کے دل میں اک ہوک سی اٹھتی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ دنیا بھر کی خوشیاں محسن بھائی کی جھولی میں بھر دے لیکن محسن بھائی کو کہاں پائے؟''

کالج میں اب اس کا دل لگتا تھا۔ وہ توجہ اور اطمینان سے پڑھنے لگی تھی۔ یہاں اس کے ساتھ گڑیا تو نہیں تھی تو جیسے بڑا بوجھ اس کے ذہن سے ہٹ گیا تھا۔ ورنہ گڑیا کے ساتھ ہر وقت کے موازنے نے اسے توڑ پھوڑ دیا تھا۔ وہ اس طرح مضمحل سی رہتی جیسے بیمار ہو۔ کوئی فکر اسے اندر ہی اندر پریشان کیے دیتی ہو۔ وہ ہر وقت گڑیا کی برتری تسلیم کرنے پر آمادہ رہتی تھی۔ ہر اچھائی گڑیا سے منسوب تھی اور ہر برائی اسی سے سرزد ہوتی تھی۔

جتنی دیر وہ کالج میں ہوتی تو گڑیا کی برتری کے حصار سے آزاد رہتی۔ اسی لئے آسودگی سے خود میں مگن رہتی۔ اکثر پریکٹیکل دیر میں ختم ہوتے تو وہ تین چار بجے تک گھر پہنچتی۔ گرمیوں میں جب سب ٹھنڈے کمروں میں آرام کی نیند سو رہے ہوتے

تو وہ بسوں میں دھکے کھاتی پھرتی۔ دھوپ سے اس کا سانولا رنگ اور بھی سنولا جاتا۔ پسینہ پونچھتی وہ بمشکل بس سے اترتی۔ تیز دھوپ میں سٹاپ سے گھر تک تھوڑا سا پیدل چلنا بھی قیامت ہو جاتا۔

کھچا کھچ بھری بس میں سے وہ بڑی مشکل سے نیچے اتری اور گھر کی سمت تیز تیز چل پڑی کہ سامنے سے آتا ہوا اک راہگیر اس کے قریب آ کر رک گیا اور بڑی شستگی سے بولا۔ ''محترمہ معاف کیجئے صمدانی صاحب کیا پندرہ اے میں رہتے ہیں؟''

تمت ایک دم ہی تھم گئی۔ پشیمان سا ہو کر اس نے اک بار راہگیر کی طرف دیکھا جس نے سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا اور بڑا سنجیدہ سا معلوم ہوتا تھا۔ اسے کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا تھا کہ اس سے کوئی کچھ پوچھے۔ کچھ مشورہ لے۔ اسی لئے تو وہ گھبرا سی گئی۔ مرعوب سی ہو کر اس نے سہم کر اثبات میں سر ہلا دیا اور جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ دل میں پشیمان بھی ہوئی کہ ان کے گھر کا نمبر یہ تو نہیں تھا لیکن کسی کو ٹوک دینے' کسی کی بات درست کر دینے کی نہ اسے عادت تھی نہ ہی جرأت۔ اسی لئے تو وہ اتنا بھی نہیں کہہ سکی کہ وہ گھر کا نمبر غلط بتا رہا ہے اس میں تو اتنا اعتماد بھی نہیں تھا کہ سلیقے سے کسی سے بات ہی کر لے۔

گھر آ کر بھی وہ خاصی پریشان رہی لیکن جلد ہی اس بات کو بھول گئی۔ ''ظاہر ہے کوئی ابا کا ملنے والا تھا یہاں نہ آیا تو آفس میں مل لے گا۔'' یہ سوچ کر اس نے خود کو تسلی دے دی کہ یونہی ڈرنے یا خوف کھانے کی ضرورت نہیں۔

شام کی چائے پر اصغری خالہ اور عمران بھیا آئے ہوئے تھے۔ خوب دھوم مچ رہی تھی۔ قہقہے' باتیں' شرارتیں اور چہلیں' محفل گرم تھی اور تمت بڑی اماں کے کمرے میں بیٹھی انہیں مالش کر رہی تھی۔ جوڑوں کا درد اب جیسے گٹھیا میں تبدیل ہو رہا تھا۔ انہیں اب اکثر تکلیف رہنے لگی تھی لیکن سب اپنے آپ میں اس قدر مگن تھے کہ ڈاکٹر کی ہدایت پر کسی کو ان کی مالش کرنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ تمت ہی کو فرصت ملتی تو ان کے پاس آ بیٹھتی تھی۔

اب بھی سب محفل جمائے بیٹھے تھے اور وہ تنہا بڑی اماں کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ بڑی اماں نے اس کے زرد چہرے کی طرف دیکھا اور بولیں۔ ''تمو بیٹا خیال رکھا

کر اپنا۔ اتنا سا منہ نکل آیا ہے۔''

وہ صرف مسکرا دی کہا کچھ نہیں۔ کچھ دیر وہ خاموشی سے لیٹی رہیں پھر جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہوئیں۔ ''تمو ہی بیٹا بن گئی ہوتی۔'' پر اس گھر کی قسمت میں لڑکے کی صورت دیکھنا تو لکھا ہی نہیں ہوا۔''

اور تمت گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے سوچتی رہی کہ بیٹا۔ شاید زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ مجبور و بے بس لڑکیوں کے مقابلے میں خودمختار مرد واقعی بہتر ہے۔ ہم لڑکیاں کتنی کمتر مخلوق ہیں کہ جس کو دیکھو اسے ہی بیٹے کی خواہش ہے کوئی مانگ کر بیٹی نہیں لیتا۔''

''بڑی اماں سلام۔'' کسی نے زور سے کہا تو بڑی اماں نے پلٹ کر دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے آنکھیں پٹپٹانے لگیں۔ تمت نے گھٹنوں سے ٹھوڑی اٹھائی سامنے دیکھا اور پہچان گئی۔ آنے والے نے بھی اک نظر اس کی طرف دیکھا اور شناسائی کی چمک اس کی آنکھوں میں بھی لپکی۔ اس کے پیچھے ہی گڑیا' نازی اور انجم ایک دوسرے کو دھکیلتی چلی آئی تھیں اور ان کے پیچھے اصغری خالہ' عمران بھائی کے ساتھ خراماں خراماں چلی آ رہی تھیں۔ بڑی اماں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ اس نے جھک کر ان کے سر پر پیار لیا لیکن بینائی کمزور ہو جانے کے باعث وہ پہچان نہیں رہی تھیں کہ وہ کون ہے؟ اصغری خالہ نے مدد کی۔

''بڑی اماں یہ اپنا جواد ہے نا۔ روشن آپا کا لڑکا۔''

روشن آپا کا نام کیا آیا کہ بڑی اماں اس پر نچھاور ہونے لگیں۔ چپ چپ اس کی بلائیں لے ڈالیں۔ کبھی ہاتھ میں لے کر اس کا چہرہ دیکھتیں اور جلدی جلدی کوئی سوال پوچھنے لگتیں۔ وہ یونہی جھینپا سا کھڑا ان کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا اور باقی سب اس کی ایسی شاندار تواضع سے بہت محظوظ ہو رہے تھے۔

بڑی اماں سے کہیں اس کی نجات ہوئی تو وہ تمت کی طرف متوجہ ہوا جو بڑے اشتیاق سے سب کی باتیں سن رہی تھی۔

''آپ کی تعریف؟'' سب کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ گھبرا سی گئی۔ گڑیا تمسخر سے ہنس دی۔ ''ان کی تعریف کرنے کی کوشش بھی کی جائے تو نہیں ہو سکتی۔''

انجم اور نازی نے فرمائشی قہقہہ لگایا لیکن وہ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوا اور بولا۔ ''آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔''

تمت جو پہلے ہی گھبرائی ہوئی تھی اب اور بھی سہم گئی۔ کچھ کہہ نہیں پائی تھی۔ کہ گڑیا پھر چہکی۔ ''خواب میں دیکھا ہوگا اور ڈر گئے ہوں گے نا۔''

''کیوں؟ ڈرنے کی کیا بات ہے؟'' وہ حیران ہوا بڑی اماں نے تعارف کرایا۔ ''یہ تمت ہے نا۔ گڑیا سے بڑی ہے۔'' سب کی نگاہوں کا سامنا کرتے ہوئے وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''جی اچھا۔'' اس نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور خود تمت بھی حیران رہ گئی کہ اس نے حیرت کا اظہار کیوں نہیں کیا تھا۔ جو ہر ملنے والا انہیں پہلی بار دیکھ کر ضرور کرتا تھا۔ گڑیا بھی اپنی متوقع تعریف کیلئے بالکل تیار تھی لیکن اسے بھی مایوس ہو جانا پڑا۔ وہ کچھ دیر بیٹھا باتیں کرتا رہا لیکن تمت موقع دیکھ کر چپکے سے کھسک آئی۔

اسے ہجوم سے اور بھی وحشت ہوتی تھی۔ جہاں اسے اپنا آپ بہت کمتر معلوم ہونے لگتا تھا اور اس خیال سے اس کی جان نکلی جاتی تھی کہ اگر اس نے اماں بی کو بتا دیا کہ تمت نے اسے غلط راستہ بتایا تھا تو جھڑکیاں پڑنی لازمی تھیں۔ کہ وہ تو ہے ہی سدا کی نکمی، نالائق، کوئی بات بھی تو سیدھی طرح اسے کرنی آتی نہیں۔

جب تک وہ چلا نہیں گیا وہ گھبراتی رہی، پریشان ہوتی رہی۔

☆ ☆ ☆

چمن میں وہ اپنے مخصوص گوشے میں بیٹھی بڑی توجہ سے پڑھ رہی تھی کہ دھیمی دھیمی سرگوشیوں سے چونک گئی۔ ادھر ادھر دیکھا انار کے پودوں کے اس طرف شاید کوئی تھا۔

''انجو ....'' کوئی پکارا تو وہ آواز پہچان گئی۔ یہ تو عمران بھائی کی آواز آئی۔

''انجو جب پہلی بار میں نے تمہیں دیکھا تو حیران رہ گیا۔ میں نے ذہن میں جو خیالی تصور بنا رکھا تھا تم بالکل ویسی ہی ہو۔'' انجم آپا کے جواب کے انتظار میں وہ کچھ دیر خاموش رہے اور پھر بولے۔ ''امی تو مجھے اکثر کہتی تھیں کہ تمہاری پسند کی لڑکی کیا آسمان سے اترے گی وہ تو منصورہ سے میری منگنی تک کر لینے کو تیار ہو گئی تھیں۔''

''تو پھر کروا لی ہوتی۔'' اس بار انجم آپا کی آواز صاف آئی تو عمران بھائی ہنس پڑے۔ ''انجو اتنی دیر سے جو خاموش ہو تو اب کس طرح سے زبان کھل گئی۔''

انجم آپا نے سرگوشی میں نہ جانے کیا کہا کہ تمت سمجھ نہیں سکی پھر عمران بھیا بھی بولے۔ ''ارے نہیں منصورہ بھی کوئی ایسی چیز ہے کہ اس کے ساتھ منگنی کرائی جائے۔ ارے بابا تم اگر مجھے نہ ملتیں تو اپنے آئیڈیل کی جستجو میں شاید ساری زندگی گزار دیتا۔'' انجم آپا کی کھنکتی ہوئی ہنسی کی رکی رکی سی آواز آئی۔

عمران بھائی کہتے رہے۔ ''انجو مجھے زندگی کی ہر خوبصورتی سے پیار ہے، چاندنی سے، شبنم سے، پھولوں اور خوشبو سے۔ زندگی کی ہر پیاری چیز سے مجھے محبت ہے اور زندگی کی ہر خوبصورتی اب تو معلوم ہوتا ہے تمہارے دم سے ہے۔''

اسی لمحے تمت کو محسوس ہوا جیسے وہ دنیا کی حقیر ترین مخلوق ہے۔ جب زندگی کا نام بھی خوبصورتی ہے تو اس میں بدصورتی کی جگہ کہاں ہوگی۔ اس کا جی چاہا کہ یہاں بیٹھی بیٹھی پگھل کر ختم ہو جائے۔ اس طرح اس کی بدصورتی کسی کو نظر نہ آئے۔ انجم آپا

کی سریلی ہنسی کی آواز آئی تو وہ چونکی عمران بھائی کہہ رہے تھے۔ "انجو میں امی سے کہہ دوں گا کہ بہت جلد اماں بی سے بات کر لیں۔" انجم آپا اس کے جواب میں خاموش رہیں۔ یا تمت نہیں سن سکی کہ انہوں نے کیا کہا پھر اس نے خشک گھاس اور پتوں پر جاتے ہوئے قدموں کی چاپ سنی۔ وہ ایک دم ہی خوش ہو گئی۔ وہ یونہی ذرا ذرا سی بات پر کتنی خوش ہو جاتی تھی۔ انجم آپا دلہن بنیں گی تو کتنی اچھی لگیں گی۔ دونوں کی جوڑی خوب رہے گی۔

گھر میں بھی کچھ ایسی ہی کھچڑی پک رہی تھی لیکن اسے کیا خبر ہوتی کوئی بات اس سے براہ راست تو کی نہیں جاتی تھی۔ نہ ہی کوئی اس کی ضرورت سمجھتا۔ اماں بی اور ابا میں مشورے ہوتے، کبھی کبھی بڑی اماں بھی شریک ہو جاتیں۔ عمران بھائی کا بھی آنا جانا پہلے کی نسبت کم ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی رانی اور شبو بھی آ جاتیں تو سب کی سب بیٹھی آپس میں چپکے چپکے نہ جانے کون کون سی باتیں کرتی رہتیں۔ تمت کو حسرت ہی رہی کہ کبھی ان کی باتوں میں وہ بھی شریک ہو جائے۔ ان کی طرح ہنسے، قہقہے لگائے، چہلیں کرے لیکن کبھی کسی کو بھولے سے بھی خیال نہیں آیا تھا کہ وہ بھی اسی گھر کی باسی ہے۔ اس سے بھی ان کا کچھ رشتہ ہے۔ سب سے الگ تھلگ وہ کتابوں میں مگن رہتی۔ نہیں تو باورچی خانے میں گلاں کے ساتھ مصروف ہوتی۔ سب کے کپڑے استری کر دیتی یا چمن میں کسی درخت سے ٹیک لگائے نہ جانے کیا کچھ سوچتی رہتی۔

اتنے دنوں کے خفیہ گٹھ جوڑ آخر رنگ لائے۔ انجم آپا کی منگنی کی تاریخ طے پا گئی۔ اصغری خالہ کا اصرار تھا کہ ان کے اکلوتے بیٹے کی منگنی بڑی دھوم دھام سے ہو گی۔ اماں بی کا معاملہ تھا۔ اتنے دنوں راہ دیکھی تھی تو کہیں رشتہ ہاتھ لگا تھا۔ اب کسی معمولی بات کو بڑھا کر وہ اسے ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتی تھیں۔ اسی لئے ان کی ہر شرط مانے جاتی تھیں۔

تمت کیلئے یہ دھوم دھام بہت انوکھی تھی۔ گھر میں کبھی اتنا بڑا ہنگامہ نہیں ہوا تھا۔ بہت سے مہمان آئے تھے۔ ہر طرف رنگوں کی سج دھج اور زیبائش کی چکا چوند تھی۔ ایسے بلا کے ہجوم میں تمت کا دم گھٹ گھٹ جاتا تھا۔ اسے لوگوں سے وحشت سی ہوتی تھی۔ یوں ہی معلوم ہوتا تھا جیسے سب آنکھیں اس کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ سب

اس کی طرف متوجہ ہیں۔ ابھی کوئی کہہ دے گا کہ وہ کتنی بدصورت ہے، ابھی اس سے کوئی کام غلط ہو جائے گا اور کوئی نہ کوئی اسے ڈانٹے گا۔

گڑیا سے زیادہ وہ گھر بار کے کام کرتی تھی۔ سب کے بگاڑے کام خاموشی سے وہی سنوارتی۔ آج بھی اس نے برتنوں کا انتظام دیکھا بھالا، صفائی کروائی، مہمانوں کے بیٹھنے کیلئے جگہ ٹھیک کروائی، کچھ دور سے آنے والے رشتہ دار جو یہاں ٹھہرے ہوئے تھے ان کے بدتمیز بچوں نے الگ ہڑبونگ مچا رکھی تھی۔

اماں بی مہمانوں کے بیٹھنے کی جگہ دیکھنے آئیں تو قالین کے الٹے ہوئے کنارے سے ٹھوکر کھا گئیں۔ شامت تمت کی ہی آئی۔ "مجال ہے جو یہ لڑکی کبھی ڈھنگ کا کام کر جائے۔ یہاں صفائی کروائی تو پھوٹی آنکھوں سے، کوئی مہمان ہی گر پڑتا تو۔"

اور تمت جو تھکی ہاری ابھی ابھی صوفے پر بیٹھی تھی جلدی سے اٹھ گئی۔ جتنی دیر اماں بی بکتی جھکتی رہیں وہ سہمی سہمی کھڑی رہی۔ بڑی مشکل سے آنسو روکتی اپنے کمرے میں آ تو گئی لیکن دل جیسے اندر ہی اندر کٹا جاتا تھا۔ آنکھوں میں اب بھی آنسو امنڈتے آتے تھے۔ وہ جلدی سے غسل خانے میں گھس گئی کہ کسی نے دیکھ لیا تو شامت آئے گی کہ یہ کون سا موقع ہے رونے کا۔

تمت نے اپنے ہلکے گلابی رنگ کے کپڑے پہن تو لئے تھے لیکن باہر جانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ سب مہمانوں کی سج دھج دیکھنے کے قابل تھی۔ رنگ و روپ کے اس میلے میں وہ تہی داماں کی طرح بلا جھجک چل دیتی اور اس کی پروا بھی کسے تھی۔ ہاں کام دھندا دیکھنے اور نوکروں کی نگرانی وغیرہ کرنے میں اس کی ضرورت رہتی تھی۔ اماں بی باہر سے گزریں تو اسے آواز دیتی گئیں۔

"تمو تیار ہو چکی ہو تو گلاں کے ساتھ مل کر ذرا اسکوائش مہمانوں کو بھجوا دو۔"

اور وہ جو تذبذب میں کھڑی تھی کہ باہر جائے کہ نہ جائے، جلدی سے باہر لپکی۔

سب لوگ کتنے مسرور تھے۔ ہنستے، کھیلتے، قہقہے لگاتے، مسکراتے جیسے جنت کا کوئی چھوٹا سا قطعہ زمین پر اتر آیا ہو۔ جہاں سب لوگ بے فکری سے خوش گپیوں میں مصروف ہیں کسی کے پاس کوئی غم نہیں۔ کسی کو کوئی دکھ نہیں، اس نے یوں ہی جھانکا تو

عمران بھائی نے دیکھ لیا۔

دور ہی سے پکارے۔ "تمت بیگم آ جاؤ بھئی۔"

تمت ٹھٹکی، کچھ جھجکی اور سمٹی سمٹی سی ان کے قریب آ ئی۔ ہلکے گلابی کپڑوں میں معمول سے اچھی لگ رہی تھی۔ گڑیا شوخ فیروزی رنگ میں بے حد خوبصورت لگ رہی تھی اس کے سونے کے تاروں ایسے بال اور دلکش نیلی آنکھیں اس کے حسین چہرے کو لاکھ لاکھ بناؤ دیتے تھے۔ تمت کو بھی وہ بہت پیاری لگی۔ نازی اور شبو آپا بھی نک سک سے درست قریب ہی کھڑی تھیں۔

"واہ واہ۔" عمران بھائی نے کہا۔ "آج تو تمت بہت اچھی لگ رہی ہے۔"

تمت نے جھینپ کر ان کی طرف دیکھا۔ اک شرمیلی سی چمک اس کے چہرے پہ یوں بکھر گئی جیسے کسی دلہن کا گھونگھٹ انجانے میں کسی نے الٹ دیا ہو۔ دھیرے سے بدبدائی۔ "شکریہ۔"

گڑیا کی دبی دبی سی ہنسی ابھر رہی تھی۔ عمران بھائی نے بے حد سنجیدہ ہو کر کہا۔

"ارے یہ تو ہماری ذرہ نوازی ہے ورنہ تم کس قابل ہو۔"

نازی اور شبو آپا اک چھناکے سے ہنس پڑیں۔ تمت خفیف سی ہو کر سوچتی رہ گئی کہ اس نے کیا کہا ہے۔ گڑیا اٹھلائی۔ "بھئی عمران بھائی، بہت سخی ہیں آپ تو۔"

"کیوں؟؟؟" وہ جان بوجھ کر سوالیہ نشان بن گیا۔

"ایسی فراخدالی سے تو کوئی کوئی ہی تعریف کر سکتا ہے۔"

"جی ہاں!! کبھی کبھی دل رکھنے کو، اپنے ذوق کو بھی امتحان میں ڈالنا پڑتا ہے۔" عمران بھائی نے کسی بہت بڑے فلسفی کی طرح کہا۔ نزدیک کھڑی دوسری لڑکیاں ان کی نوک جھونک سے اسی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ کچھ لڑکیاں سرگوشی میں ایک دوسری سے پوچھ رہی تھیں کہ وہ کون ہے؟ کسی نے بتایا کہ وہ گڑیا جیسی حسین و جمیل لڑکی کی سگی بہن ہے تو چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ یہیں کھڑی کھڑی زمین میں سما جائے تا کہ اس دنیا کی نگاہوں کے سامنے پھر کبھی نہ آنے پائے۔

ندامت اور اندرونی دکھ سے اس کا سانولا چہرہ اور بھی سنولا گیا۔ اضطراری کیفیت میں وہ ہونٹ کاٹتی ہوئی مڑی اور باہر نکل گئی لیکن وہ کھنکتی ہوئی ہنسی اسے اب بھی اپنا پیچھا کرتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ تیز بھاگتی ہوئی دور بہت دور چلی جائے۔ جہاں گڑیا اور عمران بھائی جیسے خوبصورت لوگ نہ ہوں جو اس کی بدصورتی کو اس کا مذاق اڑانے کا بہانہ بنا لیں۔ آنسو اس کی آنکھوں سے چھلک پڑنے کو بیتاب تھے کہ سامنے سے آتی ہوئی اماں بی کی ڈانٹ سے سہم کر وہ خودبخود خشک ہو گئے۔

"تمو میں نے تجھ سے کہا تھا کہ سب کو اسکوائش دے لیکن تو سنتی کہاں ہے۔ کبھی تو کام ڈھنگ کا کر لیا کر۔"

اثبات میں سر ہلاتی ہوئی وہ پینٹری تک آ گئی۔ گلاں پہلے ہی بکتی جھکتی اسکوائش بنا رہی تھی۔ تمت نے جلدی جلدی گلاس نکلوائے۔ انہیں ٹرے میں جمایا اور چھوٹے ملازم لڑکوں کو انہیں لے جانے کو کہا۔ گلاں اس کا دم غنیمت جان کر کسی اور دھندے میں مصروف ہو گئی اور تمت مہمانوں کی خاطر داری میں لگی رہی۔ وہ خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنا چاہتی تھی۔ تا کہ لوگوں کی نگاہوں سے بچی رہے۔ کافی دیر کچن میں بیٹھی رہی وہ کسی کے سامنے نہیں جانا چاہتی تھی۔ کچھ سوچتی ہوئی سی وہ پینٹری سے باہر نکلی۔ اس کے کچھ بکھرے سے بال، پیشانی پہ چمکتی پسینے کی بوندیں اور ڈھلکا ہوا آنچل جو زمین سے چھوتا آ رہا تھا اس کے قلبی خلجان کا پتہ دیتے تھے کہ سامنے سے کسی آنے والے نے کہا۔

"سنئے۔"

"جی....." وہ اپنے خیالوں میں گم تھی لرز سی گئی۔ ایک بار پلکیں جھپک کر سامنے دیکھا وہ جواد تھا۔ ہاں سب اسے جواد ہی تو کہتے تھے۔

"ایکسکیوزمی۔ اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ ہی تمت ہیں۔" بے انتہا شستہ لہجے میں اس نے سنجیدگی سے کہا تو تمت نے جو اس اچانک سامنے آنے سے پشیمان سی ہو گئی تھی اثبات میں گردن کو جنبش دی۔ "بڑی اماں نے آپ کو بلایا ہے۔ میں برآمدے سے گزر رہا تھا تو انہوں نے کہا کہ آپ کو بھیج دوں۔" تمت نے کچھ نہیں کہا

اور بڑی اماں کے کمرے کی طرف ہو لی لیکن یہ دیکھ کر گھبرا گئی کہ جواد بھی اس کے ہمراہ تھا۔ ''میں بھی آپ ہی کو تلاش کرتا ہوا آ رہا تھا کہ بڑی اماں نے بھی آپ کو بلانے کا کہہ دیا۔''

''جی۔'' وہ سہم سی گئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ کوئی کام بگاڑ آئی ہے اور وہ اسے سزا دینے کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔

''آپ پریشان کیوں ہوئیں۔'' جواد نے اس کے ہراساں چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ صرف ایک بار اس کی دیکھ کر رہ گئی کچھ کہہ نہیں سکی اور تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔

''ہوں!!! ہوں۔'' اس نے بھی رفتار تیز کی۔ ''بھاگی کیوں جاتی ہیں مجھے بھی آپ سے ایک بات کرنا ہے۔'' اس نے ہولے سے اس کے شانے کو چھوا تو تمت نے دوپٹہ دانتوں تلے دبا لیا اور خوفزدہ سی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

''آپ اتنی خوفزدہ کیوں ہیں؟'' اس نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ تمت باوجود کوشش کے بھی اس سے کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کس طرح جان چھڑائے۔

''ایک لمحے کو آپ رکیں تو میں اک بات کر لوں۔'' وہ پشیمان سی ہو کر رک گئی اور لرزتی ہوئی بولی۔ ''کیا بات ہے؟'' اس کے سنجیدہ چہرے پر اک لمحے کو مسکراہٹ آئی اور گزر گئی۔ ''اطمینان رکھئے اتنی بڑی بات نہیں جتنی آپ پریشان ہو گئیں۔''

تمت الجھ سی گئی۔ سر جھکا کر ہولے ہولے چل پڑی۔

''ہاں تو مجھے آپ سے یہ کہنا تھا۔'' اس نے بات شروع کی کہ ''جواد بھائی'' پیچھے سے گڑیا کی کھنکتی ہوئی آواز آئی۔ دونوں نے مڑ کر دیکھا۔

''آپ کہاں غائب ہیں جناب۔'' وہ قریب چلی آئی۔ جواد رک گیا۔

''کیوں جناب!!!'' اس نے بھی ہوبہو اس کے لہجے کی نقل اتاری۔''

''تمت گھبرا سی گئی چپ چاپ بڑی اماں کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

''کوئی یہاں اچھی سی لڑکی ہے جو ہمیں چائے پلا دے۔''

عمران بھائی نے ہانک لگائی جن پر اب کبھی کبھی آنے کی شرط عائد کی گئی تھی لیکن وہ یہاں آنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ کوئی نہ کوئی بہانہ ایسا ڈھونڈ ہی نکالتے جو انہیں یہاں کا چکر لگانا پڑ جاتا اور پھر کسی نہ کسی ایسے موقع کی تاک میں رہتے کہ انجم آپا کہیں اکیلی دکیلی مل جائیں تو دل کی کوئی بات ان کے بھی گوش گزار کر دیں۔ گڑیا اور نازی بھی اکثر اس میں ان کی مدد کرتیں۔

سب نے کان لپیٹ لئے اور ان کی بات سنی ان سنی کر دی۔

''ایک کام کی لڑکی ہے تو بس تمت ہے اور تمت جو بہت دیر سے ان سب کے درمیان خاموش بیٹھی تھی غیر متوقع طور پر ہی اپنا نام سن کر چونک سی گئی۔

عمران بھائی جو کنکھیوں سے گڑیا کی طرف دیکھ رہے تھے پھر بولے۔ ''گھر بھر میں سب سے اچھی لڑکی تمت ہی تو ہے اور تم لوگ چھی چھی !!! ایک کام تو ہوتا نہیں۔ بس بیٹھی بیٹھی موٹی بھینس ہو رہی ہو۔'' عمران نے برا سا منہ بنایا تو نازی نے مصنوعی طور پر ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''اوہو عمران بھائی کیا ہو گیا آپ کے ذوق کو۔ جو بھینسوں کے باڑے کے چکر لگانے لگے۔''

''ایسی سمارٹ خواتین کے ہجوم میں بھینسوں کا ذکر۔ عمران صاحب جتنی جلدی ہو سکے کسی سیکاٹرسٹ سے کنسلٹ کیجئے۔'' جواد جو بہت دیر سے کونے کے صوفے پر بیٹھا ہوا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اک لمحے کو چہرے سے اخبار ہٹا کر اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔

لڑکیوں کو بہت لطف آیا۔ سب نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ آج واقعی ان کے ذوق پر فاتحہ ہی پڑھنا چاہئے۔ پہلے تمو کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر رہے تھے۔ اب بھینسوں پر مہربان ہیں۔''

تمت نے غیر ارادی طور پر ہی جواد کی طرف دیکھا۔ سب کے سامنے اس کا مذاق اڑانا تو معمولات میں شامل تھا لیکن جواد چونکہ نیا نیا متعارف ہوا تھا اسی لئے اس کی موجودگی میں وہ زیادہ ہی خجل ہو رہی تھی۔ لیکن وہ پھر اخبار کی طرف متوجہ تھا۔

عمران نے جلدی سے کہا۔ ''میں تو درجہ بدرجہ آگے بڑھ رہا تھا۔''

گڑیا نے محظوظ ہو کر قہقہہ لگایا۔ ''تمت پھر...... بھینس تو اب کس پر عنایت ہو گی۔''

''گھاس پر۔ ان کی عقل کو اکثر اس کی ضرورت پڑتی ہے۔'' جواد نے کہا اور پھر اخبار میں منہمک ہو گیا۔

لڑکیاں پھر ہنس پڑیں اور عمران کو تنگ کرنے لگیں۔ آج ہی تو وہ ان کے ہتھے چڑھا تھا ورنہ تو وہ ان کا ناک میں دم کئے رکھتا تھا۔ وہ بھی برابر مقابلہ کر رہا تھا لیکن جواد کی برجستہ مداخلت سے لڑکیوں کا پلہ بھاری پڑتا۔ جب وہ خاصا پریشان ہو چکا تو جواد نے کہا۔

''بھئی آپ لوگوں کی باتوں میں چائے کی بات رہی جاتی ہے۔ ہاں تو تمت بیگم اٹھ جائیے۔ سنا ہے سب میں سے کام کی لڑکی آپ ہی ہیں۔''

تمت جیسے چور سی بن گئی۔ وہ جو پہلے ہی گھبرائی جاتی تھی۔ اب اور بھی پشیمان ہوئی۔

''اٹھ جائیے کہ اب آپ کی شان میں قصیدہ کہا جائے گا۔'' اسے متذبذب دیکھ کر جواد گویا ہوا۔

گڑیا کو ہنسی چھوٹ گئی۔ '' کچھ قصیدہ عمران بھائی نے کہا اور کچھ آپ کہیں گے۔''

''تو کوئی مضائقہ نہیں ہم تو تیار بیٹھے ہیں۔'' جواد مسکرایا۔

انجم نے گھور کر تمت کی طرف دیکھا کہ وہ اٹھ کر چائے کیوں نہیں بنا لاتی۔

تمت اٹھ کر چل دی کہ عمران بولا۔ ''ہاں بھئی ضرورت کے وقت تو گدھے کو بھی......''

بات ادھوری چھوڑ کر اس نے مسکرا کر گڑیا کی طرف دیکھا جس نے ہمیشہ کی طرح قہقہہ لگا کر اس کو داد دی۔

دروازے سے باہر نکلتی ہوئی تمت نے بھی اس کی بات سن لی تھی۔ اسے سب لوگ خود پر ہنستے معلوم ہوئے ان سب کو آپس میں باتیں کرتے، ہنستے، کھیلتے دیکھ کر اس کا بھی کتنا جی چاہتا تھا کہ ان کی محفلوں میں شریک ہو جائے۔ گڑیا کی طرح جانِ محفل بن جائے لیکن اس میں بات ہی کیا تھی۔ جو جان محفل کہلاتی۔ الٹا اس کا

مذاق بن جاتا تھا۔

چائے تو اس نے بنا لی لیکن اندر جانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ جواد سے وہ اور بھی جھجکتی تھی۔ وہ بہت کم یہاں آتا جاتا تھا۔ کھل کر اس سے متعارف بھی نہیں ہونے پائی تھی لیکن یہاں کا تو دستور تھا کہ ہر نئے آنے والے کو تمت کا مذاق اڑانے کا حق سب سے پہلے دیا جاتا تھا۔ گلاں سے چائے اندر دے آنے کا کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

اس کا چھوٹا سا کمرہ جیسے ماں کی گود تھی۔ جس میں چھپ کر وہ تحفظ کے گہرے احساس تلے مطمئن ہو جاتی تھی۔ اس کے کمرے میں کبھی کوئی نہیں آتا تھا۔ یہاں وہ خود کو اس احساس کمتری سے بھی محفوظ پاتی تھی جو دوسروں کی موجودگی میں اس شدت سے عود کر آتا تھا کہ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ خود کو کہاں چھپا لے۔

کرسی پر بیٹھی ہوئی کتنی ہی دیر وہ نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ دل میں اک عجیب سی گھٹن تھی کبھی کبھی وہ اس بے اطمینانی سے اس قدر پریشان ہو جاتی تھی کہ جی چاہتا کسی کے سینے سے لگ کر اس شدت سے روئے کہ ان آنسوؤں میں اس کے سارے دکھ گھل کر بہہ جائیں کوئی پیار سے اسے اپنے ساتھ لپٹا لے۔ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرے۔ پیار سے اس کی پیشانی چوم لے اور وہ اس مشفق سینے سے لگی اپنے سب دکھ بھول جائے۔ اس کی سب محرومیاں ختم ہو جائیں لیکن وہ تو ماں کی مشفق گود کی گرمی سے بھی محروم تھی۔ ممتا کی لذت سے ناآشنا تھی۔ پیار کا لفظ اس کے نزدیک بے معنی تھا۔

☆......☆......☆

اس کے من میں اک طلاطم سا بپا تھا۔ اس کی روح کی گھٹن کمرے میں حبس بن کر پھیل رہی تھی۔ اس نے کتابوں میں مصروف ہو جانے کی کوشش کی لیکن دل ٹھہرتا نہیں تھا۔ ایک کتاب اٹھا کر وہ چمن کی طرف ہو لی۔ وہاں تنہائیوں میں پرندوں کے چہچہے تو تھے۔ پھولوں کی دلکش ہنسی تو تھی، تتلیوں کی شوخ، اٹھکیلیاں تو تھیں، چلتے چلتے وہ اس کھڑکی کے قریب رک گئی اور ایک طرف سے ہٹے ہوئے پردے میں سے کمرے میں جھانکنے لگی۔ اس کے چہرے پر اک سرور انگیز سی مسکراہٹ چھا رہی تھی۔ اب سے

کچھ دیر پہلے دکھ کے جو سائے اس کے معصوم چہرے پر جھکے آتے تھے ہولے ہولے طمانیت کے رنگ میں ڈھلنے لگے جیسے من چاہی مراد پالی ہو۔

وہ یونہی چھپی چھپی سی کھڑی اندر جھانک رہی تھی کہ ہولے سے کسی نے اس کے شانے کو چھوا۔ جیسے کسی کو متوجہ کیا جاتا ہے۔ اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ چونک کر پلٹی اور خوف سے لرز سی گئی۔ سامنے جواد کھڑا تھا جس کی چمکیلی آنکھوں میں اک حیرت سی جھلکتی تھی۔

''یہ چوری چوری آپ کس کو جھانک رہی ہیں۔''

تمت ہراساں سی ہو کر پیچھے ہٹتی گئی۔ منہ میں ڈالا ہوا انگوٹھا اب وہ اضطراب میں تیزی سے چوسے جاتی تھی۔ جواد نے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا۔ جو اس طرح سے سہمی ہوئی تھی جیسے اس کی جان پر بنی ہو۔ اس نے ملائمت سے کہا۔

''میں نے آپ کو پریشان کر دیا۔''

تمت کی حالت اب بھی ویسی ہی تھی۔ مجرم سی بنی ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ جواد اس کی حالت دیکھ کر نادم سا ہو گیا۔ وہ جو اتنی سادہ سی لڑکی تھی اس کی وجہ سے کتنی پریشان ہو گئی تھی۔ نہ جانے وہ کن خیالوں میں مگن تھی جو اس کے چھیڑ دینے سے بکھر گئے تھے۔ نہ جانے وہ کسے اس انہماک سے دیکھ رہی تھی۔

کچھ مشکوک سا ہو کر اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ کھڑکی میں ڈالی لیکن کمرے میں تو صرف صمدانی صاحب تھے۔ جو اپنے کسی کام میں مصروف تھے۔ اس نے پھر ایک نظر انگوٹھا چوستی ہوئی تمت کی طرف دیکھا جو بالکل اس سیدھے سادے چھوٹے سے بچے کی طرح معلوم ہو رہی تھی جس کو کسی اور کی شرارت کی سزا ملنے والی ہو۔

وہ اس کے قریب چلا آیا اور نرمی سے بولا۔ ''کیا بات ہے آپ تو پریشان ہو گئیں۔'' وہ پھر بھی خاموش کھڑی پلکیں جھپکتی رہی۔ وہ اب بھی کانپ رہی تھی۔

جواد کو اس پر ترس آیا۔ اپنے لہجے میں ایک مفاہمت کا انداز پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھئے میں نے یونہی آپ کو متوجہ کرنے کو ایک بات کہہ دی تھی۔ میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا نہیں تھا۔''

تمت نے بوکھلا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے

کیا کہے۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی خوف کی پرچھائیاں چھائی تھیں جواد نے خوش دلی سے کہا۔

''گر آپ یہ انگوٹھا منہ سے نکال دیں تو یقیناً بات کر سکیں گی۔''

اس نے چونک کر انگوٹھا منہ سے نکال دیا اور روہانسی ہو کر اس کی طرف یوں دیکھا جیسے سہمے ہوئے بچے سخت گیر استاد کی طرف دیکھتے ہیں۔

جواد کو اس کے عجیب و غریب رویئے پر بڑی حیرت ہو رہی تھی۔ وہ بظاہر تو اچھی خاصی باقاعدہ سی لڑکی نظر آتی تھی لیکن اس کی بچگانہ سی سہمی سہمی حرکات نے جواد کو عجیب مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ وہ اس طرح خاموش تھی جیسے گویائی پر قادر نہ ہو۔ وہ بھی ایک احساس جرم میں مبتلا ہو گیا کہ اس نے خواہ مخواہ ہی اس سیدھی سادی لڑکی کو پریشان کیا لیکن بات بدلنے کو بولا۔

''آپ ہمارے ساتھ چائے میں شریک کیوں نہیں ہوئیں۔''

وہ یوں پشیمان ہو گئی جیسے اس سے کوئی بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہو اور ملتجی نگاہوں سے اس کی جانب یوں دیکھا جیسے اپنی اس غلطی پر معذرت طلب کر رہی ہو۔

جواد نے فضا کو خوشگوار بنانے کو یونہی ایک بات کہہ دی تھی لیکن اس کی غیر معمولی فکرمندی دیکھ کر وہ اور بھی حیران ہوا۔ اس نے بچوں کی طرح اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے چمن کی طرف لے گیا۔ وہ ایک معمول کی طرح اس کے ساتھ ساتھ چلتی گئی۔ اس میں اتنی جرأت ہی نہیں تھی کہ انکار کر سکتی۔ اس نے ایک نشست پر اسے بٹھا دیا تو وہ شانے سکیڑے مجرموں کی طرح سر جھکا کر بیٹھ رہی۔

''تمت !!!'' اس نے ملائمت سے پکارا تو تمت نے بڑی معصومیت سے سر اٹھا کر دیکھا۔ ''تمت میں نے جب بھی آپ کو دیکھا اسی طرح کھویا کھویا' پریشان اور خاموش' کم گو ہونا اور بات ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ کم گو نہیں۔ لوگ کم گو بھی ہوتے ہیں لیکن وہ آپ کی طرح خوفزدہ نہیں ہوتے۔ آپ ہر وقت سہمی سہمی رہتی ہیں کیا وجہ ہے؟؟؟؟''

تمت نے غیر ارادی طور پر انگوٹھا منہ میں ڈالا اور حیرت زدہ سی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے تو اتنا بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کے ساتھ اس کی کیا رشتہ داری

ہے۔ لیکن وہ کس بے تکلفی سے کھڑا ہوا اس کے دل کی باتیں کہے جاتا تھا۔

جواد بڑے غور سے اس کی ایک ایک حرکت دیکھ رہا تھا۔ جیسے کوئی ماہر نفسیات اپنے مریض کا جائزہ لیتا ہے۔ وہ کچھ کہنا تو چاہتی تھی لیکن کہہ نہیں پائی تھی۔ اس نے بزرگوں کی طرح اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑی اپنائیت سے بولا۔

''دیکھیں نا اب گڑیا ہیں خوب باتیں کرتی ہیں۔ انجم نازی ہیں اور بھی لوگ کم یا زیادہ باتیں کرتے ہیں۔ گفتگو میں شریک ہوتے ہیں لیکن آپ تو دبکی ہوئی بیٹھی رہتی ہیں۔ آپ کو کوئی الجھن ہے؟؟؟''

تمت کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا کہ باوجود کوشش کے بھی کچھ کہہ نہیں پائی تھی وہ اب بھی بچوں کی طرح انگوٹھا چوس رہی تھی۔ جواد نے آہستگی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور انگوٹھا اس کے منہ سے نکال دیا۔ خجل سی ہو کر اس نے آنکھیں اوپر اٹھائیں۔

جواد نے کہا۔ ''سچ مچ انگوٹھا چوسنے میں مجھے بھی بہت مزہ آتا ہے لیکن میں اکیلے میں انگوٹھا چوستا ہوں کوئی پاس موجود ہو تو اس سے باتیں کرتا ہوں۔''

تمت نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ کیا واقعی وہ سچ کہتا ہے۔ جواد ہنس پڑا۔ اچھا تو پہلے آپ بتایئے کہ آپ انگوٹھا چوستے ہوئے کیا محسوس کرتی ہیں' پھر میں بھی بتاؤں گا۔''

وہ سٹپٹا گئی تو اس نے ہمت بندھائی۔ ''ہاں بتایئے جلدی سے شاباش۔'' وہ دونوں ہاتھ اضطرار میں مسلتی ہوئی رک رک کر بولی۔ ''پتہ۔ پتہ نہیں مجھے تو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ میں میں انگوٹھا چوس رہی ہوں۔''

''بالکل درست۔'' جواد نے بظاہر گرمجوشی سے کہا۔ ''بھئی اس طرح تو میرے ساتھ بھی ہوتا ہے۔''

''اچھا۔'' تمت حیران ہوئی۔

''شیور'' (Sure) جواد نے فوراً کہا۔

تمت پھر بھی مشکوک ہی رہی۔ دھیرے سے بولی۔ ''آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔''

''واہ کیوں؟ کیوں؟ میرا دماغ تو خراب نہیں جو آپ کا مذاق اڑاؤں۔''

''لیکن آپ۔ لیکن آپ بھی انگوٹھا۔''

''جی ہاں۔'' وہ بھی اسی لہجے میں بولا۔ ''میں بھی انگوٹھا مگر آپ کو شک کیوں ہو گیا۔''

''جی مگر۔ مگر آپ تو۔'' وہ ہچکچائی۔

''کہئے کہئے بات منہ میں نہیں روکا کرتے۔'' اس نے بڑے دوستانہ انداز میں کہا تو اس کی جھجک کچھ دور ہوئی۔ ''آپ تو اچھے خاصے ہیں۔''

''یعنی۔'' اس نے سوالیہ انداز میں بھنویں اچکائیں۔

''میرا مطلب ہے۔'' وہ اٹکی تو جواد نے فوراً ہنکارا بھرا وہ بڑی کوشش سے اسے دل کی بات کہنے پر مائل کر رہا تھا۔ اسے یہ سانولی سی سیدھی سادی لڑکی اس معصوم بچے کی طرح معلوم ہوتی تھی جو گھر کا راستہ بھول گیا ہو۔ وہ اس کے الجھے ہوئے ذہن کو اس کی زبان تک لانا چاہتا تھا۔

اس کی اس قرابت اور اپنائیت پر تمت کی ہمت بندھ گئی۔ ''وہ میرا مطلب ہے' آپ تو اتنے اچھے ہیں۔'' اس نے بھولپن سے کہا۔

جواد نے اک خوشگوار سی حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے خیال بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی بڑی بات کہہ دے گی لیکن اس کے لہجے کی سادگی' اس کی سادہ دلی کی غماز تھی۔ بچگانہ انداز میں کہی ہوئی یہ بات اپنی تہہ میں کوئی گہرا مطلب نہیں رکھتی تھی۔

☆......☆......☆

جواد نے اس کے پرسکون چہرے پر اک نگاہ ڈالی۔ جہاں سوائے معصومیت کے کچھ نہیں تھا۔ اپنی سوچ پر پشیمان ہو کر وہ جلدی سے بولا۔ ''ہوں' مگر کس قسم کا اچھا' اچھے لوگ بھی تو کئی طرح کے ہوتے ہیں۔''

وہ پھر پشیمان ہو گئی جیسے نادانستگی میں کوئی غلط بات کر بیٹھی ہو۔ جواد نے ہمت بندھائی تو مبہم سے انداز میں بولی۔ ''میرا مطلب ہے عمران بھائی کی طرح اچھے۔''

''اچھا وہ نہیں اچھے؟'' اس نے صاد کرنے کے انداز میں کہا۔ جواد بھی بوکھلا گیا۔ عجلت میں بولا۔ ''آپ نے کہا نا کہ وہ اچھے ہیں تو بتائیے کس طرح سے اچھے ہیں۔''

''سب ہی کہتے ہیں کہ وہ اچھے ہیں۔''

''سب کی بات جانے دیجئے آپ اپنی کہیے۔''

''میں۔ میں۔'' وہ گھبرا گئی۔ ''سب کہتے ہیں تو میں بھی کہتی ہوں۔''

''اچھا تو سب کیوں کہتے ہیں؟''

اس لئے۔ اسی لئے کہ وہ اتنے خوبصورت ہیں۔'' وہ بے ساختہ کہہ گئی۔

''اور آپ مجھے کیوں اچھا کہہ رہی ہیں۔'' جواد نے اچانک پوچھ لیا۔ تو وہ بے خیالی میں کہہ گئی۔ ''آپ بھی تو خوبصورت ہیں۔''

''اچھا۔'' جواد نے اپنی چمکیلی آنکھوں سے اس کی چھوٹی چھوٹی سیاہ آنکھوں میں دیکھا۔ جو کنول کی طرح کھلی ہوئی تو نہیں تھیں لیکن ان میں کسی صیاد دیدہ ہرنی کا سا خوف نمایاں تھا۔ جو اس کو اک بے نام سی دلکشی عطا کرتی تھی۔

وہ خاموش بیٹھی تھی جواد نے اس کے قریب جھک کر کہا۔ ''اور اپنے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟''

''جی ہیں۔'' وہ نادم سی ہو کر بولی جس طرح اپنے کسی جرم کا اعتراف کر رہی ہو۔ ''میں تو ذرا بھی خوبصورت نہیں۔''

''کیوں؟ اچھی خاصی تو ہیں اور آپ کتنا خوبصورت ہونا چاہتی ہیں۔''

تمت بھونچکی سی رہ گئی۔ بے یقینی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''آپ یقین کریں میں صحیح کہہ رہا ہوں۔'' جواد نے پھر کہا۔

اسے بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اس سے اس قدر جھوٹ کیوں بول رہا ہے لیکن اس کی سنجیدہ صورت اور بردبار لہجہ دیکھتی تو اس کی بات پر یقین کر لینے کو جی چاہتا لیکن اتنے سارے لوگ جو بات اسے بچپن سے کہتے آئے تھے وہ غلط تو نہیں تھی۔ آئینہ بھی تو جھوٹ نہیں بولتا تو وہ کس کی بات مانے۔

اس کے ننھے سے دل میں سر اٹھانے والے اندیشوں کو جواد جیسے اس کے چہرے سے پڑھ رہا تھا لیکن وہ اس کو دل کی بات کہنے پر آمادہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ کچھ دیر متذبذب سی رہی پھر کچھ سوچتی ہوئی بولی۔ ''شبو آپا' انجم آپا' نازی گڑیا میں تو سب سے بری ہوں۔'' وہ جیسے اپنے آپ سے مخاطب تھی۔

اوں ہوں جواد نے ٹوکا۔ ''آپ کیوں بری ہیں۔''

''میں؟'' تمت کی کیفیت ایسی ہی تھی جیسے خواب میں باتیں کر رہی ہو۔ ''میں تو اتنی کالی ہوں۔ میری شکل بھی اچھی نہیں۔ پھر مجھے کچھ بھی نہیں آتا۔ میں سارے کام خراب کر دیتی ہوں۔ سب لوگ اماں بی سے کہتے ہیں کہ یہ تو آپ کی بیٹی ہی نہیں لگتی۔'' اس کا گلا رندھ گیا۔ آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''میں تو اماں بی کی بیٹی ہوں۔ سب کہتے ہیں کہ کوئی نہیں۔ اب اللہ میاں نے مجھے ایسا بنا دیا ہے۔ اب تو کچھ نہیں ہو سکتا نا۔''

جواد کو اس کی سادگی اور معصومیت پر بڑا ترس آیا۔ سب لوگوں نے مل کر اس پر کتنا ظلم کیا تھا۔ اپنی بہنوں کی طرح خوبصورت نہیں تھی لیکن اچھی خاصی قبول صورت تو تھی۔ سانولے رنگ کی ملاحت نے اس کے سادہ نقوش کو اک ہلکی سی دلکشی بخش دی

تھی لیکن سب لوگوں کے تعصب نے اسے نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔

جواد بڑا متاثر ہوا۔ اسے تمت پر رحم آ رہا تھا کتنی ہی دیر وہ اس کو سمجھاتا رہا۔ اسے یقین دلاتا رہا کہ وہ بدصورت نہیں ہے اور خوبصورتی دنیا میں سب کچھ نہیں۔ زندگی کو کامیاب بنانے' اس میں خوبصورتی پیدا کرنے اور دوسروں کی نگاہوں میں خود کو برتر بنانے کے اور بھی بہت سے ذرائع ہیں۔

تمت کیلئے یہ سب کچھ بہت حیران کن تھا۔ وہ اپنا اعتماد کھو چکی تھی۔ بچپن سے اب تک اس کے ذہن میں یہی بات گردش کرتی رہی تھی کہ وہ بدصورت ہے اور یہی اس کا سب سے بڑا جرم ہے۔ جواد کی باتیں سنتی تو اسے بڑی حیرت ہوتی کہ اوروں کی طرح وہ بھی اس کا مذاق کیوں نہیں اڑاتا۔ اسے برا بھلا کیوں نہیں کہتا۔ وہ جو اتنی دیر سے اس کے قریب بیٹھا ایسی اپنائیت کے ساتھ باتیں کیے جاتا تھا تو بھلا کیوں؟

وہ گم صم سی بیٹھی یہی سوچے جاتی تھی۔ عجیب سی گھبراہٹ اس کے دل پر چھائی جاتی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ زور زور سے رو دے۔ چیخیں مارے۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ کیا کرے۔ جواد جس اعتماد سے' جس سچائی سے بات کر رہا تھا اس پر یقین کر لینے کو جی بھی چاہتا تھا لیکن پھر اپنے گردوپیش دیکھتی تو وہی پہلے جیسی دنیا' وہی فضا اور وہی ماحول نظر آتا۔ وہ بھی الجھ گئی۔ عجیب سے خلجان میں مبتلا ہو گئی۔ حیران حیران سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اس کے دماغ کی نسیں پھٹ پڑنے کو تھیں۔ ایک دم ہی اٹھ کر وہ اندر بھاگ گئی۔ مڑ کر جواد کو بھی نہیں دیکھا۔

اس کا ذہن اور بھی الجھ گیا تھا۔ کئی بار اس نے آئینے سے پوچھا لیکن اس نے وہی سانولی صورت دکھا دی جس کے ہمیشہ اسے طعنے ملتے تھے۔ تو پھر جواد کیوں کہتا تھا کہ وہ بدصورت نہیں ہے۔ اگر خوبصورت ہونا ضروری نہیں تو اس کو کس جرم کی سزا ملتی رہی ہے۔ وہ آئینے پر اعتبار کرے یا جواد کی گفتگو کے آئینے میں اپنی صورت دیکھے' لیکن وہ ان لوگوں سے کیا کہے جو اسے اور گڑیا کو دیکھتے ہی دونوں کی صورتوں میں موازنہ کرنے بیٹھ جاتے اور جب وہ حیرت سے کہتے "ویسے یہ آپ کی بیٹی لگتی

نہیں۔ تو تمت کا دل کٹ کر رہ جاتا۔ اماں بی نے کبھی اسے وہ پیار نہیں دیا تھا۔ جو ممتا سے مخصوص ہے لیکن پھر بھی یہ خیال اسے عجیب سی طمانیت بخشتا تھا کہ اماں بی اس کی ماں تو ہیں۔ ملکیت کا یہ تصور ہی اس کی ڈھارس بندھاتا تھا۔ وہ دور ہی دور سے اماں بی کو دیکھ کر خوش ہو لیتی تھی لیکن جب لوگ ایسی بات کہتے تو تمت کو اپنا وجود اور بھی بے حقیقت معلوم ہوتا۔ وہ پریشان ہو کر سوچتی کہ بھلا اس کی دنیا میں ضرورت ہی کیا تھی۔

وہ جواد کا سامنا کرنے سے بھی کتراتی تھی۔ اس کے دل میں خوف سا بیٹھ گیا تھا کہ جواد ملے گا تو پھر ایسی ہی باتیں شروع کر دے گا جو اسے مسحور کر دیں گی اسے اپنے ساتھ بہا کر بہت دور لے جائیں گی لیکن جب وہ حقیقت کی دنیا میں لوٹ کر آئے گی تو وہ پہلے سے کہیں تلخ تر ہو گی وہ زیادہ سے زیادہ خود کو کتابوں میں مصروف رکھنے کی کوشش کرتی۔

☆......☆......☆

جواد اکثر آ جاتا تھا۔ وہ سب سے گھل مل گیا تھا۔ خصوصاً گڑیا سے تو اس کی خوب نوک جھونک رہتی تھی۔ تمت بہت کم اس سے بات کرتی۔ اس کے سامنے بھی نہیں آتی تھی۔ اس کی باتوں سے اسے خوف آتا تھا لیکن وہ بھی کوئی نہ کوئی موقع اسے الجھانے کا نکال ہی لیتا۔ وہ اس گم صم لڑکی کو اس کی تنہائی سے باہر لانا چاہتا تھا۔ وہ اس کے سامنے ایک ناسمجھ بچی بن جاتی تھی جس سے وہ دل کی ہر بات اگلوا لیتا تھا۔ وہ جو فطرتاً متجس سی طبیعت کا مالک تھا اسے تمت کی الجھنوں کا کھوج لگانے میں بڑا لطف آتا تھا۔ وہ اسے ایک نارمل لڑکی بنانا چاہتا تھا۔ بعض اوقات گڑیا کو اس کا مذاق اڑانے پر ٹوک بھی دیتا۔ کوئی بحث چھڑ جاتی تو وہ اس کا طرفدار بن جاتا۔

عمران کو پروموشن ملی تو اس نے اک پارٹی دینے کا پروگرام بنایا لیکن شرط یہ تھی کہ سب فینسی ڈریس میں آئیں گے۔ گڑیا فوراً چہکی۔

"مزہ تو جب ہے کہ سب ماسک بھی پہنیں اور ایسے کہ دوسروں کا ڈر کے مارے برا حال ہو جائے۔" سب ہی اس تجویز پر اچھل پڑے۔ شبو' خرم اور رانی وغیرہ سب آئے ہوئے تھے۔

"نہ بھئی ہم بڑے کمزور دل کے آدمی ہیں۔ ڈرانے والا کام نہ کرنا۔" جواد

نے تمسخر سے کہا۔

''اگر آپ تمت کو دیکھ کر نہیں ڈرتے تو آپ اس ٹیسٹ میں پاس ہیں۔''

گڑیا نے اپنی خوبصورت آنکھوں میں اک شوخی سی بھر کر کہا۔ تمت کے چہرے پر سایہ سا پھیل گیا۔ جواد کو بہت برا محسوس ہوا۔ اپنے درشت ہوتے ہوئے لہجے کو ذرا نرم بنا کر بولا۔''یعنی!!!''

''یعنی ایسے ہی سارے ماسک ہوں گے۔'' عمران نے کہا۔''اور تمت کو تو ماسک پہننے کی بھی زحمت نہیں کرنی پڑے گی۔''

''آپ لوگوں کو اس طرح نہیں کہنا چاہئے۔'' جواد نے سنجیدگی سے کہا۔

''بھئی مذاق ہی ہے نا تمہیں سنجیدہ نہیں ہونا چاہئے۔'' خرم نے بات سمجھانا چاہی۔

''مذاق ہے تو اکیلی تمت کے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے۔'' جواد نے درشتی سے کہا۔

''جو مذاق کے قابل ہوتا ہے اسی کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔'' گڑیا اٹھلائی۔

جواد کو اس کی ذہنیت پہ سخت غصہ آیا۔ تلخی بڑھی تو خرم نے معاملہ رفع دفع کرا دیا لیکن فضا مکدر ہو گئی تھی اس لئے پارٹی کا پروگرام بھی ملتوی ہو گیا۔ گڑیا نے آنکھ بچا کر اک قہر آلود نگاہ تمت پر ڈالی۔''آئے ہیں بڑے وہاں سے اس چڑیل کی طرفداری کرنے والے۔'' اور تمت یوں سہمی ہوئی تھی جیسے سارا قصور اسی کا تھا۔

محفل برخاست ہونے سے پہلے ہی وہ خوف کے مارے وہاں سے اٹھ آئی۔ بھلا جواد بھائی کو کیا ضرورت پڑی ہے میری طرف داری کرنے کی۔ میں تو اب اس کی عادی ہو چکی ہوں۔ اس کی خوگر ہوں۔ اب تو کوئی کچھ کہتا رہے مجھے محسوس نہیں ہوتا۔ طنز کے نشتر سہہ سہہ کر وہ تو اب پتھر کی ہو گئی تھی۔ اب تو جو اس پر طنز نہیں کرتا تھا وہ اس کے متعلق مشکوک ہو جاتی تھی وہ اسے زیادہ ڈراؤنا دکھائی دیتا تھا۔ اسی لئے جواد سے بھی اسے خوف سا آنے لگا تھا۔ اس کی ہمدردی اسے بڑی اجنبی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اسے کسی دوسری دنیا کی مخلوق نظر آتا تھا۔

عجیب سے وسوسے اسے پریشان کئے دیتے تھے۔ پریشانیوں کی یلغار سے گھبرائی تو بڑی اماں کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ اب روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔ بہت کم اپنے کمرے سے نکلتی تھیں اور شاذ ہی کوئی ان کے کمرے میں جھانکتا

تھا۔ ان کے کمرے کی فضا میں بڑھاپا جیسے رچ بس گیا تھا۔ ان کی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے بڑھاپا جھانکتا تھا اس لئے گھر کے جوانوں کو کیا پڑی تھی کہ جوانی کی تیز و تند موجوں سے سر اٹھا کر بڑھاپے کے اس ٹھہرے ہوئے سمندر کا نظارہ کریں جس کی سطح پر کائی جم گئی تھی۔ وہ بڑھاپے کے اس آئینے میں اپنا مستقبل دیکھتے ہوئے گھبراتے تھے۔

☆......☆......☆

گلاں سب کو کھلا کر فارغ ہوتی تو بڑی اماں کے پاس تپائی گھسیٹ کر اس پر ان کا کھانا رکھ جاتی۔ بڑھاپے میں ہر چیز کی اشتہا بڑھ جاتی ہے۔ زندگی کے دن گھٹتے دیکھ کر انسان لطف زندگی زیادہ سے زیادہ حاصل کر لینا چاہتا ہے۔ بڑی اماں جنہوں نے اچھے وقتوں میں کھانوں کی طرف رغبت کی نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا اب انہیں اس قدر بھوک محسوس ہوتی کہ ان کی آنتوں میں مروڑ سے اٹھنے لگتے۔ گلاں باورچی خانے میں اس قدر مصروف ہوتی کہ بغیر کسی انتہائی ضروری کام کے باورچی خانے سے نکلتی ہی نہیں تھی۔ لڑکیوں کو آوازیں دے دے کر ان کا گلا بیٹھ جاتا لیکن وہ سنی ان سنی کر کے ادھر ادھر ہو جاتیں۔ نواسیوں سے کیا گلا کرتیں خود ان کی اپنی بیٹی ذرا کی ذرا ان کے کمرے میں آتی۔ ایک دو بات کرتی اور پھر اپنے بکھیڑوں میں الجھ جاتی۔

☆......☆......☆

وہ اپنی ذرا ذرا سی ضرورتوں کیلئے پہروں انتظار کرتیں جو کوئی باہر سے گزرتا وہ آوازیں دیتیں لیکن وہ کان لپیٹ کر چل دیتا لیکن تمت تو جیسے ہمدردی کی دیوی تھی۔ خاموشی سے بنا بلائے ان کے کمرے میں آتی۔ ان کی ساری ضرورتوں کا اسے نہ جانے کس طرح احساس ہو جاتا تھا۔ وہ ان کے کہے بغیر ہی ان کی ضرورتیں پوری کر دیتی تھی۔ انہیں دوائی کھلاتی، مالش کر دیتی اور پوری دلچسپی سے بیٹھی ان کی باتیں سنتی رہتی۔

وہ بھی ماضی کے سنہرے کشش انگیز ماضی کو پھر سے تازہ کرتیں تو انہیں محسوس ہوتا جیسے ان کی بوڑھی ہڈیوں میں جوانی از سر نو عود کر آئی ہے۔ وہ بڑی روانی سے بولتی چلی جاتیں اور تمت ان کی بوڑھی آنکھوں میں مسرت کی چمک دیکھ کر سوچتی کہ ہمیں

پرانی نسل کو یوں نظر انداز تو نہیں کر دینا چاہئے۔ وہ تو ماضی کی تاریخ ہیں۔ اپنا کھویا ہوا ماضی جو نگاہوں سے اوجھل ہے لیکن ان کی گفتگو میں پھر زندہ ہو جاتا ہے۔ ہماری ذرا سی توجہ اگر بوڑھے لوگوں کو یہ احساس دلا دے کہ وہ ابھی ناکارہ نہیں ہوئے۔ دوسروں کو اب بھی ان کی ضرورت ہے تو بچوں کی طرح معصوم بوڑھے اپنے آپ کو کتنا اہم محسوس کرنے لگیں۔ یہ شفیق چہرے کبھی سوگوار اور اکتائے ہوئے معلوم نہ ہوں۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو بڑی اماں جیسے اس کی منتظر تھیں۔ ان کے جھریوں بھرے چہرے پر ایک چمک سی ہولے ہولے اترنے لگی۔ تمت کا سوگوار دل ہلکا پھول سا ہو گیا۔

☆......☆......☆

''تمو...... تو صبح سے کہاں تھی؟'' انہوں نے شکوے کے انداز میں کہا لیکن اس میں اتنی اپنائیت جھلکتی تھی کہ تمت نے حیران ہو کر سوچا کہ کیا کسی کو امی کی اتنی ضرورت بھی ہو سکتی ہے۔ وہ جلدی سے ان کے پلنگ کے قریب آئی اور بولی۔

''بڑی اماں میں کچھ کالج کا کام کر رہی تھی۔''

''بٹیا ایک تو ہی ہے جو کام کاج میں لگی رہتی ہے۔ ان لڑکے لڑکیوں نے وہ ہڑبونگ مچا رکھی ہے کہ خدا کی پناہ۔''

''اماں بی خرم بھائی اور شبو آپا بھی آئی ہوئی ہیں۔''

''اچھا؟؟'' انہوں نے حیرت سے کہا۔ ان کی تو زبان گھستی ہے جو کسی بڑے کو سلام ہی کر جائیں۔''

کافی دیر تک وہ گھر بھر کا گلہ کرتی رہیں کہ کوئی انہیں نہیں پوچھتا۔ تمت انہیں باتوں میں الجھاتی رہی۔ سب کی صفائیاں پیش کرتی رہی کہ کسی طرح ان کے اس احساس کو ختم کیا جائے کہ انہیں نظر انداز کیا جا رہا ہے اور ان سے اماں بی کے بچپن کی باتیں، دوسرے بہن بھائیوں کی بچپن کی شرارتوں سے متعلق باتیں کرتی رہی اور بڑی اماں نے حیرت سے اس کے سانولے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے نقوش بے حد سادہ تھے۔ بال بھی سلیقہ سے نہیں سنوارے تھے لیکن وہ کتنی پیاری لگتی تھی۔ اتنی خوبصورت جیسے بہشت کی کوئی مہربان حور ہو جو کچھ دیر کیلئے دنیا میں سکھ اور خوشیاں

بانٹنے کو زمین پر اتر آئی ہو۔

انہوں نے رعشہ زدہ ہاتھ اٹھایا اور اس کے سر پر محبت سے رکھ دیا اور پیار سے چھلکتی آواز میں بولیں۔ ''تمو تو میری بہت پیاری بیٹی ہے۔''

تمت نے ان کے کانپتے ہوئے ہاتھ کو دیکھا اور اسے وہ اماں بی یاد آ گئیں جن کے دبدبے سے گھر کے در و دیوار کانپتے تھے اور آج وہ کتنی بے بس سی تھیں۔ انسان کی انتہا یہی ہے اس نے دکھی ہو کر سوچا اور ہولے ہولے ان کا سر دبانے لگی۔

انہوں نے طمانیت سے آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک انہوں نے آنکھیں کھول کر کہا۔

''تمو تو کب تک ڈاکٹر بن جائے گی۔''

تمت پہلے تو حیران رہ گئی پھر نرمی سے بولی۔ بس ایک دو سال کی بات ہے۔ پھر میں پوری ڈاکٹر بن جاؤں گی۔ تب میں آپ کو ایسی دوائیاں دوں گی کہ آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔''

''اب تو اچھے ہونے کی بات سوچنا بیوقوفی ہی ہے۔ دو تین سال تو بہت ہوتے ہیں۔''

''نہیں تو بڑی اماں وہ تو فٹ سے گزر جائیں گے۔'' اس نے چٹکی بجائی۔

''کون جانے پھر کیا ہو۔'' انہوں نے سوگوار سے لہجے میں کہا اور آنکھیں موند لیں۔ وہ بہت دیر تک بیٹھی ہوئی ان کا سر دباتی رہی۔ وہ سو گئیں تو خود چپکے سے اٹھ آئی۔

کالج میں کچھ لیکچررز غیر حاضر تھیں۔ دو ایک پیریڈ بھی خالی تھے سوچا گھر چلی چلے۔ بس سٹاپ پر رش بھی کم تھا۔ وہ انتظار میں ایک جانب کھڑی ہو گئی۔

''تمت!!'' کسی شناسا سا آواز میں پکارا گیا۔ تو اس نے جلدی سے گردن موڑ کر دیکھا اور حیران بھی ہوئی جواد کھڑا تھا۔ ہاتھ میں فائلیں اور کیمرہ تھا۔ جیکٹ اور ٹوپی پہنے وہ کوئی غیر ملکی سیاح نظر آتا تھا۔ ''ہیلو!!'' اس نے اپنی مخصوص خوش دلی سے کہا۔

''ہیلو!!'' تمت نے بھی جواباً ہولے سے کہا۔

وہ اس کے قریب چلا آیا۔ ''پکڑی گئیں نا...... کلاسز بنک کرتی ہو۔''
تمت نے سہم کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مصنوعی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولا۔ ''کہاں جا رہی ہو۔ اس وقت۔'' تمت یوں گھبرا گئی جیسے واقعی وہ کہیں اور جانے کا ارادہ رکھتی ہو۔

''میں تو گھر جا رہی ہوں۔''

''ہر روز تو آپ اس وقت نہیں جاتیں۔'' اس نے اس طرح سوال کیا جیسے وہی اس کا سرپرست ہو۔

''آج پریکٹیکل نہیں ہوا۔'' اس کی آواز میں لرزش سی محسوس کر کے وہ بڑا محظوظ ہوا۔ کتنی معصوم ہے یہ لڑکی۔ بھلا مجھ سے خوف کھانے کی کیا ضرورت ہے لیکن پھر دبنگ لہجے میں گویا ہوا۔

''کیوں نہیں ہوا؟''

وہ پشیمان ہو گئی کہ اس کو کیا جواب دے۔ ملتجی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ کر بولی۔ ''ہماری پروفیسر چھٹی پر ہیں۔''

''کیوں چھٹی پر ہیں۔'' اس نے پولیس افسروں کی طرح تفتیشی انداز میں کہا۔

''ان کی شادی ہے۔'' وہ دبک کر بولی۔

''شادی؟؟ کیوں شادی ہے؟''

تمت نے ہک بک ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ مجرموں کی طرح سر جھکا کر بولی۔ ''مجھے تو نہیں پتہ ان کی شادی کیوں ہے۔''

''کیوں نہیں پتہ؟'' وہ غرایا تو تمت روہانسی ہو گئی۔ اس کے پے در پے سوالوں سے وہ حد درجہ گھبرا گئی تھی۔ بھلا وہ اس کو کیا جواب دے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ واقعی وہ بیوقوف تھی اسے کسی سے بات کرنے کا سلیقہ ہی نہیں آتا تھا۔ وہ کتابیں کبھی ایک ہاتھ میں لیتی تو کبھی دوسرے ہاتھ میں۔

جواد اس کی اضطراری حرکات بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ کالج یونیفارم میں کتابیں ہاتھوں میں لئے ہوئے وہ کتنی سادہ نظر آتی تھی۔ خوف اور گھبراہٹ نے مل

جل کر اس کے چہرے کو عجیب دل کش سی معصومیت عطا کر دی تھی۔ وہ بار بار پلکیں جھپکتی اور بال درست کرتی تھی۔ ایک بار اس نے سیاہ آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا جس میں بے بسی آنسوؤں میں ڈھل رہی تھی اور پھر سر جھکا کر انگوٹھا چوسنے لگی۔ جواد کو اس نادان سی لڑکی پر بہت ترس آیا۔ جو معمولی سی بات سے گھبرا جاتی تھی۔ جس میں اتنا بھی اعتماد نہیں تھا کہ دوسرے کو اس کی غلط بات پر ٹوک دے۔ دوسروں کی بے سروپا باتوں سے وہ خود کو یونہی مجرم سمجھنے لگتی تھی۔

دور سے آتی ہوئی بس کو دیکھ کر وہ اس کی طرف بڑھی لیکن جواد نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

''یہ غلط نمبر کی بس ہے۔''

تمت نے مڑ کر دیکھا۔ گھبراہٹ میں اس سے کتابیں چھوٹ کر نیچے گر پڑیں۔ وہ کتابیں اٹھانے کو جھکی تو جواد پہلے ہی کتابیں جھاڑ کر اپنی بغل میں دبا چکا تھا۔ تو تمت نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولتی کم تھی لیکن اس کی نگاہوں میں دل کے تاثرات اس شدت سے اتر آئے تھے کہ مخاطب لفظوں کا محتاج نہیں رہتا۔ جذبات الفاظ کا روپ نہ پائیں تو نگاہوں کو اپنے معنی سمجھا دیتے ہیں۔ جب ہی تو نگاہوں کا تکلم دل میں جاگزیں ہوتا ہے۔

جواد کو بھی اس کی نگاہوں میں حیرت و بے بسی جھلکتی ہوئی نظر آئی۔ بڑی طمانیت سے بولا۔

''آج آپ چلیں نا میرے ساتھ۔ آپ کو ذرا سیر کرا لائیں۔''

''نہیں...... نہیں۔'' وہ سہم گئی۔ ''میں گھر جاؤں گی۔''

''پھر وہاں سے گھر اکٹھے چلیں گے۔ کچھ آپ کے بھی ہاتھ پیر کھلیں' ہر وقت کتابی کیڑا بنی رہتی ہیں۔''

''نہیں...... نہیں اماں بی ناراض ہوں گی۔''

''خواہ مخواہ ہی۔ ہم انہیں کیوں بتائیں گے۔''

''نہیں بتائیں گے؟'' وہ حیران رہ گئی۔

''بالکل نہیں۔''

''تو پھر کیا کہیں گے؟''

''کہہ دینا کہ کالج سے آ رہے ہیں۔ روز کالج سے بھی تو چار بجے آتی ہیں نا۔'' جواد نے بے نیازی سے مشورہ دیا۔

''پر آج تو جلدی آ گئی ہوں۔''

''تو انہیں بتانا کیا ضروری ہے۔'' وہ جھنجھلایا۔ ''اچھا تو نہ بتاؤ؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہوں۔'' بالکل جواد نے ہنکارا بھرا۔ تو وہ کافی دیر تک نہ جانے گم صم کیا سوچتی رہی۔ اس کے چہرے پر تفکرات کے سائے ابھرابھر کرمٹ رہے تھے لیکن جواد آج اس میں خود سے کچھ کرنے کا شعور پیدا کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے اپنی ذات پر اعتماد کرنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ وہ اس کی ٹوٹی پھوٹی شخصیت ریزہ ریزہ جوڑ کر اسے اک مکمل لڑکی بنانا چاہتا تھا۔ جو اس عمر میں بھی ایک عورت کی سی سوجھ بوجھ کی مالک ہوتی ہے۔ جو مرد کے مقابلے میں اتنی حساس ہوتی ہے کہ اس کے ابرو کے اشارے سے سو مطلب اخذ کر لیتی ہے۔

لیکن تمت کی شکستہ فطرت میں جیسے نسوانیت پیدا ہی نہیں ہونے پائی تھی۔ وہ اس حسِ لطیف سے شاید ابھی تک بے خبر تھی جو اسی عمر میں لڑکیوں میں خود بخود جاگ اٹھتی ہے اور انہیں اپنے وجود کا بھرپور احساس دلا دیتی ہے وہ شاید اس احساسِ محبت سے ابھی تک نا آشنا تھی وہ اس کا ہاتھ پکڑ لیتا تو نہ اس کے گالوں میں شفق کی سرخی جھلکتی نہ ہی اس کی پلکیں جھکی جھکی پڑتیں۔ وہ سہمی سہمی سی اس طرح مؤدب ہو جاتی جیسے وہ اس کا کوئی بزرگ ہو۔ وہ جھک کر اس کے کان میں کچھ کہہ دیتا تو وہ حیران رہ جاتی۔

اس کے برعکس گڑیا کی شوخ ادائیں، شرمیلی مسکراہٹیں اور بولتی ہوئی ذہین آنکھیں صاف سمجھاتی تھیں کہ اس کے اندر نسوانی فطرت جاگ رہی ہے۔ وہ اس کی گہری باتوں کو آسانی سے سمجھ لیتی ایک شوخ اور طرار محبوبہ کی طرح ہر وقت شرماتی اور ناز و ادا دکھلاتی اور مناسب ردِعمل کا اظہار کرتی۔

تمت نے پھر شپٹا کر جواد کی طرف دیکھا جو بڑے غور سے اس کی طرف

دیکھ رہا تھا اور ہاتھوں کو فکرمندی سے ملتے ہوئے بولی۔ ''پر اماں بی سے تو پوچھ کر جانا چاہئے۔''

''کیا اماں بی، اماں بی لگا رکھی ہے۔ اب آپ دودھ پیتی بچی نہیں جو ہر وقت ان کے گھٹنے سے لگی رہیں۔ بس سیدھی ایک دو تصویریں لوں گا اور آپ کو وہاں گھاس میں کوئی مینڈک نظر آ گیا تو ڈائسکٹ کر لیجئے گا۔''

تمت اب بھی گم صم تھی۔ اس کے چہرے پر قلبی مسرت کا کوئی پرتو نہیں آیا۔ جو نوخیز لڑکیوں کے امنگوں بھرے دل میں ازخود جاگ اٹھتی ہے۔ جب کوئی خوبصورت لڑکا انہیں کہیں تنہا چلنے کی دعوت دے۔ ''میرا خیال ہے اس نے اشتیاق سے کہا جواد کو بہت خوشی ہوئی کہ کم از کم اب وہ اس قابل تو ہوئی کہ اپنی رائے کا اظہار کر سکے۔ ''میرا مطلب ہے گڑیا کو بھی اس کے کالج سے لے لیں، اکٹھے چلتے ہیں۔''

جواد کو اس کی سادہ لوحی پر پیار سا آ گیا۔ اس کی سوچیں اس کے تخیلات اس کا ذہن ابھی تک بچپن کی حدود میں تھے اس کے شعور میں ابھی ایسی پختگی نہیں آئی تھی کہ وہ کسی بات کی لطیف سی گہرائیوں میں جا سکے۔ ''کیوں بھئی جب وہ کہیں جاتی ہیں تو آپ کو لے کر جاتی ہیں۔''

''میں تو خود ہی نہیں جاتی۔'' اس نے صاف دلی سے کہا۔

''بہرحال اس وقت تو آپ کو ضرور جانا پڑے گا اور گڑیا کے بغیر ہی جانا پڑے گا۔''

وہ سمٹ سی گئی اور سہمی سہمی نگاہوں سے بار بار اس کی طرف دیکھنے لگی۔ جواد اسی بات کا منتظر تھا کہ اب وہ کیا کہتی ہے۔ وہ اسے خود سے کچھ کہنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔

''نہیں، میں گھر چلی جاتی ہوں۔''

جواد چڑ سا گیا۔ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ ''اگر آج آپ نے میری بات نہیں مانی تو پھر میں ناراض ہو جاؤں گا۔''

''ہا!!!'' وہ بھونچکی سی رہ گئی۔ نہ جانے اس کی اس بات سے اسے اس قدر افسوس کیوں ہوا تھا۔ وہ اسے اپنا ہمدرد سمجھنے لگی تھی لیکن وہ بھی اس سے خفا ہو گیا۔ مبہم سی

آواز میں وہ جیسے خود سے بولی۔

''میں بہت بری ہوں نا۔ مجھ سے سب ہی ناراض رہتے ہیں۔''

جواد یہ کہہ کر پچھتایا۔ اس پر پھر اداسی کا غلبہ ہو رہا تھا۔ احساس کمتری پھر جاگ اٹھا تھا۔ جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنائیت سے بولا۔ ''نہیں...... نہیں' تم تو اتنی اچھی لڑکی ہو' بہت اچھی۔ میں تو ذرا دیکھ رہا تھا کہ تمہیں بھی میرا کوئی خیال ہے کہ نہیں۔''

وہ یوں اس کے چہرے کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ جیسے یقین کر رہی ہو کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے صحیح ہے' جواد منتظر ہی رہا کہ وہ کچھ کہے لیکن وہ گنگ سی کھڑی نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ جواد نے سامنے سے آتی ہوئی ٹیکسی کو روکا۔ اس کا ہاتھ پکڑا اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

راستے بھر وہ اس کے بالکل قریب دبکی ہوئی سی بیٹھی رہی۔ اس کا سر اس کے شانے سے لگ رہا تھا۔ اس کا ٹھنڈا اور نم ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا' جسے اس نے چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے بالوں کی خوشبو جواد کو بالکل قریب سے آ رہی تھی۔ وہ یوں خوفزدہ اور سہمی سہمی سی اس کے پہلو میں بیٹھی تھی جیسے کوئی چھوٹی سی معصوم بچی ہو۔ جواد نے اک نگاہ اس کے سانولے چہرے پر ڈالی۔ جس پر کسی ایسے جذبے کا شائبہ بھی نہیں تھا جو کسی نوخیز دوشیزہ کے چہرے پر کسی خوبصورت ساتھی کے قرب میں از خود جھلک آتا ہے۔

اسے اپنے بازو سے لگی ہوئی' وہ کوئی پاکیزہ روح معلوم ہو رہی تھی۔ وہ اس کے کتنا قریب تھی کہ ذرا سا رخ پھیرتا تو اس کے سیاہ بالوں سے اس کے ہونٹ چھو جاتے لیکن اس کے دل میں کوئی ہیجان برپا نہیں تھا۔ اس کے اعصاب پرسکون تھے اس کے رگ و پے میں سنسنی کی کوئی لہر نہیں دوڑ رہی تھی۔ اس وقت اگر وہ اسے بازوؤں میں لے کر پیار بھی کر لیتا تو اس کے دل میں اٹھتے ہوئے پاکیزہ جذبات میں کوئی فرق نہ آتا۔ وہ چھوٹی سی لڑکی جو ذہنی طور پر اپنی عمر سے بہت پیچھے تھی۔ جسے دیکھ کر ایک بار چھونے کا خیال تو آتا تھا لیکن اسی طرح جیسے ہاتھوں کو صاف کر کے کسی متبرک چیز کو عقیدت سے چھو لیا جائے۔

جواد نے پھر ایک نگاہ اپنے قریب بیٹھی ہوئی تمت پر ڈالی۔ جو خاموشی سے انگوٹھا چوس رہی تھی۔ اک مہربان سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔ بڑی شفقت سے اس نے انگوٹھا اس کے منہ سے نکالا۔ اس نے سر اٹھا کر رحم طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ آئندہ ایسا نہیں کروں گی۔ اب معاف کر دو۔ جواد نے رومال سے اس کا ہاتھ صاف کیا اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے۔

☆......☆......☆

وہ جھجکتی تو اب بھی تھی۔ ذرا سی بات پر سہم بھی جاتی تھی لیکن وہ اس سے کافی بے تکلف ہو گئی تھی۔ یہاں آ کر وہ بہت خوش معلوم ہوتی تھی۔ اس سے بہت سے معلوماتی سوال کرتی رہی۔ تصویریں اتارنے کیلئے اسے اچھے اچھے مناظر دکھاتی رہی۔ وہ مقبرے کے بارے میں کچھ ضروری نوٹس لیتا رہا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے سبز سبز گھاس پر بیٹھی رہی۔ مختلف اقسام کے پتے اکٹھے کرتی رہی۔ ننھی منی چڑیوں اور بلبلوں کو دانہ ڈالتی رہی۔ وہ ہنستے ہوئے چہرے کی تمت معلوم ہی نہیں ہوتی تھی جو ہر سے سہمی رہتی تھی۔ فطرت اور انسان کے اس شاہکار نے جیسے اس کے دل سے پژمردگی دور کر دی تھی۔ وہ اس پیاری بچی کی طرح معلوم ہوتی تھی جسے بیک وقت بہت سے کھلونے مل گئے ہوں۔ اپنا کام ختم کر کے جواد نے کیمرہ سیدھا کیا اور اسے فوکس کرتے ہوئے بولا۔

''کچھ فلم بچ گئی ہے' چلو تمہاری تصویر لیتے ہیں۔''

''نہیں !! نہیں !!'' وہ بوکھلا گئی۔

''کیوں؟؟؟'' جواد نے کیمرے سے نگاہ ہٹائی۔

''آپ کی فلم خراب ہو گی۔'' اس نے جلدی سے ہاتھوں میں چہرہ چھپالیا۔

جواد اس کی اس بے ساختہ ادا کو کیمرے میں محفوظ تو کر چکا تھا لیکن انجان بن کر بولا۔

''کیوں؟؟؟'' وہ پشیمان سی ہو کر بولی۔ ''میں اتنی بری جو ہوں۔''

جواد کو خیال تھا کہ شاید وہ کہے گی کہ ایسا مناسب نہیں لیکن اس کی بات سن کر اسے احساس ہوا کہ وہ اسی سادہ لوح سی تمت سے بات کر رہا ہے جو سمجھنے سمجھانے کی اس منزل سے بہت دور ہے۔

''پھر وہی بات۔'' وہ اس کے قریب چلا آیا تو وہ گھاس پر یوں پیچھے کھسک گئی جیسے وہ اسے مارنے آ رہا ہے۔

''کتنی بار سمجھایا ہے کہ بدصورتی تو دل میں ہوتی ہے جس کا دل خوبصورت ہوتا ہے وہ خود بھی خوبصورت ہوتا ہے۔ اسے دوسرے بھی خوبصورت نظر آتے ہیں۔ آپ تو عین مشرقی لڑکی ہیں۔ بھورے بال' نیلی آنکھیں' شلغم جیسا پھیکا لنگ' سب مغربی ہیں' مغربی۔''

''لیکن......'' وہ متذبذب ہوئی۔

''لیکن ویکن کیا۔'' وہ ڈپٹ کر بولا۔ ''تم میری بات سنو۔'' بڑے دوستانہ انداز میں اسے بہت دیر تک سمجھاتا رہا۔ وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے' بڑی خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ دل کہتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے سچ ہے' لیکن پھر کانوں میں سب کی باتیں گونجنے لگتیں۔ وہ پشیمان سی ہو گئی۔ کیا اتنے سارے لوگ غلط کہتے ہیں؟

☆......☆......☆

خوشیاں کتنی ناپائیدار ہوتی ہیں۔ مسرتوں کے جھولے میں جھولتے ہوئے کسی کو گمان بھی نہیں ہوتا کہ سیاہ ناگن کی طرح غم منہ پھاڑے ان کے تعاقب میں ہیں۔ شادمانیوں کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے کوئی اپنے پیچھے لپکنے والی ہر اس آہٹ کو نہیں سنتا جو قریب سے قریب تر آتی چلی جاتی ہے۔

انجم کی منگنی کے بعد سب لوگ کتنے خوش تھے۔ عمران بھائی اکثر آ جاتے۔ جواد بھی کبھی کبھی آ دھمکتا۔ شبو اور رانی بھی آ جاتیں تو سب کے ساتھ مل کر زندہ دلوں کی محفلیں سجائی جاتیں' نت نئے پروگرام بنتے' شرارتیں ہوتیں' ہنسی مذاق قہقہے اور چہلیں۔ تمت ان محفلوں سے بہت الگ تھلگ تھی لیکن یہ جیتی جاگتی رونق اسے بہت بھاتی تھی۔

دوسروں کو خوش دیکھ کر اس کا اپنا پژمردہ دل کھل جاتا تھا۔ پھر جواد کی غیر معمولی توجہ اور بڑی اماں کے پیار نے اسے بہت کچھ بدل دیا تھا۔ وہ اس وقت اپنے آپ کو بہت اہم سمجھنے لگتی۔ جب بڑی اماں کو اپنی راہ تکتے پاتی تو اس کا دل خوشی سے کھل جاتا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں اس کو بتاتیں۔ اپنی ذرا ذرا سی ضرورت اس کے

سامنے بیان کرتیں تو وہ نہال ہو جاتی۔

لیکن ایک دن نہ جانے کیا ہوا بڑی اماں رات کو بھلی چنگی سوئیں لیکن صبح نہیں اٹھیں۔ دوسرے لوگوں نے اسے مشیت ایزدی سمجھ کر چپ چاپ قبول کر لیا۔ بڑی بوڑھیوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ شکر ہے چلتی پھرتی پردہ پوش ہو گئیں۔ کیا فائدہ اس زندگی کا جو دوسروں کا محتاج ہو کر رہنا پڑے لیکن تمت پر تو ایک قیامت گزر گئی۔ کتنے دنوں وہ بھٹکی بھٹکی رہی۔ چپ چاپ روتی رہی۔ انہیں یاد کر کر کے آنسو بہاتی رہی۔ اسے دوسروں پر حیرت ہوتی تھی کہ سب بڑی اماں کو کتنی جلدی بھول بیٹھے تھے۔ یوں ان کے وجود سے بے خبر ہو گئے تھے جیسے وہ اس گھر میں کبھی نہیں تھیں لیکن اسے وہ اس قدر ٹوٹ کر یاد آتیں کہ وہ تڑپ اٹھتی۔

☆......☆......☆

اس سے پیار کرنے والی ہر ہستی چھن جاتی۔ اک محسن بھائی تھے جو یونہی چپ چاپ بنا کچھ کہے اس کی زندگی سے نکل گئے تھے اور کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ انہیں دل ہی دل میں کتنا یاد کرتی تھی۔ کئی بار انہیں خوابوں میں دیکھتی ہے۔ پہروں ان کی ڈائری پڑھ کر رویا کرتی ہے اور بڑی اماں بھی اسے بتائے بغیر ہی اللہ میاں کے پاس چل دی تھیں۔ انہوں نے اس کا انتظار بھی نہیں کیا تھا کہ وہ ڈاکٹر بن جائے۔ سفید اوور آل پہنے جیب میں سٹیتھسکوپ ڈالے بھاگی آئے۔ ''دیکھئے بڑی اماں میں ڈاکٹر بن گئی۔''

بڑی اماں آئے دن بیمار رہتی تھیں۔ ان کے انتقال کا صدمہ سب پر کچھ ایسا گراں نہیں رہا۔ بوڑھے شخص کی آخری منزل یہی ہوتی ہے۔ اس کے متعلق جلد یا بدیر ایسی خبر سننا پڑ جاتی ہے لیکن صمدانی صاحب پر فالج کیا گرا گھر بھر مفلوج ہو کر رہ گیا۔ اچھے بھلے چلتے پھرتے تھے کہ یکلخت فالج نے آن لیا۔ سب کی آس تو وہی ایک تھے۔ اتنا بھی خدا کا فضل تھا کہ کاروبار میں ان کا ساجھی دیانتدار تھا۔ جو گھر بیٹھے ان کا حصہ ایمانداری سے دے رہا تھا۔ کچھ آبائی زمینوں سے آمدنی تھی ورنہ تو روٹی کے لالے پڑ جاتے۔ بڑی توجہ سے علاج ہوتا رہا تو معمولی سا افاقہ ہوا۔ وہ خود کتنا چاہتے تھے کہ کسی

سہارے کے محتاج نہ رہیں۔ گھر والوں کا احسان سہار جاتے۔ اپنی انا کے سہارے وہ اب تک سب سے الگ تھلگ رہے تھے۔ اسی لئے دوسروں کا سہارا لیتے ہوئے خود کو بہت مجبور اور بے بس پاتے تھے۔ اسی لئے چڑ چڑے بھی زیادہ ہو گئے تھے۔

ان کی لمبی اکتا دینے والی بیماری سے سب ہی اوب گئے تھے۔ رفتہ رفتہ سب کی توجہ کم ہوتی جاتی تھی۔ پہلے بھی وہ اپنے کمرے میں الگ تھلگ مصروف رہتے تھے۔ شاذ ہی ان کے کمرے میں کوئی جاتا تھا۔ اپنی بیٹیوں سے بھی انہوں نے کبھی فطری لگاؤ کا اظہار نہیں کیا تھا جو اک باپ سے منسوب ہے۔ لڑکیوں میں بھی اک جھجک سی پیدا ہو گئی تھی۔

تمت جس کا ابا میاں سے کبھی سامنا بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ چپکے ہی چپکے من ہی من میں انہیں کتنا پیار کرتی تھی۔ کتنا ٹوٹ کر انہیں چاہتی تھی۔ مطالعے میں غرق، کوئی کام کرتے ہوئے، کسی ملنے والے سے بات کرتے ہوئے وہ اسے کتنے اچھے لگتے۔ وہ انہیں دیکھ لیتی تھی تو جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں اپنی روح میں جذب کر لینا چاہتی تھی۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر اس کا دل کٹ کٹ جاتا تھا۔ اندر ہی اندر کڑھتی رہتی۔ چھپ چھپ کر ان کی دوائیاں دیکھتی۔ ڈاکٹر کی باتیں سنتی۔ فالج کے بارے میں کتابیں پڑھتی۔ اپنی پروفیسرز سے معلوم کرتی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ ابا میاں کو پہلے جیسا تندرست اور چاق و چوبند بنا کر بستر سے اٹھا دے اور خود ان کی جگہ لیٹ رہے۔

گھر میں پھر وہی ماحول عود کر آیا تھا۔ کسی کو بڑی اماں کا احساس نہیں تھا۔ ابا میاں تو مستقل مریض ہو گئے تھے۔ ایک دن کے بیمار ہوتے تو کوئی ان کی تیمار داری میں کمر بستہ بھی رہتا۔ تمت کو تو ہر وقت انہی کا خیال رہتا تھا۔ ان کیلئے پریشان رہتی۔ ملازم لڑکے سے انہیں دوائیاں وقت پر کھلواتی۔ گلاں کو دوسرے بکھیڑے نہیں چھوڑتے تھے۔ وہی ان کیلئے پرہیزی کھانا بناتی اور احتیاط سے انہیں بھجواتی۔ سب کو اطمینان تھا بلکہ سبھی غافل ہو گئے تھے کہ اس نے یہ کام اپنے ذمے لے رکھا ہے۔

شبو آپا کے بیٹے کے عقیقے پر سب ہی بڑے شوق سے گئے تھے بلکہ گڑیا تو دو

دن پہلے ہی جا پہنچی تھی اور جاتے ہوئے تمت کو کسی نے پوچھا بھی نہیں تھا۔ جیسے سب کو علم ہو کہ وہ گھر میں ہی رہے گی۔ یا اس کا گھر میں رہنا ضروری ہے۔ وہ خود بھی ہنگاموں سے گھبراتی تھی۔ خود کو کمتر سا محسوس کرتی تھی لیکن جب منظر بھائی سب کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر لے جا رہے تھے تو ان کے چمکیلے کپڑوں اور دمکتے چہروں کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اس کا جی چاہنے لگا کہ ان بے پناہ خوشیوں میں اس کا بھی کوئی حصہ ہوتا۔ ان مسرتوں میں وہ بھی شریک ہوتی لیکن یہ بات تو طے تھی کہ وہ کہیں نہیں جاتی۔ اسی لیے اس سے تکلفاً بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی کہ اسے بھی جانا ہے یا نہیں۔

وہ کچھ دیر چمن میں ٹہلتی رہی۔ پڑھنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن اکتا گئی۔ آج نہ جانے جی کیوں نہیں لگتا تھا۔ کمرے میں آنے کیلئے اٹھی تو پچھلے برآمدے میں سے گزرتے ہوئے وہ پھر اس کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئی۔ اندر جھانکنے لگی۔ بچپن سے اب تک اس نے ان گنت مرتبہ اس کھڑکی میں سے جھانکا تھا اور ہر بار وہ اپنے غم بھول گئی تھی۔ تنہائیاں آسودہ ہوگئی تھیں۔ اس کے دھندلے غمگین چہرے پر مسکراہٹ مچل مچل گئی۔ اپنے دکھے ہوئے دل پر مرہم وہ اسی طرح رکھتی رہی تھی لیکن آج اس کے چہرے پر ایسی اذیت کے سائے سے جھلکتے تھے جیسے اس کا دل بند ہو رہا ہے۔ آنسو اس کے رخساروں پر آپ سے آپ بہنے لگے۔ اس نے ہونٹ کاٹ لیا۔ صمرانی صاحب اپنے آپ سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کا چہرہ غم و اندوہ کی تصویر بنا ہوا تھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

''ہائے ابا میاں۔'' اس کا دل جیسے کٹ رہا تھا۔ صمرانی صاحب نے تو کبھی اسے نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا تھا لیکن وہ اسے کتنے پیارے تھے۔ وہ سب کی نگاہوں سے بچتی ہوئی چھپ چھپ کر انہیں اس کھڑکی سے دیکھتی چلی جاتی تھی تو ایسا ہی محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ان کے بالکل قریب ہے۔ جیسے اپنا سر ذرا سا جھکائے گی تو انہیں چھو لے گی۔ کسی سے باتیں کر رہے ہوتے تو وہ ان کی آواز یوں غور سے سنتی جیسے اسی سے مخاطب ہوں۔ وہ مطالعے میں غرق ہوتے تو وہ اس طرح خود بخود لطف اندوز ہوتی جیسے اسے کوئی دلچسپ چیز پڑھ کر سنا رہے ہوں۔ اس کی محرومیوں سے چھلکتی زندگی میں

یہ کھڑکی اک بہت بڑا سہارا تھی۔ جیسے جھلستی دوپہر میں اچانک کوئی دریچہ کھل جائے۔ جہاں سے ٹھنڈی خوشگوار فردوسی ہوا آ رہی ہو لیکن اسے کبھی اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ کمرے میں جا کر ان سے اپنے دل کی سب باتیں کہہ ڈالے کہ وہ ان سے کتنا پیار کرتی ہے۔ انہیں کتنا چاہتی ہے۔ اس ایک لفظ ''ابا میاں'' کو وہ ہولے ہولے دہراتی رہتی ہے۔ تو اسے یوں لگتا ہے جیسے تحفظ کی اک سہانی چھاؤں تلے آ گئی ہو۔

☆ ☆ ☆

صمرانی صاحب اب بھی اپنے آپ سے باتیں کر رہے تھے لیکن ان کی آواز صاف سنائی نہیں دیتی تھی لیکن ان کا دکھی چہرہ انہیں سب کچھ سمجھا رہا تھا۔ وہ بیقرار سی ہوگئی۔ ''ہائے ابا میاں آپ کیوں دکھی ہوں۔ اللہ میاں مجھے آپ کے سارے دکھ دے دے۔''

☆ ☆ ☆

وہ قریب رکھی تپائی پر سے پانی کا گلاس اٹھانا چاہتے تھے لیکن کانپتا ہوا ہاتھ جیسے شل ہو گیا تھا۔ کئی بار انہوں نے ہاتھ اٹھانا چاہا مگر ناکام رہے۔ انہوں نے کروٹ لینا چاہی لیکن اس وقت کمزوری کا غلبہ کچھ زیادہ تھا۔ کامیاب نہیں ہوئے۔ اپنی بے بسی کے احساس سے ان کا چہرہ دھندلا سا گیا۔ انسان کیلئے ناطاقتی کا احساس بڑا ہی جان لیوا ہوتا ہے۔ وہ جو اشرف المخلوقات ہے جب اپنے ہوش و حواس میں خود کو بے بس دیکھتا ہے تو اپنے حواس کھونے لگتا ہے۔ زندگی سے بڑھ کر اسے موت کی تمنا ہونے لگتی ہے۔

''ہائے ابا میاں۔'' تمت بیکل سی ہوگئی۔ اس سے بڑھ کر برداشت کی تاب اس میں نہیں تھی۔ غم و اندوہ کے جذبات سے وہ مغلوب سی ہوگئی۔ غیر ارادی طور پر ہی وہ کھڑکی سے اٹھی۔ بے اختیار اس کے قدم اٹھتے گئے۔ اس دروازے کی طرف جہاں سے وہ دبے پاؤں جا کر کئی بار پلٹ آئی تھی۔ لیکن اب کوئی اندیشہ اس کا راستہ نہ روک سکا۔ کوئی خیال اسے سہا نہیں سکا۔ کسی خوف نے اس کے پیر نہیں پکڑے۔ اندرونی کشش سے وہ بے حال سی ہوگئی۔ اس نے پردہ ہٹایا۔

"ابا میاں!!!" اس ایک لفظ میں ہی پیار کے سوتے امنڈتے تھے۔ صمدانی صاحب نے چونک کر دیکھا۔ ان کے کان اب تک اس درد سے لبریز' اپنائیت سے چھلکتی ہوئی آواز سے ناآشنا تھے۔ یہ صورت بھی تو شاید انہوں نے پہلی بار دیکھی تھی۔ اگر وہ ابا میاں نہ کہتی تو انہیں شاید یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ وہ ان کی اپنی بیٹی ہے۔ اس کا نام اب تک ان کے ذہن میں نہیں آرہا تھا لیکن نہ جانے انہیں کیوں معلوم ہو رہا تھا جیسے ان کے دل پر چھائے ہوئے غم کے گھمبیر بادل اس اک آواز سے ہی چھٹ گئے ہیں۔ مایوسیوں کے تاریک اندھیروں میں بھی یہ آواز اک کرن بن کر چمک گئی تھی۔ وہ تیزی سے ان کے پلنگ تک آگئی۔

"ابا میاں پانی چاہئے آپ کو۔" اس نے بے صبری سے پوچھا اور گلاس اٹھا کر ان کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے حیرت سے اس کے معصوم اور متفکر چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آئے آنسو ڈھلک ڈھلک کر اس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے لیکن وہ ان سے بے خبر بڑی مشتاق نگاہوں سے ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کبھی تھوڑا سا جھک جاتی تھی اور کبھی سیدھی کھڑی ہو جاتی تھی۔

صمدانی صاحب کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس سے کیا کہیں۔ وہی جوان کی بیٹی تھی جس کو نہ جانے کیسے پتہ چل گیا تھا کہ انہیں پیاس محسوس ہو رہی ہے۔ اس نے مشاق نرسوں کی طرح ان کا سر اٹھایا اور دو تکیے ان کے پیچھے رکھ دیئے پھر پانی کا گلاس ان کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ صمدانی صاحب کو محسوس ہوا جیسے آب حیات بوند بوند ان کے حلق میں اتر رہا ہے۔ وہ ایک ہی سانس میں اس امرت کا آخری قطرہ بھی پی گئے۔ اس نے گلاس ان کے منہ سے ہٹایا تو انہوں نے ایک نگاہ پھر اس کے چہرے پر ڈالی۔ وہ ابھی تک رو رہی تھی لیکن اسے اس کا احساس نہیں تھا۔ صمدانی صاحب کو یوں محسوس ہوا جیسے ان کا دل کٹ کٹ کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہا ہے۔ انہیں خود میں وہ بے پناہ جذبہ امنڈتا ہوا محسوس ہوا جو انسان کو نئی زندگی دے دیتا ہے۔

وہ ان کے پلنگ کی پٹی پہ دونوں ہاتھ رکھے زمین پر بیٹھی تھی جیسے آنکھوں کے راستے ان کی تصویر روح میں اتار لینا چاہتی تھی۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

وہ ہولے ہولے ابا میاں۔ ابا میاں کر رہی تھی۔ صمدانی صاحب کو یوں ہی محسوس ہوا جیسے اب تک ان کی زندگی لاحاصل رہی تھی۔ جس چاہت نے ان کی روح تک کو سرشار کر دیا تھا۔ اب تک وہ کیوں اس سے محروم رہے تھے۔ اک والہانہ جذبہ سے بیقرار ہو کر انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور اس کے بال سہلاتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے بولے۔

"میری بیٹی۔ میری بچی۔"

تمت کیلئے یہ سب کتنا انوکھا تھا۔ وہ جو ابا میاں کو چھپ چھپ کر دیکھتی رہی تھی آج وہ ان سے کتنا قریب تھے۔ دونوں ہاتھوں میں ان کا ہاتھ لے کر اس نے اپنے گال سے بھینچ لیا۔ وہ بار بار اسے چوم رہی تھی۔ صمدانی صاحب کو محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے مفلوج ہاتھ میں جو اتنے دنوں کے علاج کے بعد وہ بمشکل ہلا پاتے تھے ہر لمحے زندگی کی اک نئی رمق سی پیدا ہو رہی تھی۔

"بٹیا اٹھ کر اوپر بیٹھو۔" انہوں نے پیار سے کہا تو وہ پشیمان سی ہو گئی۔ کچھ جھک کر اس نے ان کا ہاتھ چھوڑ دیا اور سہمی سہمی یوں کھڑی ہو گئی جیسے کوئی بہت بڑی غلطی کر بیٹھی ہو۔ صمدانی صاحب نے اشارہ کیا۔ "یہاں بیٹھو نا' میرے پاس۔" وہ جھجکتی جھجکتی ان کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ پھر جلدی سے بولی۔ "ابا میاں آپ نے دوائی لی۔"

"ہاں بیٹے۔" وہ اس کے معصوم چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے جو اس پاکیزہ محبت کی دیوی کا مہربان چہرہ نظر آتا تھا جس کی خوبصورتی اور بھولپن اک باپ کا دل ہی جان سکتا ہے۔ وہ خاموش بیٹھی تھی۔ انہوں نے اشتیاق سے کہا۔ "بیٹا باتیں کرو نا۔" انہیں تمام کائنات مسکراتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ جینے کا حوصلہ ان کے دل میں قوی تر ہو گیا تھا اور وہ جو اتنی کم گو تھی کتنی ہی دیر ان سے یہاں وہاں کی باتیں کرتی رہی اور صمدانی صاحب یوں غور سے اس کی باتیں سنتے رہے جیسے وہ کوئی بے حد ضروری انکشاف کر رہی ہے۔

"ابا میاں سر دبا دوں۔" وہ انکار ہی کرتے رہے لیکن ان کی بات سنی ان سنی کر کے نرم نرم ہاتھوں سے ان کا سر دبا رہی تھی۔ طمانیت کی اک انوکھی لہر سے ان کی

آنکھیں خود بخود مندھ گئیں۔

''بیٹی کے اس پیار میں ممتا کی سی ٹھنڈ اور سرور تھا۔ جس میں تمام فکر، تمام سوچیں، چبھتے ہوئے دکھ اور غم گھل مل جاتے ہیں۔ اب سے کچھ دیر پہلے جو وہ موت کی آرزو کر رہے تھے۔ اب جینے کی تمنا دل میں کلیوں کی طرح چٹک رہی تھی۔ وہ اس کے نرم گرم ہاتھوں کا لمس اس طرح محسوس کر رہے تھے جیسے رستے زخموں پر کوئی مرہم کے پھاہے رکھ رہا ہو اور پھر اک طویل عرصے کے بعد ایک میٹھی نیند کے مزے لینے لگے۔ تمت نے ہاتھ روک لئے۔ ان کی چادر ٹھیک کی پھر کتنی ہی دیر ان کے پلنگ کے پاس کھڑی ان کی طرف دیکھتی رہی۔ اتنے اچھے ابا میاں کے چہرے کو بیماری نے کمہلا دیا تھا۔ مصروفیت ہی جن کی زندگی تھی۔ وہ اس طرح بے بس سے لیٹے تھے۔ ان کی محبت ان کی توجہ پا کر وہ کتنی مسرور ہوگئی تھی۔ آج اسے دنیا کی ہر خوشی مل گئی تھی۔ ان کے بھاری ہاتھ کا مشفق سا لمس اسے اب تک اپنے بالوں میں محسوس ہوتا تھا۔ خوشی سے وہ سرشار سی ہو رہی تھی۔ عقیدت سے اس کی آنکھیں چھلک چھلک جاتی تھیں۔

کچھ سوچتی ہوئی سی وہ راہداری میں چلی جا رہی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ اب بھی رو رہی تھی۔ اس کا دل خوشی سے لبریز تھا لیکن اس خوشی میں ابا میاں کی بیماری ان کی معذوری کا غم بھی گھلا ہوا تھا۔ جو اس کی آنکھوں کے رستے آنسو بن بن کر بہہ رہا تھا۔

''اے لڑکی۔'' پیچھے سے کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ڈر کے مارے اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ پلٹ کر اس نے دیکھا جواد تھا۔ جواد نے راہداری کے ملگجے سے اجالے میں اس کی طرف غور سے دیکھا اس کے سانولے چہرے پر اک غیر معمولی چمک تھی لیکن اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور گال بھیگے تھے۔ وہ جلدی جلدی نیچے تکتے ہوئے دوپٹے سے اپنی آنکھیں خشک کرنے لگی۔

''کیا ہوا؟'' وہ حیران ہوا۔ ''کیوں رو رہی ہو۔''

تمت کو کچھ نہیں سوجھا کہ کیا کہے۔ یونہی ہونقوں کی طرح اس کی طرف دیکھتی گئی۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے بڑے ہمدردانہ لہجے میں پھر پوچھا۔

''ابا میاں۔'' الفاظ اس کے حلق میں ہی اٹک گئے اور موٹے موٹے شفاف آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔

''کیا ہوا انکل کو؟'' وہ گھبرا کر ان کے کمرے کی طرف پلٹا تو اپنی غلطی پر وہ پشیمان سی ہوئی۔ جلدی سے بڑھ کر اس کا بازو پکڑا۔ ''کچھ نہیں۔ وہ تو سو رہے ہیں۔''

''پھر تم کیوں رو رہی ہو؟'' وہ جھنجلایا تو تمت سہم گئی۔ اسے مجرموں کی طرح سر جھکائے دیکھ کر جواد خود ہی ملائمت سے بولا۔ ''تم کیوں رو رہی ہو۔ کسی نے کچھ کہا ہے؟''

اس نے معصومیت سے سر اٹھایا اور سادگی سے کہا۔ ''ابا میاں اتنے بیمار جو ہیں۔ میں اس لئے رو رہی ہوں۔''

''تف ہے تمہاری اوقات پر۔'' جواد نے دونوں ہاتھوں سے اس کے بال کھینچے۔ ''یہ حال ہے ڈاکٹر صاحبہ کا... صورت دیکھی ہے اپنی۔''

وہ سراسیمہ سی ہوگئی۔ اٹکتی ہوئی بولی۔ ''جن کی صورت بری ہو وہ ڈاکٹر نہیں بن سکتے؟''

ظاہر ہے مریضوں کا علاج کرنا ہوتا ہے۔ انہیں ڈرانا تو نہیں ہوتا نا۔'' جواد بھی اسے چھیڑنے کے موڈ میں تھا۔ وہ ایک لمحے کو چکرا سی گئی۔ اس کا چہرہ اندرونی کرب سے دھندلا گیا پھر کچھ تذبذب سی ہو کر بولی۔ ''آپ بھی یہی کہتے ہیں۔''

''کیوں میری آنکھیں نہیں ہیں کیا۔'' جواد نے شرارت سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے کہا۔

لیکن وہ اس کی طرف دیکھ ہی کب رہی تھی۔ جو سمجھ جاتی کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔ چند لمحے وہ متاسف سی کھڑی رہی پھر انگوٹھا چوستی ہوئی پلٹ کر چل دی۔ جواد چند لمحوں تک اس کی بے ربط چال دیکھتا رہا پھر پکارا۔ ''تمت!!'' لیکن وہ اس طرح چلی جاتی تھی جیسے سنا ہی نہ ہو۔ اس نے پھر بلند آواز میں پکارا۔ ''تمت!!''

تو اس نے مڑ کر اجنبی سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ

بھرتا اس کے قریب چلا آیا۔ ''تمو کی بچی تم بالکل فیل ہو۔'' جواد نے اس کی ننھی سی ناک مروڑ دی۔

''اتنے دنوں سے جو مغز ماری تمہارے ساتھ کرتا رہا ہوں یہ اثر ہوا ہے تمہیں۔''

''جی......'' وہ خوفزدہ ہوگئی۔

''جی کی کچھ لگتیں تمہیں سمجھایا نہیں تھا میں نے کہ صورت کو تمہیں کبھی مسئلہ نہیں بنانا۔ چاہے کوئی کچھ کہتا رہے اور تم بیوقوف۔ میرا ہی کہا سچ مان لیا...... ہیں نکمی۔''

وہ حیرت سے منہ کھولے اس کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ ''تمہیں میری باتیں یاد نہیں......'' اس کے لہجے میں مصنوعی ناراضگی اور اپنائیت بھرا گلہ تھا۔

''اسی لئے تو میں کہہ رہی تھی۔'' وہ جھجک کر خاموش ہوگئی۔

''ہوں! ہوں۔'' کیا کہہ رہی تھیں۔ اس نے ہمت بندھائی۔

''میں...... میں کہہ رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہ باتیں جھوٹ ہیں یا وہ باتیں۔''

''پھر......؟'' جواد نے پوچھا۔ ''پھر میں ہوں جو اتنی بری۔''

''پھر وہی بات۔'' جواد نے مارنے کو ہاتھ اٹھایا تو وہ سچ مچ خوفزدہ ہوگئی۔ جواد نے اس کے بال بکھیر دیئے۔ اور بولا۔ ''تمہیں میری بات پر یقین کرنا چاہئے۔ تم بالکل بدصورت نہیں ہو۔''

وہ اب کچھ سوچ رہی تھی۔ جواد کو اس کی سادگی پر پیار آ گیا۔ کسی اور لڑکی سے وہ یہ سب کچھ کہتا تو اس کے گالوں پر شفق سی پھولنے لگتی۔ اس کی جھکتی شرمیلی نگاہیں' ان گنت فسانے کہہ جاتیں لیکن تمت کا چہرہ ایسے تاثرات سے یکسر خالی تھا۔ جواد نے والہانہ انداز میں اس کے ہاتھ پکڑ لئے۔

''تمت نے اک لمحے کو اس کی آنکھوں میں دیکھا جیسے یقین کر رہی ہو کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے حقیقت ہے اور پھر کچھ بے یقینی کے سے انداز میں سادگی سے بولی۔

''اچھا۔''

ڈاکٹر کو کافی اچنبھا ہوا کہ چند ہی روز میں صمدانی صاحب پہلے کی نسبت تیزی سے صحت یاب ہو رہے تھے۔ وہ پہلی سی پژمردگی اور مایوسی بھی اب کم ہوگئی تھی۔ تمت ڈاکٹر سے ان کے متعلق ہدایات لیتی رہتی تھی۔ جب بھی اسے موقع ملتا اور کوئی آس پاس نہ ہوتا تو وہ ابا میاں کے کمرے میں جا پہنچتی اور کتنی ہی دیر ان سے باتیں کرتی رہتی۔ وہ ڈاکٹر کی حوصلہ افزا باتوں سے بہت خوش تھی۔

صمدانی صاحب سوچتے خوشیوں کی یہ ننھی سی شہزادی اب تک کیوں ان کی نگاہوں سے اوجھل رہی تھی۔ وہ اب تک بیٹے کی تمنا میں سلگتے رہے تھے۔ سانولی سلونی سی یہ بیٹی جوان سے ذرہ بھر بھی مماثل نہیں تھی لیکن انہیں اپنے دل کا ٹکڑا معلوم ہوتی تھی۔

☆......☆......☆

وہ الصبح ابھی پوری طرح بیدار بھی نہیں ہو پاتے تھے کہ وہ چپکے چپکے آتی اور ہولے سے ان پر پھونک مارتی پھر گلدان میں نئے پھول سجاتی' میز پر اخبار بھی رکھ جاتی۔ ان کی چادر ٹھیک کرتی۔ وہ سب کام اتنی خاموشی سے کرتی اور ان کے کمرے سے نکل جاتی پھر تمام دن اس کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ سہ پہر کو وہ کالج سے آتی تو یونیفارم اتارے بغیر ہی ان کے کمرے میں جھانکتی۔ اس کے تھکے تھکے سے چہرے پر اک مہربان مسکراہٹ دوڑ جاتی اور دیر تک ان کا حال پوچھتی رہتی۔ صمدانی صاحب کو وہ صحت کی مہربان دیوی لگتی۔ اس کے آ جانے سے انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے ان میں زندگی عود کر آئی ہے۔

"ابا میاں۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں کہتی۔ تو صمدانی صاحب کا دل کھل اٹھتا۔ وہ اتنی ساری بیٹیوں کے باپ تھے لیکن کبھی کسی نے انہیں اس طرح مخاطب نہیں کیا تھا۔ دوسری بیٹیاں تو ضرورت کے تحت کمرے میں آتیں اور ایسی اکڑی سی رہتیں۔ ذرا کی ذرا ٹھہرتیں اور جلد سے جلد جانے کی کوشش کرتیں لیکن تمت ان سب سے مختلف کیوں تھی۔ اسے بھی تو انہوں نے کبھی پیار سے نہیں بلایا تھا لیکن یونہی معلوم ہوتا جیسے وہ ان کی اکلوتی بیٹی ہے۔ وہ اس کے ہونٹوں سے "ابا میاں" سننے کے منتظر رہتے تھے۔ اس ایک لفظ میں وہ کتنی مٹھاس بھر دیتی تھی۔ ان کی طویل بیماری نے سب کو اکتا دیا تھا لیکن وہ ان کی تیمارداری کرتے ہوئے کتنی ہشاش بشاش' کتنی مسرور رہتی تھی۔

"ابا میاں۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ ورزش بتائی ہے وہ کہہ رہے تھے کہ اس سے بہت فرق پڑتا ہے۔" وہ مسکرا کر خاموش ہو جاتے۔ تو وہ ڈرتے ڈرتے کہتی۔ "ابا میاں میری بات مانیں نا۔"

"اچھا بیٹا مانیں گے۔ مانیں گے۔" وہ کہتے تو تمت خوش ہو جاتی اور خوشی سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے ان کی جانب دیکھتی ہوئی پلکیں جھپکتی جاتی۔ پھر ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی جاتی۔ نہیں تو باورچی خانے میں گھسی ہوئی ان کے پسند کی چیزیں بناتی۔ وہ ہر بات سے غافل ہو گئی تھی۔ اس کیلئے سب کچھ ابا میاں ہی تھے۔ ان کی توجہ پا کر' ان کی خدمت کر کے وہ کتنی مسرور ہوتی تھی۔ ہر وقت اپنے آپ میں مگن رہتی تھی۔ دوسرے لوگ بھی اب ابا میاں کی طرف سے بے فکر ہو گئے تھے۔

کبھی جواد سے اچانک سامنا ہو جاتا تو وہ زبردستی اس کو روک لیتا۔ "ہوں تو جناب آپ سے بات کرنے کیلئے بھی پہلے اپوائنٹ منٹ لینی پڑے گی۔"

"نہیں تو۔" وہ سراسیمہ سی ہو کر کہتی۔

"تو پھر کہاں غائب رہتی ہو جو زیارت ہی نہیں ہوتی۔"

"میں تو ابا میاں۔"

"ابا میاں۔" وہ اس کی نقل اتارتا۔ "تو پھر ہم بھی ابا میاں بنیں کہ لمبے لمبے لیٹ جائیں۔ جو ڈاکٹر صاحبہ ہماری جانب بھی توجہ کریں۔"

وہ پشیمان سی ہو جاتی۔ "ہائے نہیں۔" وہ پلکیں جھپکتی۔ "آپ کیوں بیمار ہوں۔"

"تو پھر کیا کریں۔" وہ برا سا منہ بناتا۔

"کیوں؟" وہ سادگی سے پوچھتی۔

"اوہو...... بھئی تمہارے مزاج جو نہیں ملتے۔"

"مجھے کالج میں بھی دیر ہو جاتی ہے اور پھر ابا میاں۔" وہ پھر اداس ہو جاتی۔

"کمال ہے بھئی کیا فائدہ ہے تمہارے آدھ پون ڈاکٹر ہونے کا کہ تمہارے ابا میاں بستر کے ہو کر رہ گئے۔"

"وہ سچ مچ روہانسی ہو جاتی اور متاسف سی ہو کر کہتی۔ "کیا فائدہ؟"

وہ اس کے اداس چہرے کو ایک بار دیکھتا اور اس کی ہمت بندھاتا۔ "ہے کہ نہیں بیوقوف۔ ابھی کل ہی تو" ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ وہ تیزی سے صحت یاب ہو رہے ہیں ورنہ فالج کا تو تمہیں پتہ ہی ہے۔"

''لیکن ! میں چاہتی ہوں کہ ابا میاں بالکل ٹھیک ہو جائیں۔ پہلے کی طرح بالکل ٹھیک میں تو اتنی دعائیں مانگتی ہوں۔'' وہ خلوص سے کہتی۔

''ہوں۔'' وہ متاثر ہو کر کہتا۔ ''تم کسی اور کے لئے بھی دعا مانگتی ہو۔''

''سب کیلئے مانگتی ہوں۔'' وہ پوری سچائی سے کہتی۔

''میرے لیے بھی۔''

''آپ کیلئے بھی۔''

''کیا ...؟'' جواد اشتیاق سے پوچھتا اور معنی خیز نگاہوں سے آنکھوں میں دیکھتا۔ جیسے اس کے دل کی بات لینا چاہتا ہو۔

''آپ کی ریسرچ مکمل ہو جائے۔ آپ ڈاکٹریٹ کر لیں۔''

جواد اس کی سادگی پر جھنجھلا جاتا۔

☆......☆......☆

اصغری خالہ بدحواسی میں بھاگتی ہوئی اندر آئیں۔ صحن میں بیٹھی ہوئی اماں بی گھبرا اٹھیں۔ وہ نڈھال سی ہو کر ان کے گلے سے لگ گئیں اور بلند آواز میں رونے لگیں۔ سب گھبرا کے اپنے اپنے کمروں سے لپکے چلے آئے۔ صحن میں انہیں یوں اماں بی کے گلے لگ کر جھکس پھکوں روتے دیکھا تو سب کے دل دھک سے رہ گئے۔ انجم کا اپنا دل ہول رہا تھا۔ لیکن انہیں تسلی دیتے ہوئے الگ کرنے لگی۔ انہوں نے اماں بی کو چھوڑا تو انجم کو گلے سے لگا لیا۔ 'ہائے بیٹی یہ کیا اندھیر ہو گیا ہمارے ساتھ۔''

''اصغری ہوش کرو۔'' اماں بی کا کلیجہ حلق میں آ رہا تھا۔ بڑی دقتوں سے کہیں انہیں سنبھالا دیا تو انہوں نے جو کچھ بتایا اسے سن کر پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ عمران بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ سخت چوٹیں آئی تھیں اور حالت خطرے میں تھی۔ انجم کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ اس کے خوابوں کے محل چکنا چور ہو گئے۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ سپنے یوں بچ بچ کر بکھریں گے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اماں بی الگ پریشان تھیں۔ بیٹی کا مستقبل سولی پہ اٹکا تھا۔ قسمت ان کی بے بسی پر سنگدلی سے مسکرا رہی تھی۔

دعائیں مانگ مانگ کے ان کے لب خشک ہو گئے۔ ہر لمحہ زندگی اور موت کا

سوال بن گیا۔ آنے والے وقت سے نگاہیں چار کرنے کا انہیں حوصلہ نہ تھا۔ دلوں کی دھڑکنیں جیسے منجمد ہو کر رہ گئی تھیں۔ انجم تو جیسے گم سم ہی ہو گئی تھی۔ زندگی کی یہ بھیک وہ کس سے مانگے۔ گرم سانسوں کی یہ مہلت کس سے طلب کرے۔ تمت کو تو اک پل چین نہیں تھا۔ وہ تو ہسپتال کی ہی ہو کر رہ گئی تھی۔ انجم آپا کی خوشیاں انہیں کہاں سے لا دے۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ خود سب غم جھیل کر خوشیاں ان کی جھولی میں ڈال دے۔

☆......☆......☆

پتہ نہیں کس کی دعائیں کس کی التجائیں انہیں موت کے منہ سے کھینچ لائی تھیں۔ اب ان کی حالت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ وہ آہستہ آہستہ صحت یاب ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر اس کی طرف سے مطمئن تھے لیکن انہوں نے جواد کو اتنا بتا دیا تھا کہ پٹیاں کھلنے پر اس کی بینائی سے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔

دل میں اک اندیشہ سا گھر کر گیا تھا کہ آنے والا وقت نہ جانے کیا منظر دکھلائے گا لیکن پھر بھی اک امید تھی۔ اک آس تھی جو مایوسی کے اندھیروں میں بھی اجالے کی کرن بن جاتی تھی۔ سب کی آنکھیں اسی جانب لگی تھیں۔ سب کے دل اسی میں اٹکے تھے اور وہی ہوا جس کا تصور بھی قیامت سے کم نہ تھا۔ لیکن اب وہ حقیقت کے روپ میں نظر آ رہی تھیں۔ اصغری خالہ پچھاڑیں مارنے لگیں۔ اماں بی نے سر پیٹ لیا۔ انجم گنگ ہو گئی۔

عمران بھائی چیخے۔ ''امی مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا۔ امی آپ کہاں ہیں میرے قریب کیوں نہیں آ جاتیں۔''

''میرے چاند۔'' اصغری خالہ نے ان کا چہرہ ہاتھوں میں لیا اور دیوانہ وار چومنے لگیں۔ عمران بھائی نے ان کے چہرے کو ٹٹولا جو آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا اور بے قراری سے بولے۔ ''امی آپ کیوں رو رہی ہیں؟''

☆......☆......☆

اسی صدمے نے تو انجم کی ساری زندگی چھین لی تھی۔ عمران کی روشن آنکھیں تاریک کیا ہوئیں کہ اس کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ سپنوں کی مالا ٹوٹ کر آنسوؤں میں ڈھل

گئی تھی۔ چاند گہنا گیا تھا۔ عمران کے خوبصورت چہرے پر اس کی اندھی آنکھیں داغ بن گئی تھیں۔ وہ کس سے فریاد کرے کس کو اپنا دکھ سنائے۔ اس نے اماں بی کے رویے میں بھی تبدیلی محسوس کر لی تھی۔ عمران بھی ہوسٹل میں ہی تھا لیکن اماں بی نے جانا بہت کم کر دیا تھا۔ اصغری خالہ آئیں تو ان سے بھی اوپر دل سے ملتیں۔ انجم کو تو انہوں نے عمران کے نزدیک پھٹکنے نہیں دیا۔ انجم تو جیسے اک دوراہے پہ کھڑی تھی۔ دونوں راستے نازک تھے۔ دونوں راستے مصائب پر تھے۔

اماں بی کے جلال کا سامنا بھی دشوار تھا اور عمران کا ہاتھ تھام لیتی تو ہمیشہ کیلئے تاریکی مقدر بن جاتی پھر اسے عمران کے وہ وعدے' اس کی چاہت' جحت بھری باتیں یاد آتیں لیکن اب وہ خوبصورت ہنستا' کھیلتا عمران نہیں تھا۔ اب تو وہ ایک اندھا تھا۔ وہ کیا کرے تفکرات نے اسے چکرا دیا تھا۔ کبھی اس کے دل میں محبت کی چنگاری بھڑک اٹھتی' کبھی اس کے اندر کی عورت بیدار ہو جاتی جو تحفظ کی خواہشمند تھی۔ عمران کے ساتھ چلتی تو اپاہج شوہر کے ساتھ زندگی کی راہوں میں بہت پیچھے رہ جاتی۔ جو خوبصورت سمارٹ جیون ساتھی کی رفاقت میں حاصل ہوتا ہے۔

خیالات کے بھنور میں وہ ڈوبتی ابھرتی رہتی تھی لیکن ساحل کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہوسٹل میں عمران نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا تھا۔ ''انجم یہ سب کیا ہو گیا ہے؟ کہیں میں تمہیں کھو تو نہیں رہا؟''

تو وہ سسک سسک کر روتی رہی تھی۔ ایک لفظ بھی اس کے ہونٹوں سے نہیں نکلا تھا۔ ایک بار بھی اس نے عمران کی بے نور آنکھوں میں نہیں دیکھا تھا۔

اماں بی کیلئے تو یہ سانحہ ایک زلزلہ ہی ثابت ہوا تھا۔ سارے منصوبے خاک میں مل گئے تھے۔ پہلے ہی صمدانی صاحب کی طویل بیماری نے انہیں فکر سے آدھا کر دیا تھا۔ چار جوان لڑکیوں کے بوجھ نے راتوں کی نیند حرام کر دی تھی۔ عمران کی معذوری نے انہیں دہلا کے رکھ دیا تھا۔ اصغری خالہ بھی ڈرتے ڈرتے کئی بار پوچھ چکی تھیں کہیں وہ عمران کو بھلا تو نہیں بیٹھیں۔

لیکن وہ اپنی ہیرا سی بیٹی کو کس طرح اپاہج سے بیاہ دیتیں۔ اصغری خالہ ہر وقت روتی رہتیں۔ اندیشوں سے لرزتی رہتیں۔ اور ان سے اپنے بیٹے کی خوشیوں کی

بھیک مانگتیں۔ اب کیا ہوگا وہ لرز کر سوچتیں۔ انجم سے پوچھنا تو وہ ضروری سمجھتی ہی نہیں تھیں۔ وہ ناسمجھ لڑکی پختہ فیصلہ کر ہی کہاں سکتی تھی۔

انہی دنوں نازی کیلئے ایک اچھا رشتہ آ رہا تھا۔ اندر ہی اندر انہوں نے انجم کیلئے بات پکی کر لی تھی۔ اصغری خالہ کو ایک دن انہوں نے اپنا فیصلہ سنا ہی دیا۔ ہاں وہ اس سے بڑھ کر قربانی کیا دے سکتی تھی۔ اس سے زیادہ رعایت تو ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ انجم کی جگہ وہ عمران کو تمت کا ہاتھ دینے کو تیار تھیں۔ تمت کی معمولی شکل وصورت سے وہ خاصی پریشان رہتی تھیں اور پھر اتنی خوبصورت بہنوں کے ہوتے ہوئے اس کو کون پسند کرتا۔

یہ موقع اچھا تھا۔ اب اصغری خالہ کا دکھ بھی تو ان سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اصغری خالہ کو تو اس حادثے نے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اسی کو غنیمت سمجھ کر خاموش ہو گئیں۔ اب ان کا بیٹا بھی تو پہلے جیسا ہیرا نہیں تھا جو اس کی قیمت بھی ویسی ہی ملتی۔ اب تو تمت جیسی معمولی شکل وصورت کی لڑکی ہی اس کا مول ہو سکتی تھی۔

اماں بی کا خیال تھا کہ وہ ڈاکٹر بن رہی ہے کسی قابل ہو جائے گی۔ تو شوہر کو سنبھال لے گی۔ اس کا علاج بھی کرتی رہے گی۔ ویسے بھی وہ بیماروں میں بہت دلچسپی لیتی تھی پھر عمران کی آنکھیں ٹھیک ہونے سے متعلق ڈاکٹر پرامید تھے اور اصغری خالہ کی حالت اتنی نازک تھی کہ انہیں بالکل صاف جواب نہیں دیا جا سکتا تھا۔

☆......☆......☆

تمت نے سنا تو سکتے میں رہ گئی۔ نہ اس سے کسی نے کچھ کہا' نہ کچھ سنا اور یہ فیصلہ سنا دیا۔ اس نے کبھی اس انداز میں سوچا ہی نہیں تھا اور پھر اسے یہ خیال آتا بھی تو کیسے بچپن سے اب تک وہ ہزاروں بار سنتی آئی تھی کہ اسے کس کے سر منڈھا جائے گا۔ اسے کون بیاہ لے جائے گا۔ اسی لئے تو اس نے کبھی یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ کوئی اس کو بیاہنے بھی آ سکتا ہے۔ وہ اس قابل ہی کب تھی کہ کسی کی جحت کی حقدار ہو جاتی۔ جحت کا مزہ اس نے بہت کم چکھا تھا۔ پیار اس کی زندگی میں ناپید تھا۔

وہ محبت کے اس پہلو کی طرف کبھی متوجہ ہی نہیں ہوئی تھی۔ کالج کی لڑکیاں ہزار باتیں کرتیں لیکن اس نے اپنے متعلق اس طرح کبھی نہیں سوچا تھا۔ پھر اسے انجم

آپا پر بڑی حیرت ہوئی کہ انہوں نے خاموشی سے یہ فیصلہ کیسے مان لیا تھا۔ جیسے بہت خوش ہوں۔ اسے عمران بھائی پر کتنا ترس آتا تھا۔ اسے ان کی باتیں یاد آتیں تو وہ روہانسی ہو جاتی۔ وہ انجم آپا سے کتنا پیار کرتے تھے لیکن انجم آپا کتنی جلد بدل گئی تھیں۔

لیکن اماں بی سے وہ کیا کہتی اس میں اتنی ہمت ہی کب تھی کہ وہ کسی بات کیلئے انکار کرتی۔ وہ اپنی رائے کا اظہار کرتی اور کچھ کہتی بھی تو اس کی سنتا ہی کون تھا۔ وہ ذری ذری سی سہمی لڑکی' بھلا اماں بی سے کیا کہتی۔ گڑیا ان فیصلوں سے جیسے بہت خوش تھی۔ اس نے تو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جوڑی اچھی بن رہی ہے۔ بس کوئی نیکی ہی کام آ گئی ورنہ تو تمت بی عمر بھر اپنے جیسے دولہا کی راہ ہی تکا کرتیں اور پھر ڈاکٹر جو بن رہی ہے۔ ویسے بھی بڑی اماں کی تیمارداری اس نے کی۔ ابا میاں کی پٹی سے لگی رہے۔ اب عمران بھائی کی دیکھ بھال بھی یہی کرے گی۔

گڑیا نے تو اس سے بھی صاف کہہ دیا تھا کہ کہیں تم جواد کے چکروں میں نہ رہنا۔ تمہارے ساتھ بات کر لیتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ کل کو تمہیں پرپوز بھی کرے گا۔ اس خوش فہمی میں بھی نہ رہنا کہ تم ڈاکٹر بن کر کچھ اور ہو جاؤ گی۔ مرد تو حسن پر جان دیتے ہیں۔ تمہیں خود ہی معلوم ہونا چاہئے وہ اتنا خوبصورت' اتنا سمارٹ بھلا تم اس کے ساتھ کیا لگو گی۔'' اور وہ بھی جواد کو محض اپنا ہمدرد ہی سمجھتی تھی جو اس پر ترس کھاتا تھا۔ وہ جو گھر بھر میں نظر انداز کی جاتی تھی تو اس کا دل رکھنے کو وہ اس کے ساتھ بات کر لیتا تھا لیکن اپنی بساط سے بڑھ کر تو اس نے کبھی جواد کے ساتھ توقعات وابستہ ہی نہیں کی تھیں۔ وہ 'اتنا خوبصورت' سمارٹ اور خوش پوش لڑکا تھا وہ اس کے متعلق ایسا سوچ ہی کب سکتی تھی۔

ابا میاں نے بھی اس عجیب و غریب فیصلے پر حیرت کا اظہار کیا لیکن اماں بی کے سامنے کس کی پیش جاتی تھی۔ انہوں نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ ''تم بستر پر لیٹے باتیں بنائے جاؤ میں چار جوان لڑکیوں کو کس کے آسرے پر بٹھائے رکھوں۔ اپنے گھر کی ہو جائیں تو جان سے فکر نکلے۔ میں بڑھیا تو جیسے تیسے گوارہ کر لوں گی اور صمدانی صاحب کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ دبی زبان سے احتجاج تو کرتے رہے لیکن اماں بی نے کھری کھری سنا دیں۔'' کبھی لڑکیوں کے سر پر ہاتھ تک

تو پھیرا نہیں۔ تمہیں تو بیٹے کی طلب تھی اب کیوں ایسا محبت کے مارے دم الجھا جاتا ہے۔ پہلے تو بیٹیوں کے باپ نہیں بنتے تھے اب خون کیوں جوش مارنے لگا۔''

جواد نے تمت کو چمن میں جا لیا۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ تنہائی میسر آئے تو وہ تمت سے تو پوچھ دیکھے کہ وہ اس عجیب و غریب فیصلے پر کس طرح سے رضامند ہو گئی تھی۔

تمت اسے دیکھ کر پریشان سی ہو گئی۔ جواد نے برابر بیٹھ کر قلم اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور سنجیدگی سے بولا۔

''تمت گھر میں جو کچھ ہو رہا ہے تم اس سے خوش ہو۔''

تمت خاموشی سے سر جھکائے ہونٹ کاٹتی رہی۔

جواد جھنجلایا۔ ''تمو ..... جواب کیوں نہیں دیتی ہو۔'' تو اس نے یوں سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ کہنے کو رہ ہی کیا گیا ہے۔

''اوہو کتنی بار تم سے کہا ہے کہ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے نہ بیٹھی رہا کرو کبھی زبان بھی ہلایا کرو۔ تم عمران سے شادی کرنے پر رضامند ہو؟''

تمت کچھ خائف سی ہو گئی۔ ڈرتے ڈرتے بولی۔ ''تو پھر میں کیا کروں؟''

''انکار کر دو۔'' جواد نے برجستہ کہا تو وہ ہانپ سی گئی۔ سہم کر بولی۔ ''اور اماں بی۔''

''اماں بی کیا؟ زندگی تمہیں گزارنی ہے کہ اماں بی کو۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ میں نہ کروں؟''

''بالکل۔'' جواد نے کہا۔

''ہاں تو عمران بھائی کیا کریں گے۔'' وہ سچ مچ افسردہ ہو گئی۔

''عمران بھائی اپنی منگیتر سے کریں شادی۔ تم سے کیوں کرتے ہیں۔''

''انجم آپا تو اتنی پیاری ہے نا۔ اور میں میں تو اچھی نہیں نا۔'' جواد نے اس کی آنکھوں میں اک دکھ کی سی لہر تڑپتی دیکھی۔ تو عجلت میں بولا۔ ''کون کہتا ہے تم اچھی نہیں ہو۔''

''سب ہی تو کہتے ہیں۔'' اس نے اس طرح کہا جیسے کہہ رہی ہو کہ آپ کو

اب تک نہیں معلوم۔"

"تمہاری انجم آپا کو ذرا خیال نہیں۔ عمران بھائی کا۔" جواد نے دانت پیسے۔

"وہ اماں سے کیا کہیں۔ ان کی تو فواد بھائی سے بات پکی ہوگئی۔"

"اچھا۔" جواد حیران رہ گیا۔" مجھے خیال بھی نہیں تھا کہ تم سب لوگ اتنے خودغرض ہو۔"

"ہاں ویسے یہ بات تو ہے۔ مجھے بھی عمران بھائی کا بہت افسوس ہوتا ہے۔ بیچارے انجم آپا کو اتنا پسند کرتے تھے اور میں تو ان کو ذرا بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔"

"تم انہیں اچھی بھی نہیں لگتی ہو تو پھر ان سے شادی کرنے کا کیا شوق چرایا ہے تمہیں۔"

"میں تو نہیں کر رہی۔" اس نے گویا اپنی صفائی پیش کی۔"وہ تو اماں بی کر رہی ہیں۔"

"اماں بی اپنی تو نہیں کر رہیں۔ ظاہر ہے کہ تمہاری ہی کر رہی ہیں۔"

"تو پھر۔" تمت کو سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

"ہائے اللہ آپ کو اس طرح تو نہیں کہنا چاہئے۔" اس نے روہانسی ہو کر اس کی بات کاٹی۔

"بہت ہمدردی ہے تمہیں ان سے۔"

"آپ کو نہیں۔" وہ حیران ہوئی۔

"اوہو بھئی ہے کیوں نہیں۔" وہ جھنجھلا گیا۔" لیکن تمہیں بغیر کسی وجہ کے ان کے پلے کیوں باندھا جائے۔"

"اماں بی پریشان رہتی ہیں نا۔ ابا میاں بھی بیمار ہیں اور پھر ہمارا بھائی بھی کوئی نہیں۔ اس لئے وہ کہتی ہیں۔"

"اماں بی کہتی رہیں...... یہ کہتی ہیں...... وہ کہتی ہیں۔ ان کی بات چھوڑو تم۔" جواد نے چڑ کر اس کی بات کاٹی۔" تم مجھے بتاؤ۔" اس نے تمت کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔" تم کیا چاہتی ہو......؟"

تمت نے ہراساں ہو کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ جہاں اسے اک نرالی

چمک نظر آ رہی تھی جس سے وہ اب تک نا آشنا تھی لیکن وہ اسے کوئی معنی بھی نہیں دے سکتی تھی۔

"بولو نا۔" جواد نے پھر پوچھا تو وہ سہم گئی۔ گردن جھکا کر بولی۔"میں تو...... میں تو کچھ بھی نہیں چاہتی۔"

"کیوں تم انسان نہیں ہو؟" جواد نے ڈپٹ کر کہا۔"میری طرف دیکھ کر بات کرو۔" اس نے ایک ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔ وہ ایک دم خوفزدہ ہو گئی۔ اس کے کانپتے ہوئے لب سپید ہو رہے تھے۔ لیکن جواد تو جیسے نرمی سے بات کرنا ہی بھول گیا تھا۔

"تم میری بات کا جواب دی۔" اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ تمت نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی مار کھاتا بچہ ہو۔ بچہ رحم طلب نظروں سے مارنے والے کی طرف دیکھتا ہے لیکن جواد کو نہ جانے کیوں اس پر اس قدر غصہ آ رہا تھا کہ وہ اس کو مارنے سے بھی نہیں چوکتا۔

"میں نے کہا ہے میری بات کا جواب دو۔" اس نے پھر ڈانٹا۔

تو تمت رندھی ہوئی آواز میں بولی۔"کونسی بات؟"

"یہی کہ اگر اماں بی کا دباؤ نہ ہو تو تم عمران سے شادی کرو کہ نہیں۔"

وہ ہکا بکا رہ گئی۔ بوکھلا کر اسی سے پوچھنے لگی۔"کرلوں؟"

جواد کو اس کی بے ساختی پر پیار سا آ گیا۔ گھر کے ماحول نے اسے اس قابل ہی کب چھوڑا تھا کہ وہ اپنی رائے کی اہمیت کو سمجھتی۔ ملائمت سے اس کا ہاتھ تھپتھپا کر بولا۔"تم مجھے بتاؤ تمہارا دل کیا چاہتا ہے۔"

"میں......" اس نے حیرت سے پوچھا۔"ہوں۔" جواد نے ہمت بندھائی اور اک تک اس کے معصوم چہرے کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ جس میں معصومیت کا ایسا پرتو تھا جس میں ریاکاری کی جھلک تک نہیں تھی۔

"ڈرو نہیں شاباش بتاؤ۔" اس نے نرمی سے کہا۔

تو وہ ہٹپٹائی ہوئی سی ڈرتے ڈرتے لجاجت سے بولی۔"آپ...... آپ مجھے بتا دیں نا کہ میں کیا کروں۔"

جواد کو یوں محسوس ہوا جیسے معصومیت اس کے روپ میں ڈھل گئی ہے۔ بچوں کی طرح اس کے گال تھپتھپا کر بولا۔ ''تم بتاؤ نا۔ میں بھلا تمہارے دل کی بات کس طرح سے بتلاؤں۔'' وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر جھجکتی ہوئی بولی۔ ''جواد بھائی قسم ہے میرے دل میں تو کچھ بھی نہیں۔ سچ۔''

''سچ کچھ بھی نہیں۔'' اس نے پوری سچائی سے کہا۔ ''میں سچ کہہ رہی ہوں۔''

جواد نے اس کی آنسوؤں سے چمکتی ہوئی آنکھوں میں جھانکا اور سمجھانے کے انداز میں بولا۔

''تمہیں کون اچھا لگتا ہے۔ جو تمہیں اچھا لگے اسی کے ساتھ تم شادی کرنا۔''

''مجھے تو سب ہی اچھے لگتے ہیں۔'' اس نے سادگی سے کہا۔

جواد اکتا گیا۔ وہ تو اتنی نادان تھی کہ کسی بات کے معنی سمجھ ہی نہیں پاتی تھی۔ پھر بھی ضبط سے بولا۔ ''دیکھو نا تمہیں کسی ایک کا انتخاب تو کرنا ہی ہے۔ اب تم سب کے ساتھ شادی تو نہیں کر سکتیں نا۔'' جواد کے چہرے پر امید وبیم کی اک کشمکش سی تھی۔

تمت کچھ دیر سوچتی رہی پھر ہولے ہولے بولی۔ ''مجھے تھوڑی انتخاب کرنا ہے جو اماں بی کہیں گی وہی کرنا پڑے گا۔''

جواد جھنجلا کر بولا۔ ''تو کرو مرو پھر جو اماں بی کہتی ہیں وہی کرو۔ تمہیں کسی دوسرے کا خیال ہو تو تب ہے نا۔ عمران تم جیسی چڑیل کے ساتھ شادی کئے بغیر تو رہ نہیں سکتے۔'' اس کے تلخ لہجے سے وہ سراسیمہ ہوگئی۔ ''کس کا خیال؟''

''تم بات نہ کرو مجھ سے۔'' وہ غصے میں اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے چل دیا۔

تمت بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ ''پتہ نہیں جواد بھائی کیوں ناراض ہو گئے۔ مجھ سے کوئی بھی بولنا نہیں چاہتا میں ہوں ہی اتنی بری۔'' اس نے دکھ سے سوچا اور گھٹنوں پر سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

گھر بھر میں یہ خبر بم کے دھماکے سے بھی بڑھ کر ہولناک ثابت ہوئی تھی کہ عمران نے تمت سے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ میری آنکھیں نہیں لیکن میرا ذوق تو زندہ ہے۔ انجم کی جگہ میں تمت کو کیونکر

قبول کرلوں۔ گھر کی سب سے بدشکل لڑکی کیا میرے لئے ہی رہ گئی ہے۔ نامعلوم اس کے کان میں یہ بھنک کس طرح سے پڑ گئی تھی ورنہ سب کا منصوبہ تو یہی تھا کہ اسے آخر وقت تک بے خبر رکھا جائے گا۔

لیکن جیسے ہی اسے پتہ چلا وہ ایسا بدکا کہ خاموش ہی نہیں ہوتا تھا۔ انجم سے لے کر خالہ اصغری تک سب کو اس نے بے نقط سنا ڈالی تھیں۔ بڑی مشکل سے اسے سکون کا انجکشن لگایا تو اسے کہیں چین آیا۔ ڈاکٹروں نے منع کر رکھا تھا کہ اس کے سامنے ایسی ویسی بات نہ کی جائے۔

اماں بی نے سنا تو حواس باختہ ہو گئیں۔ انہیں اپنی بے عزتی کا بہت رنج تھا۔ عمران سے بڑھ کر انہوں نے تمت کو کوسنے دیئے کہ نامعلوم یہ کلموہی کس پر گئی ہے۔ پیدا ہوتے ہی مر جاتی تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ خاندان بھر میں جو سبکی ہوئی تھی وہ الگ' کتنے ہی دن وہ تمت کو کوستی رہیں۔

اماں بی کے کوسنے' گڑیا کی زہریلی مسکراہٹیں' خاندان بھر کی باتیں' تمت پاگل سی ہو گئی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنے وجود کو فضا میں تحلیل کر دے۔ سب کی نگاہوں سے دور' کہیں بہت دور چلی جائے کہ ان حقارت آمیز نگاہوں سے وہ چھلنی ہو گئی تھی۔ عمران کے اس انکار نے اسے سب کے طعنوں کا ہدف بنا دیا تھا۔ وہ مر جانا چاہتی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ لینا چاہتی تھی۔ وہ تو روز اول سے ہی ان طعنوں کی عادی تھی۔ لیکن اس سانحے نے اس کی انا کو جگا دیا تھا۔ اس کے پندار کو چور چور کر دیا تھا۔

اس نے جو قربانی دی تھی اماں بی کے کہنے پر اپنا مستقبل داؤ پر لگا دیا تھا لیکن عمران بھائی نے تو اس کی صورت کو جواز بنا کر انکار کیا تھا۔ اس کا وہی زخم چھیڑا تھا جو ناسور تھا۔ اس کی ذہنی حالت عجیب سی ہو گئی تھی۔ ہر بات کی تان اسی پر آ کر ٹوٹتی تھی۔ ہر محفل میں اسی کا تذکرہ تھا۔ موضوع کوئی ہو لیکن اس مسئلے پر بحث کرنا ضروری تھا۔

گڑیا کا خوبصورت چہرہ اور بھی چمکنے لگا تھا۔ اس کے دل کش نقوش زیادہ شوخ ہو گئے تھے۔ اس کے چھپے چھپے سے طنز اس کے دل میں کچوکے لگاتے تھے اسے اپنا سانولا چہرہ اور بھی دھندلا نظر آتا تھا۔ سیدھے سادے نقوش بہت بھدے معلوم

ہوتے تھے۔ وہ زندگی سے بے زار ہوگئی تھی۔ وہ زندگی جو اس کیلئے کچھ بھی نہیں لائی تھی۔ سوائے رسوائیوں کے جو آنسوؤں میں ڈھل ڈھل کر اس کی آنکھوں سے بہے چلی جاتی تھیں۔ کسی کام میں اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ دل کو بہلائے رکھنے کیلئے کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ وہ ہر وقت انگوٹھا چوستی رہتی اور نہ جانے کیا کیا سوچا کرتی۔

جواد بھی تو اس دن سے نہیں آیا تھا۔ سب ہی اس سے ناراض رہتے تھے۔ کوئی بھی تو اس سے خوش نہیں تھا۔ گڑیا نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ''اسے تو اندھے بھی گوارا نہیں کرتے' ظاہر ہے اتنا دل گردہ کوئی کہاں سے لائے۔''

''ابا میاں' میں بہت بری ہوں نا۔'' وہ سسک پڑی۔

''نہیں بیٹا' اس طرح کیوں کہتی ہو۔'' وہ اپنا کانپتا ہاتھ اس کے سر پر رکھتے تو وہ اور بھی شدت سے رو پڑتی اور ہچکیوں کے درمیان نہ جانے کیا کہتی۔ جو صمدانی صاحب کو ذرا بھی سمجھ نہیں آتا۔

☆......☆......☆

اس کے ایک ایک آنسو میں وہ کٹ کٹ کے بہتے رہتے۔ اس کے آنسوؤں سے بھیگے دکھی چہرے کی طرف دیکھ کر سوچتے کہ وہ اتنی بدصورت بھی نہیں جتنا اسے بنا دیا گیا ہے۔ وہ تو سب میں سے پیاری ہے۔ اس کے سانولے چہرے پر ہمدردی کی چمک کتنی بھلی لگتی ہے۔ اس کے سادہ نقوش کتنے بے ضرر اور معصوم نظر آتے ہیں۔ اس کی باتیں کتنی خوبصورت ہیں۔ اس کا دل کتنا پرخلوص ہے لیکن یہاں اب تک کسی نے اسے سمجھا ہی نہیں۔ اس کی یہ بدصورتی اس کی ہر خوبی پر چھا گئی ہے۔ وہ اسے اپنے پاس پلنگ پر بٹھا لیتے اور ہولے ہولے اسے سمجھاتے رہتے لیکن وہ پھر بھی روتی رہتی۔ اس کی زندگی کا نام ہی آنسو تھا جو ہر وقت اس کی آنکھوں سے بہتے۔ اس کی پلکوں پر اٹکے اس کے رخسار بھگوتے تھے۔

ابا میاں کی طبیعت اب زیادہ خراب رہنے لگی تھی۔ جبھی تو اماں بی نے انجم کو جلد از جلد رخصت کرنے کا انتظام شروع کر دیا تھا۔ تمت کو حیرت ہوئی کہ انجم آپا نے ایک بار بھی اماں بی کے فیصلے کے خلاف احتجاج نہیں کیا تھا۔ وہ سارے وعدے فراموش کر کے اماں بی کے حکم پر چپ چاپ دلہن بننے کو تیار ہوگئی تھیں۔

جب اس نے فواد بھائی کو دیکھا تھا تو اسے یقین نہیں آیا تھا کہ یہ انجم آپا کو بیاہنے آئے ہیں وہ تو صورت سے ہی بڑی عمر کے معلوم ہوتے تھے۔ بے حد سنجیدہ' رعب داب والے۔ اماں بی کو تو لڑکی ہی بیاہنی تھی اور پھر مرد کو کون دیکھتا ہے اور اچھی پوزیشن ہو تو عمر کی پروا کسے ہوتی ہے۔ رشتہ داروں کی زبانیں بھی شاندار بڑی اور ہیروں کے جگمگاتے سیٹ دیکھ کر بند ہوگئی تھیں۔ سب انجم کی خوش بختی پر ناز کرتے تھے۔

انجم کو ایک بار تو عمران بھائی ٹوٹ کے یاد آئے لیکن جب اس نے آئینے

میں سات رنگوں میں چمکتے زیورات دیکھے تو فواد کے برابر بیٹھے ہوئے اسے اندھیری دنیا کا باسی عمران ذرا بھی یاد نہیں آیا۔ عمران تو اسے معاشرے میں وہ مقام نہیں دلا سکتا تھا جو فواد کی بیوی بن کر اسے حاصل ہوا تھا۔ ایسے میں وہ اس کی سفید کنپٹیاں بھی بھول جاتی جن پر وہ ہیر کلر استعمال کرتا تھا۔

گڑیا تو کب کی بی اے کر کے گھر بیٹھ رہی تھی اور مکمل طور پر اس کا شادی کا موڈ تھا۔ گویا اپنی باری کے انتظار میں تھی۔ آج کل جواد کے ساتھ بھی اس کی خوب بنتی تھی اور اماں بی کو یہ شگون کچھ اچھا ہی نظر آتا تھا۔ ساتوں کی ساتوں لڑکیاں تو ان کے اعصاب پر بھوت کی طرح سوار تھیں۔ وہ کنارے لگ جاتیں تو انہیں بھی سکھ کا سانس لینا نصیب ہوتا اور جواد بھی اچھا لڑکا تھا۔ کسی کالج میں پڑھاتا تھا۔ کوئی ریسرچ بھی کر رہا تھا۔ خوبصورت تھا اور پھر خاندان کا بکھیڑا بھی نہیں تھا۔

تمت بہت مصروف رہتی تھی اس کا آخری سال تھا۔ زیادہ تر پڑھتی رہتی۔ ہسپتال کے چکر لگتے۔ لائبریری جاتی وہ اس امتحان میں بہت اچھے نمبر لینا چاہتی تھی۔ اس کی زندگی میں کامیابی کا دارومدار اسی پر تھا۔

ہسپتال کسی پروفیسر سے ملنے گئی تو برآمدے سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹک سی گئی۔ ذرا غور سے دیکھا تو پہیوں والی کرسی کی پشت پر سر ٹکائے خلاؤں میں گھورتے ہوئے عمران بھائی ہی تو تھے۔ اماں بی نے سختی سے کہہ رکھا تھا کہ عمران یا اصغری گویا ہمارے لئے مر گئے ہیں، کہیں سامنا بھی ہو جائے تو منہ پھیر لیں لیکن تمت اپنے دکھے ہوئے دل کو سنبھال نہ سکی یہ بھول کر کہ عمران بھائی کی وجہ سے اس کی کتنی بے عزتی ہوئی تھی وہ ان کے قریب چلی آئی۔ آہٹ سن کر وہ چونکے۔ ''امی آپ آ گئیں۔'' انہوں نے ہولے سے کہا تو تمت تڑپ کر رہ گئی۔ ان کی کرسی کے ہتھے پر ہاتھ رکھ کر جھکتی ہوئی بولی۔ ''عمران بھائی یہ تو میں ہوں۔'' وہ یوں چونکے جیسے کسی نے ڈنگ مار دیا ہو پھر ایک دم اس کے ہاتھ ٹٹولنے لگے۔ یکلخت ان کا چہرہ اتر گیا۔ کچھ عجیب سی حسرت سے بولے۔ ''تم انجم تو نہیں۔''

''عمران بھائی میں تمت ہوں۔'' تمت نے آنسو روکتے ہوئے کہا۔

''تمت۔'' انہوں نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں دہرایا اور مشکوک سے ہو کر

بولے۔ ''تم یہاں کیا کرنے آئی ہو؟''

تمت حسب عادت سہم سی گئی۔ رک رک کر بولی تو۔ ''عمران بھائی میں چلی جاؤں۔''

''نہیں تمو......'' انہوں نے بے ساختہ کہا اور اپنا ہاتھ یوں بڑھایا جیسے اس کا ہاتھ تھامنا چاہتے ہوں۔ تمت رک گئی۔ ان کے چہرے پر کرب کے ایسے تاثرات تھے جیسے کسی اندرونی اذیت سے بے حال ہوں۔ پھر ہونٹ کاٹتے ہوئے بولے۔ ''تمت تم باتیں کئے جاؤ تمہاری آواز انجم سے کتنی ملتی ہے۔''

''اچھا۔'' وہ حیران ہوئی اور کافی دیر انہیں تسلیاں دیتی رہی۔ سمجھاتی رہی بالکل پیشہ ور ڈاکٹروں کی سی خوش اخلاقی سے مشورے دیتی رہی اور عمران یوں خاموشی اور حیرانی سے سنتا رہا جیسے وہ کوئی ناسمجھ بچہ ہو۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی بیوقوف سی تمت ہے جسے رونے کے علاوہ کوئی بات نہیں آتی تھی۔ وہی بدصورت سی تمت اتنی خوبصورت باتیں کرتی ہے اسے گمان بھی نہیں تھا۔ اس کے سادہ لہجے سے بے لوث خلوص کی مہک آتی تھی۔ وہ کچھ دیر کیلئے اپنے غم بھول گیا۔ وہ کتنی سادگی سے ان لوگوں کے حالات سنا رہی تھی جو اس سے بھی بڑھ کر معذور تھے لیکن پھر بھی جینے کی آرزو رکھتے تھے۔ رواں دواں زندگی میں اپنے لئے مسرتیں تلاش کر رہے تھے۔

''بٹیا تو یہاں کہاں؟'' اصغری خالہ کی آواز پر وہ تیزی سے پلٹی۔ ''سلام خالہ۔'' وہ عجلت میں ہاتھ ماتھے تک لے گئی۔ انہوں نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''تمہاری ماں نے تو ہم سے ناطہ ہی توڑ لیا۔ کچھ پچھلے رشتوں کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ مصیبت آتی ہے تو سب چھوڑ کنارے لگتے ہیں۔ نہ جانے میرے چاند سے بیٹے کو کس کی نظر کھا گئی۔

''تمت خفیف سی ہو گئی۔ عمران بھائی نے ان کی آواز سن لی تھی۔ ''امی یہ تمت بچاری اتنی دیر سے میرے پاس بیٹھی ہے۔''

''ہاں بیٹا اس کی مہربانی ہے۔ اب تو ہمارے پاس بیٹھنا بھی بڑی بات ہے۔''

تمت نے خجل ہو کر کہا۔ ''نہیں تو خالہ آج کل مصروفیت زیادہ ہے۔ آخری

سال ہے نا میرا اور پھر کوئی کہہ رہا تھا کہ عمران ڈسچارج ہو گئے ہیں۔"

"نہیں تمت ڈاکٹرز کہہ رہے ہیں کہ اس کی آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی۔ تم بھی دعا کرنا۔ خدا کسی کی سن لے۔ تو میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑے۔ خدایا کوئی میری آنکھیں لے لے اور میرے بچے کو ٹھیک کر دے۔" وہ رو پڑیں۔

تمت متاثر سی ہو گئی۔ گمان بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہ وہی طرار سی خوش مزاج اصغری خالہ ہیں جنہیں کسی کل چین نہیں پڑتا تھا۔ تمت کی اپنی آنکھیں چھلک گئیں۔ وہ انہیں تسلی دیتی رہی کچھ دیر ان کے ساتھ رہی پھر چلی آئی۔ اصغری خالہ اسے گیٹ تک چھوڑنے آئیں۔

گھر آئی تو فواد بھائی اور انجم آپا کی پارٹی میں جاتے ہوئے راستے میں رک گئے تھے۔ انجم آپا بے حد قیمتی ساڑھی اور چمکتے دمکتے زیورات میں کتنی خوش خوش نظر آتی تھیں۔

تمت کی آنکھوں میں عمران بھائی کی مغموم صورت پھر گئی۔ اس کا جی چاہا کہ ایک بار انجم آپا سے پوچھ کر تو دیکھے کہ انہیں عمران بھائی کبھی یاد نہیں آئے؟

"میرے امتحان ختم ہو گئے۔" اس نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا۔

"تب ہی اتنے دنوں بعد آئی ہو۔" عمران نے کچھ روٹھنے کے انداز میں کہا۔

"ہائے میں پھر بھول گئی۔" اس نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

"کیا؟؟؟" وہ بھی پریشان ہوا۔

"وہ پھول!! پھول؟؟؟ ہاں، پھول نہیں نا لائی، بس بھول ہی گئی۔"

"کیسے پھول، کس کیلئے۔" عمران نے پوچھا۔

"آپ کیلئے۔"

"میرے لئے۔" وہ حیران ہوا۔

"میں ابا میاں کے کمرے میں بھی لگاتی ہوں، پھول اچھے لگتے ہیں نا۔"

عمران اداس سا ہو گیا۔ "اب تو پھولوں کے رنگ بھی بھول گیا ہوں۔ میرے لئے ہر چیز کا نام تاریکی ہے۔"

تمت مغموم سی ہو گئی۔ ڈرتے ڈرتے بولی۔ "آپ انہیں ہاتھوں سے محسوس کریں۔ ان کی خوشبو سے انہیں پہچانیں۔"

"میں نے اتنا کچھ محسوس کیا ہے کہ شاید اب مجھ میں کوئی احساس باقی نہیں رہا۔ اب کوئی چیز میرے لیے اصلیت نہیں رکھتی۔ سب کچھ فریب ہے، ہر چیز سراب ہے۔"

"آپ دل چھوٹا کیوں کرتے ہیں۔ دنیا میں ہر چیز تو فریب نہیں۔ اس میں بہت سی خوبصورت حقیقتیں بھی ہیں۔"

"تمت، تمہاری یہ باتیں مجھے بہلا نہیں سکتیں۔ میں نے حقیقتوں کا مزہ چکھا ہے تلخی کے سوا کچھ نہیں۔"

"آپ بہت مایوسی کی بات کرتے ہیں۔ آپ کو ہمت سے کام لینا چاہئے۔ آپ کیلئے خالہ بچاری اتنی فکر مند رہتی ہیں۔" تمت نے شکوے کے انداز میں کہا۔

"شاید میں انہی کیلئے زندہ ہوں ورنہ۔" بات ادھوری چھوڑ کر وہ اذیت سے ہونٹ کاٹنے لگا۔ اس نے جھک کر اس کی کرسی کے ہتھے پر ہاتھ رکھا۔

"چلئے آپ کو لان تک لے جاؤں۔"

"نہیں تمت، میں بہت تھک گیا ہوں، ابھی میں جواد کے ساتھ لان میں ہی تھا۔"

"جواد بھائی آئے تھے؟؟؟"

"تم نے نہیں دیکھا اسے ابھی یہیں تو تھا۔ شاید چلا گیا ہے۔" عمران نے دائیں بائیں دیکھا۔

تمت نے دیکھا سامنے ہی تو جواد کھڑا تھا۔ سینے پر ہاتھ باندھے بڑے غور سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ تمت گڑبڑا سی گئی۔ وہ زور سے ہنس پڑا۔

"میں دیکھ رہا تھا کہ ان کی توجہ ادھر کب ہوتی ہے۔"

تمت خفیف سی ہو گئی۔ شرمندگی سے گویا ہوئی۔

"میں نے دیکھا نہیں۔"

"میرا خیال ہے میں اتنی چھوٹی سی چیز تو نہیں جو دیکھی بھی نہ جا سکوں۔"

''سچ مچ میں نے آپ کو دیکھا نہیں۔''

''کیوں نہیں دیکھا۔'' جواد اسے تنگ کرنے کو حسب عادت حجت کرنے لگا۔ تمت سٹپٹا گئی۔ پشیمانی سے ہاتھ مسلتی ہوئی بولی۔ ''پتہ نہیں کیوں نہیں دیکھا۔''

''یہ آئیں بائیں شائیں تو کرو نہیں، تمہیں بتانا پڑے گا کہ تم نے کیوں نہیں دیکھا؟'' اسے جان بوجھ کر تنگ کرنے کو وہ کج بحثی پر اتر آیا۔ وہ روہانسی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ عمران ہنس پڑا۔

''یار جواد کیوں اس بے چاری کو تنگ کر رہے ہو۔''

جواد جو ہنسی روکے ہوئے تھا، وہ بھی ہنس پڑا۔ تمت حیران رہ گئی۔ جواد نے اسے یوں ہک بک دیکھا تو اس کا شانہ ہلایا۔ ''ڈاکٹر بننے کو ہو گئیں لیکن یہ تمہارا ڈرنا جھجکنا نہیں گیا۔ بھئی مجھے ڈانٹ کر یہ کیوں نہیں کہتیں کہ اتفاقاً نگاہ نہیں پڑی تو کون سی ایسی قیامت آ گئی۔''

اک محجوب سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھل گئی۔ عمران نے ہنس کر کہا۔

''بھئی تم اس ننھی منی سی لڑکی سے کچھ مت کہا کرو۔''

☆......☆......☆

کافی دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اصغری خالہ بھی آ گئی تھیں۔ عمران کے ڈاکٹر نے کافی اطمینان دلایا۔ اس کے زخم ٹھیک ہو گئے تھے۔ کچھ دنوں میں پلستر بھی اترنے والے تھے۔ اصغری خالہ اپنی پونجی پانی کی طرح بہا رہی تھی کہ بیٹے کے سکھ، اس کی خوشیاں لوٹا سکے اور ممتا کی جھولی خالی نہیں رہی تھی۔ قدرت آہستہ آہستہ اسے مرادوں سے بھر رہی تھی۔

وہ گھر جانے کیلئے اٹھی تو جواد بھی اس کے ہمراہ تھا۔ ''اچھا تو تم ہاسپٹل کے چکر اس لئے لگاتی ہو، تبھی گھر میں نہیں ٹکتیں، جب پوچھو، جی ہاسپٹل گئی ہیں۔'' جواد نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بھونچکی رہ گئی۔ ڈرتے ڈرتے بولی۔ ''نہیں مجھے تو ڈاکٹر شائستہ کے ساتھ کام بھی تھا۔''

''اچھا تو عمران ڈاکٹر شائستہ ہیں۔''

''نہیں وہ تو نہیں۔''

''اور جو اماں بی کو پتہ چل جائے کہ تم عمران کی مزاج پرسی کرتی پھرتی ہو تو ٹھکائی ہو کہ نہیں تمہاری۔''

وہ ایک دم ہراساں ہو گئی۔ بے ساختہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر لجاجت سے بولی۔ ''جواد بھائی آپ کو قسم ہے آپ اماں بی کو نہیں بتائیں۔''

''کیوں بھئی؟'' اس نے تجاہل عارفانہ سے کہا۔

''انہوں نے منع کیا ہوا ہے نا۔''

''اچھا تو پھر تم منع کیوں نہیں ہو جاتیں۔''

وہ پشیمان ہو کر بولی۔ ''وہ بے چارے اتنے پریشان ہیں اتنا بڑا حادثہ ہو گیا ان کے ساتھ، تو میں انہیں پوچھوں بھی نہیں۔''

''کیوں، کیا ضروری ہے۔'' جواد نے اسے جانچنے کو پوچھا۔

''ان کا کیا قصور ہے، وہ بے چارے تو اتنے اچھے ہیں۔'' اس نے رسان سے کہا۔

''بہت اچھے لگتے ہیں تمہیں۔'' جواد نے کڑی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اچھے ہیں، آپ کو نہیں اچھے لگتے۔'' اس نے جھجک کر پوچھا۔ جواد نے اس کے سانولے چہرے کی طرف دیکھا جس پر بے ریا خلوص کی اک چمک تھی۔

''اور جو انہوں نے تمہارے لئے انکار کیا تھا۔''

وہ کچھ بوکھلا سی گئی۔ بیکلی سے ہونٹ چباتی رہی۔

جواد اس کی طرف متوجہ رہا۔ وہ اپنے سوال کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا چہرہ اور بھی سنولا گیا۔ ''اتنی بری جو ہوں۔''

''تم میں کیا برائی ہے بھئی۔'' جواد نے سختی سے پوچھا تو وہ خوفزدہ سی ہو گئی۔ مجرموں کی طرح سر جھکا کر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑائی۔

''اتنی تو میں بدشکل ہوں۔''

''اور......؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا رنگ بھی کالا ہے۔''

''اور......؟''

''مجھے کچھ بھی نہیں آتا......؟''

''بس کہ کچھ اور؟'' اس نے پھر پوچھا۔

تمت نے جیسے رٹا رٹایا سبق دہرایا۔ ''اور' اور میں سارے کام بگاڑ دیتی ہوں۔ کوئی کام بھی تو ڈھنگ سے نہیں کر سکتی۔''

''اچھا؟'' اس نے مصنوعی حیرانی سے آنکھیں پھیلائیں تو تمت خفیف سی ہو کر بولی۔ ''آپ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔''

''ظاہر ہے تم جیسی بے وقوف لڑکی کا مذاق نہیں اڑاؤں گا تو کیا کروں گا۔''

تمت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''جس طرح تم عمران کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں تو میں یہی سمجھا تھا کہ اب تمہیں کافی عقل آ گئی ہے۔ لیکن تم تو ویسی کی ویسی ہو' نکمی کہیں گی۔''

''جی!!!'' وہ حیران ہوئی۔

''جی کی کچھ لگتیں' اتنی بڑی ہو گئی ہو' اتنا پڑھ لکھ گئی ہو اور اب تک وہیں کی وہیں۔''

اس نے کچھ کہا نہیں' بس کھڑی اپنے آنچل سے کھیلتی رہی شکل وصورت کی اتنی اہمیت نہیں جتنی تم نے اور تمہارے گھر والوں نے اسے دے رکھی ہے۔ گھر والوں کے رویے سے تم یونہی نروس ہو جاتی ہو تو کوئی نہ کوئی کام خراب ہو جاتا ہے اور تم سمجھتی ہو کہ تم کوئی کام کر ہی نہیں سکتیں۔''

''اچھا......'' وہ بمشکل کہہ سکی۔

''تم نے نوٹ کیا ہو گا کہ جب تم گھر والوں کے سامنے نہیں ہوتیں تو تم زیادہ آزادی سے کام کر سکتی ہو' تم سے کوئی کام خراب نہیں ہوتا۔''

تمت کی آنکھیں ایک لمحے کو چمک سی گئیں۔ ''جواد بھائی گھر میں تو مجھ سے بہت سے کام خراب ہو جاتے ہیں۔''

''کیسی ڈاکٹر ہو تم' تمہیں نفسیاتی مریضوں کے متعلق نہیں پڑھایا گیا۔ تم یہ

طے کر لو کہ شکل وصورت کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہاں اگر تمہارا دل بدصورت ہے۔ اس میں خلوص نہیں' ہمدردی نہیں' کسی کے درد پر تڑپتا نہیں' کسی کی خوشی پر مسرور نہیں ہوتا تو تمہارے لئے مر جانے کا مقام ہے۔'' وہ اس کو ہمیشہ کی طرح سمجھاتا رہا۔ اسے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے کانوں میں کوئی رس گھول رہا ہے۔ اس کے خشک لبوں میں کوئی بوند بوند امرت ٹپکا رہا ہے۔ اسے یونہی محسوس ہوا کہ وہ بھی سب کے جیسی ہے۔ وہ کسی سے مختلف نہیں وہ کسی سے حقیر نہیں۔''

گھر کے نزدیک پہنچ کر تمت نے لجاجت سے کہا۔

''دیکھئے آپ اماں بی کو نہیں بتائیے گا کہ میں' میں۔''

''ارے نہیں بتاتا چندا' ہمیں ابھی ڈاکٹر تمت کی ضرورت ہے۔'' اس نے لاڈ سے اس کا گال چھوا۔ وہ وہیں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اک روپہلی سی چمک اس کے چہرے پر لہرا گئی بے ساختہ بولی۔

''ابھی آپ نے کیا کہا۔''

''کیا؟؟؟'' جواد کو اپنے کہے الفاظ یاد نہیں تھے۔

''آپ نے چندا کہا تھا نا۔'' اس کی آنکھوں میں اک ایسی خوشی کا عکس تھا جیسے کوئی عزیز شے پا لی ہو۔

جواد نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور حیران ہوا کہ وہ کیوں اس قدر مسرور ہے وہ پھر بھی خوش ہوتی ہوئی بولی۔ ''آپ نے چندا کہا نا۔''

جواد کو اور بھی حیرت ہوئی پھر اس کے معصوم چہرے کی طرف دیکھا جو کسی انجانی مسرت سے چمک رہا تھا۔ ''ہاں کہا تو تھا لیکن؟''

''مجھے محسن بھائی کہا کرتے تھے۔'' وہ یونہی بڑی دلکش سی ہلکی ہنس دی۔

''یہ محسن بھائی کون ذات شریف ہیں۔'' جواد کچھ مشکوک سا ہو کر بولا۔

''ہمارے کزن ہیں۔'' اس نے فخر سے کہا۔ ''کبھی نظر تو نہیں آئے۔'' لہجہ متجسس تھا۔

''وہ تو کب کے چلے گئے۔''

''کہاں؟''

''پتہ نہیں۔''

"کیوں پتہ نہیں۔"

"بتا کر جو نہیں گئے۔ جب کبھی آئیں گے تو میں ان سے بہت لڑوں گی۔ وہ مجھے بھی بتا کر نہیں گئے۔" وہ ضدی بچوں کی طرح روٹھی روٹھی سی بولی۔

"چلے کیوں گئے۔" وہ مکمل معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

"بس چلے گئے۔ ان کا دل کیا اور چلے گئے۔"

"تم چھپا رہی ہو۔" نہیں تو وہ گڑبڑا گئی۔

"جھوٹ مت بولو کہ تم نبھا نہیں سکتیں۔"

تمت پشیمان سی ہو کر بولی۔ "دیکھیں نا گھر کی بات ہے۔ اب آپ کو نہیں بتانی چاہئے نا۔"

"اچھا تو تم اتنی سمجھ دار ہو۔" جواد نے اسے چھیڑا۔ تو وہ خاموش ہو گئی۔

"تو وہ تمہیں چندا کہتے تھے۔"

"جی۔" اس کے لہجے میں فخر کی شان تھی۔

"تم کہو تو میں کہا کروں تمہیں چندا۔" جواد نے معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کو اک چپ سی لگ گئی تھی۔ کچھ سوچتی ہوئی بولی۔ "محسن بھائی کبھی بھی نہیں آتے۔ میں تو انہیں اتنا یاد کرتی ہوں۔" اس کا چہرہ سوگواری میں ڈوب گیا تھا۔ وہ خاموشی سے چلتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ جواد بھی اس کے ساتھ تھا۔ برآمدے کی سیڑھیاں اترتی ہوئی گڑیا نے عجیب سی نگاہوں سے تمت کی طرف دیکھا لیکن وہ اپنے خیالوں میں کھوئی کھوئی تھی۔ اس نے دھیان نہیں دیا۔ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"ابا میاں!" اس نے چمکتے چہرے کے ساتھ کمرے میں جھانکا اور تیز تیز چلتی ہوئی کمرے کے وسط تک آ گئی۔ صمدانی صاحب جو کوئی کتاب دیکھ رہے تھے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"ابا میاں!" وہ پھر پکاری۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھوٹی پڑتی تھی۔ صمدانی صاحب نے اسے کبھی اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔ اس روتی ہوئی بے ضرر لڑکی کیلئے انہوں نے ہزاروں بار دعا کی تھی کہ اسے زندگی میں اتنی خوشیاں ملیں جو وہ سمیٹ نہ

سکے۔

"ابا میاں میں پاس ہو گئی۔" انہوں نے اس دبلی پتلی تمت کی طرف دیکھا۔ جو شانے سکیڑے ہر وقت دبکی سی رہتی تھی۔

"بیٹا سب کو مٹھائی کھلاؤ نا۔" وہ بڑی مسرت سے بولے۔ "تم تو سچ مچ ڈاکٹر بن گئیں۔"

وہ کھلکھلاتی ہوئی باہر نکلی تو گڑیا سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ "کیا بات ہے؟" وہ حیران ہوئی۔ آج تو تمہارے پیر زمین سے نہیں لگ رہے۔"

"گڑیا میں پاس ہو گئی ہوں نا۔"

"اچھا۔"

اس نے سرد مہری سے کہا۔ "اس وقت مجھے بھی ایڈمیشن مل گیا ہوتا تو میں بھی میڈیکل کر لیتی۔" تمت خفیف سی ہو کر سوچنے لگی کہ شاید اتنی خوشی کی بات نہیں جتنی خوش میں ہو رہی ہوں۔

جواد نے سنا تو بہت خوش ہوا۔ "کیا لینا ہے تمہیں پاس ہونے کی خوشی میں۔"

"کچھ بھی نہیں۔"

"کچھ بھی کیوں نہیں۔ آج میں سخاوت کے موڈ میں ہوں۔ یہ موقع پھر نہیں آئے گا۔" وہ یونہی ہنس کر چپ ہو رہی تو جواد نے گڑیا کو پکارا۔ "گڑیا ذرا یہاں آ دیکھو اس بیوقوف کو۔"

"کیا بات ہے۔" گڑیا نے خوبصورت آنکھیں جھپکائیں۔

"اس تمو کی بچی سے کہہ رہا ہوں کہ جو کچھ لینا ہو بتا دو تو یہ کچھ بتاتی ہی نہیں۔"

"کس خوشی میں؟" اس نے ناک سکوڑی۔

"کمال ہے ارے اللہ کی بندی تمت اتنے اچھے نمبروں سے پاس ہو گئی ہے۔ اس خوشی میں۔"

"اور جو میں بی اے میں پاس ہوئی تھی تو آپ نے مجھے کیا دیا تھا۔" وہ تنک

کر بولی۔

''اے گڑیا کی بچی ہم اپنی دریا دلی کا تذکرہ کر کے حاتم طائی کے جذبات مجروح نہیں کرنا چاہتے۔ اب تم خود ہی اچھے بچوں کی طرح بتا دو کہ میوزیکل البم تمہیں کس نے لے کر دیا تھا۔''

''آہا وہ کوئی پاس ہونے کا تھا۔'' وہ اٹھلائی۔

''اس کے علاوہ تو مجھے آپ کا کوئی اور قابل ذکر کارنامہ یاد نہیں۔'' اس نے چڑایا۔

بس بڑے وہ ہیں آپ۔'' گڑیا نے اک ناز آمیز تبسم سے کہا تو تمت کو وہ بے حد حسین لگی۔ ایسے میں اک انجانی سی شوخی نے اس کی نیلی آنکھوں کی دلکشی کئی گنا بڑھا دی تھی۔ تمت کو اپنا سانولا چہرہ یاد آ گیا۔ ٹھیک ہی تو ہے سب گڑیا سے پیار کرتے ہیں اس کی طرف متوجہ رہتے ہیں وہ ہے بھی تو کتنی پیاری وہ جواد کے ساتھ بیٹھی ہوئی کتنی بچ رہی تھی۔ جواد بھی تو کتنا خوبرو اور وجیہہ تھا۔

''یعنی تمت بیگم تم آخر کیا سوچنے کی کوشش کر رہی ہو۔'' جواد نے اسے کھویا کھویا دیکھ کر کہا۔

''نہیں تو۔'' وہ بوکھلائی۔

''کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔'' جواد نے اسے چھیڑا تو وہ سچ مچ پشیمان ہوگئی۔ وہ اس کی جانب جھک آیا۔ ''اے رونی صورت تمہارے چہرے پر کیوں بارہ بج رہے ہیں۔

''ویسے ہی میں سوچ رہی تھی۔'' گڑیا کی موجودگی میں وہ جھجک گئی۔ ورنہ جواد سے تو وہ دل کی بات کہہ لیتی تھی۔ ''ہوں کہو۔'' جواد ہمہ تن گوش تھا۔ گڑیا اکتا رہی تھی۔

''میرا مطلب ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ بڑی اماں ہوتیں تو کتنا خوش ہوتیں۔ وہ کہتی تھیں کہ تموتو کب ڈاکٹر بنے گی۔'' جواد نے اس کے پرخلوص چہرے کی طرف دیکھا جس پر کچھ کھو دینے کا ملال دھواں سا بن کر بکھر رہا تھا۔

''بڑی اماں اتنی محتاج تھیں۔ اب تمہارے لئے جیتی رہتیں۔ جواد کو گڑیا کا

اس طرح کہنا بہت برا معلوم ہوا۔ تمت کا چہرہ بھی اتر گیا۔ ''یہ یقیناً ان کیلئے خوشی کا باعث ہوتا۔'' اور ابھی اور کچھ کہتا کہ کمرے میں داخل ہوتی ہوئی اماں بی کو دیکھ کر خاموش ہو جانا پڑا۔ اماں بی تمت سے مخاطب ہوئیں۔

''تمت جواد کب سے آیا بیٹھا ہے اس کیلئے چائے تو بناؤ مجال ہے جو خود سے کبھی خیال آ جائے۔ بس کوئی کام تو ان سے ڈھنگ کا ہوتا نہیں۔''

تمت ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی۔ گڑیا بڑے ٹھسے سے بیٹھی رہی وہ دروازے سے نکل رہی تھی تو اماں بیگم پکاریں۔ ''تھوڑے کباب بھی تل لینا ساتھ میں بنے رکھے ہیں۔'' اب وہ جواد کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ''ہاں تو میاں کب تک ہوٹلوں میں مارے مارے پھرتے رہو گے اب گھر بسا لو یہی عمر اچھی ہوتی ہے۔'' جواد مؤدب ہو بیٹھا اور قریب بیٹھی گڑیا کے دلکش چہرے پر گلال سا بکھر گیا۔

☆......☆......☆

پچھلے پہر وہ ہسپتال چل دی۔ عمران اپنے کمرے میں تھا۔ اس کی رکی رکی آہٹ پہچانتے انہیں دیر نہیں لگی۔ خوش دلی سے ہاتھ بڑھا کر بولے۔ ''آ جاؤ تمت!!!''
''عمران بھائی آپ نے کیسے پہچانا؟'' اسے خوشگوار سی حیرت ہوئی۔
''تمت اب میری آنکھیں نہیں پہچانتیں تو کان پہچانتے ہیں۔''
وہ گھر سے دور ہوتی تھی تو آپ سے آپ اس میں خود اعتمادی عود کر آتی تھی وہ خوب بے تکلفی سے اظہار خیال کر سکتی تھی۔ ''عمران بھائی یہ تجربات بھی آپ کو کبھی یاد آئیں گے۔''
''بڑی تلخ یادیں ہیں۔'' عمران نے اداسی سے سر پلنگ کی پشت سے ٹکایا۔ ان کے اداس چہرے کو دیکھ کر اسے کوئی جواب ہی نہیں سوجھا اسی لئے خاموش ہی رہی وہ ایک دم سیدھے ہو بیٹھے اور اس کی سمت اپنی بے نور آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''تمت تم نے بھی کبھی محبت کی ہے۔''
''جی۔'' تمت سن سی ہو کر کرسی کی پشت سے جا لگی۔
''ہاں ہاں میری بات کا جواب دو تم بھی کسی سے محبت کرتی ہو۔''
تمت سراسیمہ سی ہو گئی۔ ''ہائے عمران بھائی میں نے کبھی نہیں۔'' وہ صفائی پیش کرنے کے انداز میں معصومیت سے بولی۔ اس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا۔
''اسی لئے تم ان تلخیوں سے ناواقف ہو جو اپنی محبت کھو دینے سے رگ و پے میں گھل جاتی ہیں۔ تمت میں انجم کو خود ہی آزاد کر دیتا۔ میں اس کے قابل ہی کب رہا تھا لیکن اس کی سرد مہری نے مجھے کتنے دکھ دیئے ہیں۔ اس حادثے نے تو میری آنکھیں تاریک کی تھیں لیکن انجم نے میرے دل کی دنیا اندھیر کر دی ہے۔

تمت اسے تسلیاں دینے لگیں۔ لیکن وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ ''تمت کبھی اس نے بھی میرا ذکر کیا ہے وہ بہت خوش ہے۔'' تمت کو اس کے سوالوں کا جواب دینا بہت دشوار ہو رہا تھا۔ اٹک اٹک کر بولی۔ ''عمران بھائی جیسے پہلے ہوتی تھیں ویسے ہی اب بھی رہتی ہیں۔''
وہ کچھ دیر بالکل خاموش بیٹھے رہے ان کے چہرے پر اک ایسی اذیت سی نظر آتی تھی جیسے ہولے ہولے کوئی چیز ڈس رہی ہو۔ ماحول کچھ سنگین سا ہو گیا تھا کہ اصغری خالہ کمرے میں آئیں۔ تمت نے جلدی سے اٹھ کر سلام کیا اور ان کے ہاتھ سے چیزیں لے کر میز پر رکھیں۔
''بیٹا تو کب آئی۔'' انہوں نے پنکھے کے نیچے کرسی گھسیٹی۔ ''خالہ میں ابھی تھوڑی دیر ہوئی آئی ہوں۔'' اصغری خالہ اسے دعائیں دینے لگیں۔ ''خالہ میں پاس ہو گئی ہوں نا۔'' اس نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ خالہ کے ساتھ عمران بھی حیران رہ گیا۔
''بیٹا تو ڈاکٹر بن گئی ہے؟''
''ملاؤ اسی بات پر ہاتھ۔'' عمران کی آواز میں وہی پہلے جیسی شوخی تھی اسے وہ شوخ و شنگ مسکراتا ہوا عمران یاد آ گیا اس نے اداسی سے اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا۔
''شاباش ننھی منی سی ڈاکٹر بی۔'' اس نے خوش دلی سے کہا تو اسے وہ عمران یاد آ گیا جس نے کہا تھا کہ اس کے ڈاکٹر بننے سے کلوروفارم کی بچت ہو جائے گی۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور خالہ کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔
وہ چلنے کیلئے اٹھی تو اصغری خالہ نے اس کی بلائیں لے لیں۔ وہ پشیمان سی ہو گئی۔ اتنی توجہ اتنے التفات سے وہ گھبرا جاتی تھی وہ تو دھتکاری ہوئی روح تھی۔ پیار کی جنت اس کیلئے اجنبی تھی۔
انہیں خدا حافظ کہتی ہوئی وہ گیلری میں نکل آئی۔ ابھی آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ سامنے جواد کو دیکھا جو اک جگہ رکا ہوا سگریٹ جلا رہا تھا۔ لیکن دیکھ اس کی طرف رہا تھا لیکن نگاہوں میں ایک ایسی اجنبیت تھی جیسے پہلی بار اسے دیکھا ہو۔ تمت کو رک کر سلام کرنا پڑا۔ اس نے جلتی تیلی جھٹک کر پھینکی اور اک کش زور سے لے کر بولا۔

''تو آپ عمران کو خوشخبری سنا آئیں۔'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا تو وہ خوفزدہ ہو کر یوں اس سے نظریں چرانے لگی جیسے کوئی نقصان کر آئی ہو۔ صرف جواباً جی۔'' ہی کہہ سکی۔

''انہیں آج ہی بتانا بہت ضروری تھا۔'' جواد نے درشتی سے پوچھا۔

تمت نے سر اٹھایا اور بڑی عاجزی سے بولی۔ ''وہ میرے رزلٹ کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے نا تو میں نے۔ میں نے کہا کہ انہیں بتا دوں۔''

''میں بھی تو تمہارے رزلٹ کے بارے میں پوچھتا رہتا تھا تو مجھے بتانے تم ہوسٹل آئیں۔''

''آپ کو۔'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''جی ہاں مجھے ہی۔''

''مجھے تو نہیں پتہ آپ کا ہوسٹل کہاں ہے۔'' اس نے سادگی سے عذر پیش کیا۔ گویا تمہارے پاس ایڈریس ہوتا تو تم آتیں۔'' اس نے ایک ایک لفظ تول کر کہا۔

''آپ تو ہمارے گھر آ سکتے ہیں نا۔'' اور عمران بھائی بے چارے بیمار ہیں اور پھر اماں بی جو ناراض ہیں۔''

''تمہیں عمران بھائی کی بہت فکر رہتی ہے۔'' اس نے تیکھے تیوروں سے سوال کیا۔

''ہائے تو بے چارے اتنے دکھی جو ہیں۔'' اس نے تاسف سے کہا۔

''تو بانٹ لو دکھ ان کے۔'' جواد نے ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا تو اس کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ آنسوؤں کا گھونٹ پیتے ہوئے بولی۔ ''میں تو بہت کوشش کرتی ہوں کہ وہ اپنے غم بھول جائیں۔ اتنے مایوس نہ ہو جائیں۔ اصغری خالہ کے ایک ہی تو بیٹے ہیں لیکن وہ تو جیسے سیڈسٹ ہو کر رہ گئے ہیں کوئی بات انہیں خوش نہیں کر سکتی۔''

جواد نے ایک گہری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی اور بے ساختہ اس کا بازو پکڑ کر بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تمت تم کتنی خوش قسمت ہو تمہارے پاس اک دردمند دل ہے۔'' وہ اس کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ ''آؤ تمہیں تمہارا انعام دلا دیں کہیں بعد میں نہ کہنا۔''

''نہیں نہیں شکریہ جواد بھائی۔'' وہ بازو چھڑانے لگی لیکن اس کی گرفت مضبوط تھی۔ ہاؤس جاب کا بس تھوڑا ہی عرصہ رہ گیا۔ اس کے بعد اس کی ٹرانسفر کہیں اور ہونے والی تھی۔ اپنے کام میں وہ پوری تن دہی سے مگن تھی۔ جلد ہی وہ ہسپتال میں مقبول ہو گئی تھی۔ وہ تھی بھی تو اتنی ہمدرد اور مشفق۔ دکھی لوگوں کے دکھ بانٹتے وہ نہیں تھکتی تھی۔ تجربہ کار ڈاکٹروں سے زیادہ سے زیادہ سیکھنے کی کوشش کرتی۔

فرصت ملتی تو عمران کے پاس بھی ہو آتی۔ اسے تسلیاں دیتی۔ اس کی ڈھارس بندھاتی وہ چاہتی تھی کہ عمران بھائی کا آپریشن ڈاکٹر سلہری ہی کریں وہ مشہور ڈاکٹر تھے اور اس کے ساتھ کافی جان پہچان بھی تھی لیکن وہ کچھ عرصہ کیلئے ملک سے باہر گئے ہوئے تھے اسی لئے عمران کا آپریشن وقتی طور پر ملتوی ہو گیا تھا۔

جب وہ عمران کے پاس بیٹھی دھیمے دھیمے باتیں کر رہی ہوتی تو عمران کو یوں محسوس ہوتا جیسے دھیرے دھیرے اس کی آنکھوں میں روشنی آ رہی ہے اس کا غم سے بوجھل دل ہلکا پھلکا ہو جاتا۔ زندگی اتنی ناگوار معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہ حیرت سے سوچتا کہ یہ وہی تمت ہے جو دوسروں کی نگاہوں سے چھپتی پھرتی تھی کل تک وہ جس کا جی بھر کے مذاق اڑاتا رہا تھا جس کو اس نے ٹھکرا دیا تھا۔ کتنے غیر محسوس انداز میں اس کے اتنا قریب چلی آئی تھی۔ انہیں اب معلوم ہوتا تھا کہ حسن کی کوئی اہمیت نہیں ساری دلکشی روح کی خوبصورتی میں ہے۔ دل کے جمال میں ہے۔ جب وہ نہیں آتی تھی تو یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی چیز بھول گئے ہیں اور اب یاد نہیں آ رہی۔

وہ کتنے یقین سے کہتی تھی۔ ''سچ عمران بھائی اصغری خالہ آپ کیلئے اتنی دعائیں کرتی ہیں اور پتہ ہے ماں کی دعا کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔''

''اور تم......؟'' عمران نے پوچھا۔

''میں بھی کرتی ہوں۔ میں کیوں نہیں کروں گی بھلا۔'' اس نے پوری سچائی سے کہا۔

''تمو!!! تم کیا ہو؟'' اس نے بڑے رسان سے کہا۔

''جی......!!'' وہ حیران ہوئی۔

''تمو...... میں تمہارا کتنا دل دکھاتا رہا ہوں تمہیں کبھی یاد نہیں آتا۔'' عمران

نے ندامت سے کہا۔

''نہیں تو عمران بھائی مجھے تو سبھی اسی طرح کہتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی تو ایسا ہو جس سے سب دل لگی کر سکیں۔''

''تمو...... تم کتنی چھوٹی سی ہو لیکن تمہارا دل بڑا ہے۔ اتنی بڑی بڑی باتیں تم کہاں سے سیکھتی ہو۔''

وہ جھینپ کر بے معنی سا جملہ کہہ گئی۔ ''نہیں تو عمران بھائی۔ میں نہیں۔''

اک مہربان سی مسکراہٹ عمران کے چہرے پر کھل گئی۔ ''ایک بات کہوں وعدہ کرو کہ ہاں کہو گی۔''

''عمران بھائی میں نے پہلے کبھی آپ کی بات ٹالی ہے۔'' اس نے بڑے خلوص سے کہا۔

''میں ڈرتا ہوں کہیں تم برا نہ مان جاؤ۔''

''میں کیوں برا ماننے لگی آپ کی بات۔'' اس نے تسلی دینے کے انداز میں کہا اور سوچنے لگی۔ ایسا تو کبھی کسی نے نہیں سوچا کہ مجھے بھی کوئی بات بری لگ سکتی ہے۔ سبھی اپنی پسند سے بات کرتے ہیں۔ مجھ سے تو کبھی کسی نے اجازت تو نہیں لی۔

عمران کو متذبذب دیکھ کر وہ بھی کچھ پریشان سی ہو گئی لیکن کسی لطیف جذبے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے تو ماں کی موجودگی میں بھی اپنے لئے اس ممتا کی تمنا نہیں کی تھی جو سب کو بنا چاہے ملتی ہے۔ باپ کی شفقت کا امرت اس نے اب چکھا تھا۔ اس کا محبت کا تصور بہت محدود تھا۔ وہ اس جذبے سے آشنا ہی کب تھی وہ کسی تیسری محبت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ عمران کے انکار نے اسے اپنی حیثیت بہت اچھی طرح سمجھا دی تھی اور اسے کسی سے کوئی گلہ بھی نہیں تھا۔ وہ گڑیا کی دلکش صورت کے مقابلے میں اپنا سانولا چہرہ دیکھتی۔ تو سوچتی سب ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ مجھے خود کو بھی گڑیا اسے بھی کتنی پیاری لگتی تھی۔

''سنو تمت !!!'' عمران بستر پر اک کہنی کے سہارے جھک آیا۔

''جی !!!'' تمت ہمہ تن گوش ہو گئی اور عمران سوچ رہا تھا کہ نہ جانے اس کا سانولا چہرہ گلابی ہوتا ہوا کیسا لگے گا۔ اس کی خوفزدہ آنکھیں جھک کر کیسی لگتی ہوں گی۔

اس کے سہمے سہمے ہونٹ کپکپاتے ہوئے کتنے دلکش معلوم ہوتے ہوں گے۔

''سنو نا تمو۔'' انہیں جیسے مطلوبہ الفاظ مل گئے۔ جو تمت تک اس کا مفہوم پہنچا دیں۔

''تمت بٹی آج تو بہت دنوں میں آئیں۔'' اصغری خالہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تو عمران کو زندگی میں پہلی بار اپنی ماں کی آواز ناگوار معلوم ہوئی۔ ''دل کی بات لبوں تک لانے میں کتنی رکاوٹیں ہیں۔'' اس نے تلخی سے سوچا اور سیدھا ہو کر پلنگ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ اصغری خالہ سے دو چار رسمی فقروں کے تبادلے کے بعد عمران سے مخاطب ہوئی۔ ''ہاں تو عمران بھائی آپ کیا کہہ رہے تھے۔ میں بالکل برا نہیں مانتی۔''

''اف اللہ یہ لڑکی کس قدر سادہ ہے اس کے دل میں تو کوئی چور نہیں۔'' عمران نے بوکھلا کے سوچا۔

''کچھ نہیں تمت میں تو مذاق کر رہا تھا۔'' اس نے ٹال دیا۔ اب وہ اصغری خالہ کے سامنے اس سے کہتا بھی کیا۔

''نہیں کوئی بات تو تھی۔'' تمت نے پھر پوچھا۔ عمران نے یونہی نفی میں سر ہلا دیا وہ اصغری خالہ سے باتیں کرتی رہی پھر اجازت لے کر اٹھ آئی۔

☆......☆......☆

گھر میں داخل ہوئی تو وہیں ٹھٹک گئی اور پھر بھاگتی ہوئی برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔ بالکل اس بھولی بھالی بچی کی مانند جس نے پیروں میں پہلی مرتبہ پازیب پہنی ہو۔ ابا میاں کمرے سے چلتے ہوئے باہر برآمدے میں آئے تھے وہ مسرت سے دیوانی ہوئی جاتی تھی۔ وہ چلنے پھرنے لگے تھے۔ اس دن کیلئے تو اس نے رو رو کر دعائیں مانگی تھیں۔ اسے اچانک محسوس ہوا کہ آج کا دن کتنا روشن ہے۔ سورج کے ساتھ چاند بھی نکل آیا ہے۔ سارے ستارے بھی چمکنے لگے ہیں۔ تبھی تو ہر چیز صاف صاف نظر آ رہی تھی۔ اور پہلے سے کئی گنا زیادہ حسین۔ ''ابا میاں ابا میاں۔'' وہ مسرت سے ہانپ سی گئی۔ ان کے دونوں ہاتھ تھام کر بولی۔ ''ابا میاں آپ تو بالکل ٹھیک ہو گئے۔ ہیں نا۔ ہیں نا۔''

وہ خوشی سے ان کے چہرے کی طرف دیکھتی ہوئی بالکل ایک بھولی بھالی بچی نظر آتی تھی۔ صمدانی صاحب نے اس کے سانولے سلونے چہرے کی طرف دیکھا جس پر پیار کا نور چمک رہا تھا۔ وہ پیار سے ہنس پڑے۔

''بھئی ہماری بیٹا ڈاکٹر ہو اور ہم کیسے بستر پر پڑے رہیں۔''

غیر ارادی طور پر اسے سینے سے لگا لیا۔ ایک انوکھا سا سرور ان کے رگ و پے میں دوڑ گیا۔ جیسے کسی مسیحا نے دم مرگ انہیں زندگی کی نوید دے دی ہو۔ بیٹی کی محبت کا شیریں ذائقہ انہیں اپنے روئیں روئیں میں گھلتا محسوس ہوا۔ بیٹی کی محبت تو آب حیات ہے۔ انہوں نے سوچا۔ ایک بوجھ سا جو روح پر چھایا رہتا تھا' پل بھر میں چھٹ گیا۔ تمت کو نہ جانے کیا ہوا کہ ایک دم ان کی گرفت سے نکل گئی۔ ان کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر اجنبی سی آواز میں بولی۔

''ابا میاں آپ میرے ابا میاں ہیں نا۔''

صمدانی صاحب حیران ہو کر بولے۔ ''ہاں ہاں بیٹا۔''

''میں آپ کی بیٹی لگتی ہوں نا۔'' اس نے دیوانگی سے پوچھا۔

''ارے بیٹی کیوں نہیں۔'' صمدانی صاحب کے لئے اپنا ہی لہجہ بالکل نیا تھا۔ ملائمت اور اپنائیت کا یہ لہجہ جس میں پیار چھلک چھلک جاتا تھا۔

''سچ مچ!!!'' تمت نے عجلت سے پوچھا۔

''ہوں۔'' صمدانی صاحب نے گویا یقین دلایا۔

وہ دھڑ سے ان کے سینے سے جا لگی اور سسکیاں لینے لگی۔ صمدانی صاحب کو اس کی ہر ہچکی کے ساتھ اپنا دل بیٹھتا محسوس ہوتا تھا۔ سامنے کے کمرے سے گڑیا اور اماں بی ایک ساتھ باہر آئیں اور وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

تمت صمدانی صاحب کے سینے سے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

شہر تو چھوٹا تھا لیکن ہسپتال یہاں کا بھی بھرا رہتا تھا۔ ہر روز بیسوں مریض آتے جاتے تھے۔ ہسپتال میں بیٹھے ہوئے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ سورج کی ہر کرن کے ساتھ دکھ درد اور بیماریاں لپٹی ہر گھر میں گھسی آتی ہیں۔ کوئی ان سے خالی نہیں۔

کوئی ان سے مبرا نہیں۔ لمبی لمبی کاروں میں آنے والے مریض بھی درد کی شدت سے اسی طرح تڑپتے جس طرح گرد آلود پاؤں والے غریب۔ جو بیماریوں کا بوجھ اٹھاتے اپنے تاریک گھروں سے چلتے آتے تھے۔ اس کا دل دکھ سے بھر جاتا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے۔ وہ کس طرح انسانوں کے سب دکھ اپنے دامن میں بھر لے سب کے حصے کے آنسو اپنی آنکھوں سے کیوں نہ بہا دے۔

سارا دن وہ بے حد مصروف رہتی' اس کے سب ساتھی اچھے تھے جب وہ رات کو سونے کیلئے لیٹتی تو گھر کے اک اک فرد کی صورت اس کی آنکھوں میں پھرنے لگتی وہ سب کو یاد کرتی کرتی سو جاتی' کبھی کبھی ابا میاں خط لکھ دیتے تھے۔ کوئی بھی اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ حالانکہ جواد نے سٹیشن پر اس سے کہا تھا کہ ملنے آؤں گا۔ اسے عمران بھائی بھی بہت یاد آتے تھے۔ اس نے فون کیا تھا تو معلوم ہوا تھا کہ ڈاکٹر سلہری جلد آنے والے ہیں۔

''خدا کرے عمران بھائی' بالکل ٹھیک ہو جائیں۔'' وہ پورے خلوص سے دعا مانگتی اور یوں مطمئن ہو جاتی جیسے اس کی یہ دعا سیدھی بارگاہ خداوندی میں پہنچ گئی۔

وہ وقت پر ڈیوٹی پر پہنچتی اور دن بھر پوری مستعدی سے اپنے فرائض پورے کرتی تھی لیکن وہ محسوس کرتی تھی کہ ہمدردی اور لگن کا ان میں فقدان تھا۔ خصوصاً ڈاکٹر فرحان تو ان سب سے کچھ سوا ہی تھے۔ یوں تو بڑے دوست نواز اور خوش مزاج آدمی تھے لیکن مریضوں کے ساتھ ایسی خشکی سے پیش آتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ ڈیوٹی پر آتے تو چھٹی کرنے کی فکر میں رہتے۔ انہیں ہوسٹل سے بلوایا جاتا تو کیا مجال جو بستر سے نکل آئیں۔ تمت جب ذرا بے تکلف ہوئی تو دبے لفظوں میں ان کے رویے پر اعتراض کیا لیکن وہ باتوں میں اڑا گئے۔ الٹا اس کا مذاق اڑایا کہ وہ ڈاکٹر کم اور ڈاکٹری کی مریض زیادہ ہے لیکن امید ہے اس مرض کا بھوت جلد اس کے سر سے اتر جائے گا۔

اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر وہ ہوسٹل آ رہی تھی کہ ڈاکٹر فرحان سامنے سے آتے ہوئے نظر پڑے اور اک بوڑھا آدمی ان کے پیچھے پیچھے تھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں ان سے کچھ کہتا ہوا آ رہا تھا جس پر وہ بالکل توجہ نہیں دے رہے تھے۔ تمت سب معاملہ سمجھ گئی تھی۔ تیز تیز چلتی ان کے

قریب پہنچی' اس کے کان بوڑھے کی دکھ بھری آواز سے سلگنے لگے۔ ڈاکٹر فرحان ڈپٹ کر بولے۔

''بھئی میرا پیچھا چھوڑو گے کہ نہیں' ڈاکٹر پرویز سے کہو جا کر' میں ایمرجنسی پر نہیں ہوں۔''

''ڈاکٹر صاحب میرے بچے کی زندگی کا سوال ہے۔''

''میں خدا نہیں ہوں۔'' ڈاکٹر فرحان نے چڑ کر کہا۔

''بابا کیا بات ہے۔'' تمت نے نرمی سے پوچھا تو وہ اس کی طرف لپکا۔ ڈاکٹر فرحان نے گھور کر اس کی طرف دیکھا وہ جلدی جلدی اس کو اپنے بیٹے کی کیفیت بتاتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ڈاکٹر فرحان اب تک وہیں کھڑے تھے۔ تمت نے ان کے قریب سے گزرتے ہوئے کہہ دیا۔

''ڈاکٹر فرحان آپ کو اس پیشے کے تقدس کا خیال رکھنا چاہئے۔'' ڈاکٹر فرحان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ''تقدس کی دیوی اک آپ ہی بہت ہیں۔'' اس نے درشتی سے انگریزی میں کہا۔ تمت سنی ان سنی کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

واپس آئی تو دیکھا ڈاکٹر فرحان اب تک موجود ہیں۔ سگریٹ پی رہے تھے اور اسے دیکھا تو کھڑے ہو گئے۔ وہ اوور آل تہہ کرتے ہوئے بولی۔ ''ڈاکٹر فرحان آپ اب تک یہاں۔''

''آپ کو کوئی اعتراض؟؟؟؟'' انہوں نے جل کر کہا تو تمت جھینپ گئی۔ خفت مٹاتے ہوئے بولی۔

''مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''

''آپ کو اعتراض ہو بھی تو اپنے پاس ہی رکھئے۔'' اس نے درشتی سے کہا۔ تو تمت سہم سی گئی۔ ''جی ہاں آپ شوق سے خدمت خلق کیجئے لیکن دوسروں کو خواہ مخواہ نصیحت مت کیجئے۔''

''میں نے آپ سے کیا کہا۔'' وہ سراسیمہ سی ہو گئی۔ فرحان نے اک قہر آلود نگاہ اس پر ڈالی اور بولے۔ ''آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں۔ مجھے اپنے ذاتی معاملات میں کسی کا دخل پسند نہیں۔''

''میں' میں نے کب ایسا کیا۔'' وہ پشیمان ہو گئی۔

''میں اپنے فرائض بخوبی سمجھتا ہوں۔ آپ کو زحمت کی ضرورت نہیں۔''

تمت کو یاد آیا کہ اسے ان کے واقع کا ملال ہے۔ بوڑھے کی التجائیں ان کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ اسے فرحان ڈاکٹر نہیں جلاد معلوم ہوا۔ وہ ضبط نہ کر سکی۔

''فرائض کو صرف سمجھ لینا ہی کافی نہیں۔ انہیں اچھے طریقے سے انجام دینا بھی ضروری ہے۔''

''مجھے آپ کے مشورے کی ضرورت نہیں۔'' ڈاکٹر فرحان نے تلخ لہجے میں کہا تو تمت نے اپنی چیزیں اٹھاتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''آپ کو میرے مشورے کی ضرورت نہ سہی' لیکن اپنے اندر ہمدردی پیدا کرنے کی بہت ضرورت ہے اور بغیر اس کی طرف دیکھے کمرے سے باہر نکل گئی۔

بہت دن ڈاکٹر منہ پھلائے رہا اور تمت سوچتی کہ اس جیسے آدمی کو تو اس پیشے میں آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ کچھ دنوں بعد پھر ایسا ہی واقعہ ہوا۔ ڈاکٹر فرحان کی ڈیوٹی ختم ہو گئی تھی اور ان کے کسی مریض کی حالت بگڑ گئی۔ مریض کے لواحقین ان کی منتیں کرتے پھر رہے تھے اور ان کا پارہ چڑھ گیا۔ تمت ادھر سے گزری تو وہاں رک گئی۔ اسے دیکھ کر ڈاکٹر فرحان اور بھی چڑ گئے۔ مریض کے گھر والوں کو خوب ڈانٹا۔ تمت برداشت نہ کر سکی۔ ان سے بیڈ نمبر پوچھ کر انہیں چلنے کو کہا اور خود فرحان کے قریب آ کر بولی۔ ''ڈاکٹر فرحان آپ میرے آنے تک یہیں رکئے گا مجھے آپ سے اک بات کہنا ہے۔'' فرحان نے اک قہر آلود نگاہ اس پر ڈالی۔

''مجھے آپ کی بات سننے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

تمت نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کو جلدی ہو تو چلے جایئے گا۔ کل سہی۔'' ڈاکٹر فرحان نے دانت پیسے لیکن خاموش رہا۔

اس مریض کو دیکھ کر جب وہ واپس آئی تو دیکھا ڈاکٹر فرحان اب تک موجود ہیں۔ اک نامعلوم سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں تک آئی اور کھو گئی۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ڈاکٹر فرحان بول پڑے۔

''میں آپ کی وجہ سے نہیں رکا ہوا۔ اک دوست ملنے آ گئے تھے جو ابھی

ابھی اٹھ کر گئے ہیں۔"

تمت نے مسکرا کر کہا۔"آپ کو ہوسٹل جانے میں دیر نہیں ہوئی۔" اس کے پرسکون لہجے میں جو طنز چھپا تھا وہ فرحان سے چھپا نہ رہ سکا۔ درشتی سے بولے۔"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"اک مریض کو تھوڑی دیر دیکھنے سے تو آپ کو بہت دیر ہو رہی تھی۔"

"ٹھیک ہے اس وقت میری ڈیوٹی ختم ہو رہی تھی۔"

"خلوص اور ہمدردی تو کسی چیز کے پابند نہیں۔"

"آپ یہ اخلاقی لیکچر کسی اور کو پلایئے۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔" تمت اس کے سخت لہجے سے خاموش سی ہوگئی پھر رکتی ہوئی بولی۔"ہم میں سے ہر ڈاکٹر اس پیشے کے تقدس کا امین ہے۔ ہم اس کی حفاظت نہیں کریں گے تو کون کرے گا؟"

"آپ یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ ہر ڈاکٹر انسان بھی ہوتا ہے۔ اس کو بھی آرام وسکون کی ضرورت ہے۔"

"انسان ہوتا ہے۔ تو انسان کی ہمدردی میں اپنا آرام تج دیتا ہے۔ ہم لوگوں نے زندگی میں اک کٹھن راہ کا انتخاب کر ہی لیا ہے تو پھر گھبرانا کیسا۔" اس نے مفاہمت کے انداز میں کہا۔

"ڈاکٹر تمت میں اک نارمل انسان ہوں اور کم از کم مجھ پر تو انسانی ہمدردی کا بھوت سوار نہیں ہے۔ ٹھیک ہے ہم اپنی ڈیوٹی پوری کرتے ہیں اور بس۔"

تمت نے کچھ جھجک کر کہا۔"آپ برا نہ مانیں تو کہوں کہ آپ ڈیوٹی کے دوران بھی دوستوں سے ملتے اور چائے وغیرہ پیتے ہیں اور اپنا پورا وقت مریضوں کو نہیں دیتے۔" فرحان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ میز پر زور سے ہاتھ مار کر بولے۔"ڈاکٹر تمت آپ میری توہین کر رہی ہیں۔"

تمت سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ خوفزدہ سی ہو کر بولی۔"ڈاکٹر فرحان آپ آرام سے بات کریں نا۔"

ڈاکٹر فرحان نے اک قہر آلود نگاہ اس چھوٹی سی لڑکی پر ڈالی۔ جو کندھے سکیڑے کچھ کچھ سہمی سی کھڑی تھی جیسے اچانک ڈر گئی ہو لیکن اس کا غصہ کم نہ ہوا۔ وہ

کون ہوتی تھی جو اس کے منہ پر اس کی کمزوریاں بیان کر رہی تھی۔ ڈپٹ کر بولے۔

"آپ مجھ پر الزام تراشی کریں اور میں آرام سے بات کروں۔"

"میں نے کوئی الزام نہیں لگایا۔ میں نے سچ بات کی ہے۔"

تکرار طول کھینچ گئی۔ ڈاکٹر فرحان حد درجہ ضدی تھے اور تمت اپنے مؤقف میں سچی تھی اس لیے مقابلے میں ڈٹی تھی۔ وہ بھی جھجکی نہیں اور جی بھر کر انہیں ان کی کوتاہیوں کا احساس دلایا۔

پہلے کی طرح وہ اب بھی خوفزدہ ہو جاتی تھی۔ سہم جاتی اور آنکھوں میں آنسو آ جاتے لیکن اس میں پہلے کی نسبت خود اعتمادی خاصی پیدا ہو گئی تھی۔ اب بھی وہ دوسروں سے بے تکلف تو نہیں ہوتی تھی لیکن پہلے کی نسبت کھل کر اپنی رائے کا اظہار کر سکتی تھی۔ اب اسے کچھ کچھ اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگا تھا۔ ہسپتال کے سب مریض اس سے اتنا پیار کرتے تھے اس کی راہ دیکھتے تھے۔ وہ نظر آتی تو سب اپنا اپنا دکھ یوں بیان کرنے لگتے جیسے اسے بتاتے ہی سب کلفتیں دور ہو جائیں گی۔

☆......☆......☆

سٹاف میں بھی وہ خاصی مقبول تھی۔ سینئر ڈاکٹر اس کی فرض شناسی کے معترف تھے۔ اتنی توجہ، اتنی اہمیت پا کر وہ خود پر اعتماد کرنے لگی تھی۔ کبھی کبھی سوچتی کہ جواد بھائی سچ ہی تو کہتے تھے شکل وصورت کی تو اتنی اہمیت نہیں۔ ڈاکٹر فیروز کتنی خوبصورت ہیں۔ ڈاکٹر فرحان بے حد وجیہہ ہیں لیکن لوگ انہیں پسند نہیں کرتے۔

وہ گھر سے دور تھی تو ہر روز بدصورتی کے طعنے بھی سننے کو نہیں ملتے تھے۔ وہ اب پرسکون رہتی تھی۔ اپنے فرائض کی تکمیل میں اسے اک انوکھی آسودگی ملتی تھی۔

سب ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ مکمل ہڑتال کریں گے۔ ہسپتال میں کسی مریض کے لواحقین نے ڈاکٹر الماس کی توہین کی تھی اور پھر تنخواہیں اور الاؤنسز بڑھانے کا پرانا مطالبہ بھی تسلیم کروانا تھا۔ سب نے اتفاق کیا۔ بس تاریخ کا تعین باقی تھا۔ تمت راؤنڈ لے کر آئی تو کمرے میں سب کو موجود دیکھ کر پریشان ہوئی۔ ڈاکٹر فیروزہ نے جلدی جلدی سے سارا منصوبہ اس کے گوش گزار کیا تو تمت حیران رہ گئی۔ یہ قوم کے مسیحا کس راستے پر جا رہے ہیں۔ اتنی سی بات کیلئے انسانی زندگیوں کو داؤ پر کیوں لگایا جائے۔

اس کی طرف سے کسی گرمجوشی کا اظہار نہیں ہوا تو فیروزہ نے کہا۔ ''تمت کیا خیال ہے؟''

تمت نے غیرارادی طور پر ڈاکٹر فرحان کی طرف دیکھا جو اس کی طرف پہلے سے ہی گھور رہے تھے اور محتاط سے انداز میں بولی۔ ''میرا خیال ہے یہ بات کچھ مناسب نہیں۔''

''کیوں؟؟'' سب نے احتجاج کیا۔

''احتجاج کا کوئی اور طریقہ بھی ہو سکتا ہے ہڑتال کچھ مناسب نہیں۔''

''کیوں؟؟'' پھر یک زبان ہو کر احتجاج کیا گیا۔

''بھئی ہم ہڑتال کر کے بیٹھ رہیں تو مریضوں کا کیا ہو گا۔'' تمت نے افسردگی سے کہا۔

''جہنم میں جائیں مریض۔'' کسی نے چڑ کر کہا۔

''چچ چچ۔ ہم لوگوں کا یہ حال ہے تو جو ہم خود کو مسیحا کہتے ہیں۔'' وہ دکھی سی ہو گئی۔

''محترمہ! مہربانی فرما کر اب کوئی مکالمہ نہ شروع کر دیجئے گا۔'' ڈاکٹر فرحان نے ناگواری سے کہا۔ اس کی تمت سے بول چال پھر بند تھی۔ تمت نے توجہ نہیں دی۔

''ضروری نہیں کہ ہم ہڑتال کریں۔ ہم اپنے مطالبات پیش کر دیں اور احتجاجاً سیاہ نشان پہنیں۔'' اس نے مفاہمت کے انداز میں کہا۔

''وہ آپ پہنتی رہیے گا۔'' ڈاکٹر فرحان نے چڑ کر کہا تو وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں اس میں شریک نہیں ہو سکتی، یہ کسی کا ذاتی معاملہ نہیں۔ یہ انسانیت کا معاملہ ہے۔ یہ ہمارے پیشے کے وقار کا سوال ہے اور مجھے نہ انسانیت کی شکست منظور ہے نہ اپنے پیشے کی بے حرمتی۔ ہاں اگر آپ کوئی قرارداد پاس کرنا چاہیں یا احتجاج کا کوئی اور پرامن طریقہ ہو تو میں ہر ممکن طریقے سے آپ کا ساتھ دوں گی۔''

''ڈاکٹر تمت! ضرورت سے زیادہ بننا بھی آپ کو زیب نہیں دیتا۔'' ڈاکٹر فرحان سخت غصے میں تھے۔

''جب تک زیب دیتا رہے تب تک سہی۔'' اس نے مسکرا کر کہا اور اپنی چیزیں سمیٹتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

انچارج نے ہڑتال کا نوٹس مسترد کر دیا تھا۔ انہوں نے نوٹس پر تمت کے دستخط نہ دیکھ کر استفسار کیا تھا کہ وہ اس میں شامل کیوں نہیں پھر انہوں نے تمت ہی کے مؤقف کی حمایت کی تھی کہ احتجاج کا کوئی بے ضرر طریقہ اپنایا جائے اور تمت کے

روئیے کی تعریف بھی کی تھی۔ ڈاکٹر فرحان جو اس پروگرام میں پیش پیش تھے آگ بگولہ ہو گئے۔ تمت پر ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ کچا ہی چبا جائیں۔

''آپ بہت خوش ہیں؟'' انہوں نے دانت کچکچا کر تمت سے کہا۔

''جی ہاں۔'' وہ مسکرائی۔ ''اتنے مریضوں کی جان بچ جانے پر کون ڈاکٹر خوش نہیں ہوگا۔''

''آپ کو اپنے روئیے پر شرم آنی چاہیے۔'' وہ اور بھی چڑ گئے۔

''یہی خیال میرا آپ کے متعلق بھی ہے۔'' تمت بھی خاموش نہیں رہی۔

فرحان کو اس کے پرسکون لہجے پر بے انتہا طیش آیا۔ ''آپ حد سے بڑھ رہی ہیں۔''

''میں نے صرف آپ کا فقرہ لوٹایا ہے۔'' وہ ہولے سے ہنس دی۔

فرحان کیلئے ضبط کرنا محال تھا۔ ''اپنی صورت دیکھیں آئینے میں جا کر۔''

تمت بھونچکی سی رہ گئی۔ اک ٹک اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ غیر متوقع طور پر بدصورتی کے اس طعنے نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ فرحان نے بھی ایک لمحے کو اس کے پھیکے پھیکے چہرے کی طرف دیکھا جس پر محرومیوں کی چھاؤنی سی چھائی تھی پھر جیسے خواب کی حالت میں بولی۔

''میری صورت بہت بری ہے؟'' ڈاکٹر فرحان نے ہنس مکھ سی ڈاکٹر تمت کو آج پہلی مرتبہ اس حالت میں دیکھا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی اندرونی کرب کا شکار ہے۔ اس کی سیاہ آنکھیں بڑی ویران تھیں۔ ڈاکٹر فرحان متذبذب سے کچھ کہہ نہیں پائے تھے کہ وہ خود ہی جیسے اپنے آپ سے بولی۔

''ہاں! میں بہت بری ہوں نا؟''

پھر اس نے خاموشی سے اپنی چیزیں اٹھائیں اور بغیر اس کی طرف دیکھے باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر فرحان یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہیں یہ تسلیم کر لینے میں تامل ہو رہا تھا کہ وہ انگوٹھا چوس رہی ہے۔ وہ تیزی سے اس کے پیچھے لپکے۔ وہ اپنے ہوسٹل کی طرف چلی جا رہی تھی وہ اور بھی تیزی سے چلتے ہوئے اس کے برابر پہنچ گئے۔ تمت نے دھیان نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے جنہیں وہ بے دردی سے

پونچھتی جاتی تھی' وہ اب بھی انگوٹھا چوس رہی تھی۔ ڈاکٹر فرحان کو اپنے روئیے پر بڑی ندامت ہوئی۔ انہوں نے تو طیش میں یونہی محاورتاً کہہ دیا تھا لیکن وہ اس کا اتنا اثر لے گی انہیں گمان بھی نہ تھا۔

''ڈاکٹر تمت!'' انہوں نے پکارا تو وہ چونک کر پلٹی۔ وہ جلدی جلدی معذرت کرنے لگے۔

''دیکھئے ڈاکٹر تمت! میرا مقصد آپ کا دل دکھانا ہرگز نہیں تھا۔'' ان کو الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

تمت نے اجنبی سی آواز میں کہا۔ ''آپ نے تو ٹھیک ہی کہا ہے۔''

ڈاکٹر فرحان کو معلوم ہوا جیسے وہ اپنے حواسوں میں نہ ہو۔ وہ اسے اس بے تکلفی سے انگوٹھا چوستے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

''ڈاکٹر تمت آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں بالکل۔'' اس نے لاپرواہی سے کہا اور تیز تیز چلتی ہوئی اپنے ہوسٹل کے گیٹ میں داخل ہو گئی۔ ڈاکٹر فرحان دیر تک اس گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ سوچتے رہے۔

☆......☆......☆

''جواد بھائی! آپ کیسے؟'' جواد کو دیکھ کر وہ حیرت و مسرت سے چلائی۔

جواد نے ہاتھ ہلایا۔

''میں ذرا دیکھنے آیا تھا کہ یہاں تم کون کون سے کام بگاڑ رہی ہو۔''

تمت خوش دلی سے ہنس دی اور گھر میں سب کا حال پوچھنے لگی۔ وہ فرداً فرداً سب کے بارے میں بتاتا رہا پھر بولا۔ ''تمہاری چھٹی ہو گئی نا۔ میں تمہارے ہوسٹل چلوں۔ یا تم میرے ہوٹل چلو گی۔''

''آپ ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔''

''کہو تو تمہارے ہوسٹل میں ٹھہر جائیں''

''نہ بابا' ہمیں تو مردے رات کو ڈرائیں گے۔'' اس نے مزاحیہ انداز میں کہا تو تمت ہنس پڑی۔

وہ اسے اصرار کر کے اپنے ساتھ ہوٹل لے ہی آیا۔ چائے کا آرڈر دے کر وہ اطمینان سے بیٹھ رہا۔

''ہاں تو جناب کیا کیا مشغلے ہیں آپ کے؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' وہ اک جانب گردن جھکا کر بولی۔

''ہوں۔'' اس نے شرارت سے آنکھیں نچائیں۔ ''پھر تو یہاں دو چار قبرستان اب تک بن چکے ہوں گے۔''

''وہ کیوں؟''

''ظاہر ہے جب تک کچھ بھی نہیں کرو گی تو مریضوں کا خدا حافظ ہے۔'' تمت ہنس دی۔ چائے آ گئی تو وہ چائے بنانے لگی۔

پھر ایک دم جیسے اسے یاد آیا۔ ''جواد بھائی! آپ عمران بھائی سے ملے۔ میں نے کئی بار فون کیا لیکن لائن نہیں مل رہی تھی۔ اب وہ کیسے ہیں؟''

''تمہیں ان کی بڑی فکر رہتی ہے۔'' جواد نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

''تو نہ کروں۔ اور میری بھی کبھی تم نے فکر کی ہے۔ اس نے کچھ ایسے لہجے میں اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا جو کسی نوخیز دوشیزہ کے ننھے سے دل میں سو ارمان جگا دے لیکن تمت نے سادگی سے کہا۔ ''جواد بھائی! وہ تو بیمار ہیں نا۔''

''اور میں؟''

''خدا نہ کرے' آپ کیوں بیمار ہوں۔''

''تمہیں نہیں نا پتہ میں کتنا بیمار ہوں؟''

''کیوں آپ کو کیا ہوا۔'' وہ سچ مچ فکرمند ہو گئی۔

''نبض دیکھ کر پتہ چلاؤ۔ تم تو ڈاکٹر ہو۔'' جواد نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ تمت نے چائے ختم کر کے پیالی رکھی اور اس کی نبض دیکھنے لگی۔ جواد نے اس کے سانولے چہرے کی طرف دیکھا جس پر دوشیزگی کی ہلکی ہلکی چمک بڑی پاکیزہ تھی۔ اس کی انگلیوں میں ارتعاش نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر جذبات کی ہلکی سی لہر بھی نہیں تھی۔ اسے یاد آیا جو اس نے یونہی مذاق میں گڑیا سے کہہ دیا تھا۔ ''ڈاکٹر کی بہن ہو' آدھی ڈاکٹر تو تم بھی ہو گئیں۔ ذرا میری نبض تو دیکھو۔'' تو اس کے مرمریں ہاتھوں کی مخروطی

انگلیاں کانپ کانپ گئی تھیں۔ خمیدہ پلکوں نے جھک کر اس کی دلکش آنکھوں پر ایک چلمن سی تان دی تھی۔ گلابی چہرے کے ساتھ وہ صرف ایک بار اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی تھی لیکن ان نگاہوں میں وہ کچھ تھا جو اک داستان میں بھی نہیں ہوتا۔

''اس کے اندر کی عورت کتنی حساس ہے۔'' جواد نے سوچا اور یہ نادان سی تمت جس طرح خود سہمی رہتی ہے اسی طرح اس کا عورت پن بھی سہما سہا ہے۔ کبھی جذبات کی یورش اس کے چہرے پر نظر نہیں آئی۔

''لیجئے' آپ تو بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کو اس طرح نہیں کہنا چاہیے۔'' اس نے خلوص سے کہا اور اپنا ہاتھ ہٹا لیا لیکن جواد نے اس کا وہی ہاتھ پکڑ لیا۔ تمت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ جن میں اک گھبراہٹ بھی شامل تھی۔

''تم ذرا میرے پاس بیٹھو یہاں اور میری اک بات کا جواب دو۔''

جواد نے اسے برابر بٹھا دیا۔ وہ سمٹ سی گئی۔ سہم کر یوں اس کی طرف دیکھنے لگی جیسے جان کا خطرہ ہو۔

''دیکھو تم ڈرو نہیں۔ میری بات کا صحیح جواب دو۔'' جواد نے بڑے پیار سے اس کے گال تھپتھپائے۔

''تمہیں یاد ہے ایک بار تم نے مجھے غلط راستہ بتا دیا تھا اور میں ساری دوپہر بھٹکتا رہا تھا۔'' تمت نے ندامت سے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔ ''لیکن آج تم مجھے بھٹکانا نہیں۔''

''تمت!!!'' جواد نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

''مجھے بتاؤ میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟''

جواد کے ہاتھوں میں دبے ہوئے اس کے ہاتھ ایک لمحے کو کانپ گئے۔ وہ حیرت سے ان کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

''آج جواد بھائی کو کیا ہو گیا ہے۔'' اس نے پشیمان ہو کر سوچا۔

''نہیں تمو! خاموشی سے تو کام نہیں چلے گا۔ مجھے اپنے دل کی بات بتاؤ۔''

''جواد بھائی! جواد بھائی!'' وہ اٹکی۔

''کہو کہو۔'' اس نے گویا ہمت بندھائی۔

''جواد بھائی آپ تو اتنے اچھے ہیں۔'' اس نے صاف دلی سے کہا تو جواد نے اک لمحے کو اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور ذرا سا جھک کر سرگوشی میں بولا۔

''تو پھر مجھ سے شادی کرو گی۔''

''جی!'' اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا یا تو اس نے سنا نہیں اور یا وہ سن کر بھی سننا نہیں چاہتی۔

''ہوں۔''

''ہوں۔'' جواد نے دہرایا نہیں لیکن ایک بار اس کی سہمی ہوئی آنکھوں میں یوں دیکھا کہ اس کے ہاتھ ایک دم ٹھنڈے ہو گئے۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ وہ اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ چھڑانے لگی۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ جواد نے اس کے ہاتھ اور بھی مضبوطی سے تھام لئے اور بولا۔ ''تمو! گھبراؤ نہیں۔ میری بات کا جواب دو۔''

تمت کیلئے یہ تجربہ کتنا انوکھا اور انجانا تھا۔ اسے معلوم ہوتا تھا جیسے ہر چیز تھم کر اس کی جانب دیکھ رہی ہے۔ فضا میں کوئی بھی آواز نہیں صرف گہرا سکوت ہے جس میں جواد کے الفاظ نغمہ سا بن کر گونج رہے ہیں۔ اس نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا کہ اتنے خوبرو جواد بھائی اس سے شادی کی درخواست کرنے لگیں گے۔ وہ حواس باختہ سی ہو رہی تھی اور اپنی جگہ سے پیچھے کو کھسکتی جاتی تھی۔ جواد نے ایک بار میں اسے اپنی جانب کھینچ لیا لیکن کچھ کہا نہیں۔ وہ اسے خود کچھ کہنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ وہ اس کی کمزوریوں سے واقف تھا۔ وہ آج اس کے دل کی بات سننا چاہتا تھا۔ وہ اس کے دھڑکتے دل میں محبت کی تمنا جگانا چاہتا تھا۔ وہ بالکل اس کے قریب بیٹھی تھی لیکن اب تک خاموش تھی۔ اس کا چہرہ شرم سے گلابی نہیں ہوا تھا۔ خوف سے سپید پڑ گیا تھا۔ جواد نے ہولے ہولے اس کے ہاتھ تھپتھپائے اور ملائمت سے بولا۔

''تمت! میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے نا۔ بتاؤ مجھے۔''

تمت نے اپنا اترا اترا سا چہرہ اوپر اٹھایا اور کھوئی ہوئی سی بولی۔

''کیا جواد بھائی؟''

☆......☆......☆

جواد کو اس کے انداز پر غصہ اور پیار ایک ساتھ ہی آیا۔ اس کے شانے کے گرد بازو لپیٹ کر اس اپنے ساتھ لگا لیا اور ایک ہاتھ سے اس کا چہرہ اونچا کرتے ہوئے بولا۔

''سنو تمت! میں نے پوچھا ہے کہ تم مجھ سے شادی کرو گی۔'' تمت نے حیرانی سے اپنے چہرے کے برابر جواد کے خوبصورت چہرے کو دیکھا اور چند لمحے تکتی رہی۔ اس کے خشک ہونٹ کانپ رہے تھے۔ ایک دم ہی وہ اس سے الگ ہو گئی جیسے ڈر گئی ہو۔ پھر سہمی ہوئی سی بولی۔

''جواد بھائی! آپ تو اتنے اچھے ہیں۔''

جواد اس کی حالت سمجھ رہا تھا۔ اس لئے عجلت میں اس نے بات بڑھائی۔

''تو پھر؟''

''پھر پھر یہ کہ میں تو اتنی بری ہوں۔ آپ کے ساتھ کیسی لگوں گی۔'' گڑیا کی کبھی کی کہی ہوئی بات نہ جانے ذہن کے کس گوشے سے ابھر کر اس کے لبوں تک آ گئی۔

''اس کی فکر مجھے ہونی چاہیے' تمہیں نہیں۔'' جواد نے ملائمت سے کہا۔ اسے اس پر رحم آ رہا تھا۔ یہ چھوٹی سی معصوم ہستی۔ دوسروں کے طعنوں سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔

''نہیں تو جواد بھائی! یہ اچھی بات نہیں۔'' وہ ابھی تک سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔

''کیوں اچھی بات کیوں نہیں۔ ظاہر ہے میں تمہیں اغوا تو کر کے نہیں لے جا رہا۔'' جواد نے یونہی خوشگوار لہجے میں کہا۔ تاکہ فضا کا بوجھل پن کم ہو لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اب بھی ویسی ہی سنجیدگی سے کچھ سوچ رہی تھی۔ وہ یوں خالی خالی نظروں سے اس کی جانب دیکھتی تھی جیسے پاگل ہو۔

واقعی وہ پاگل ہو رہی تھی۔ وہ خود کو اس قدر بدصورت سمجھتی تھی اسے گمان بھی نہیں تھا کہ کوئی یوں اس سے شادی کی درخواست کر سکتا ہے لیکن جواد بھائی مجھ سے کیوں شادی کرنے لگے۔ وہ شاید مجھ پر رحم کھا رہے ہیں ورنہ انہیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ گڑیا جیسی دلکش لڑکی کے بجائے مجھ سے شادی کرتے پھریں۔

"جواد بھائی! آپ مجھ پر ترس کھاتے ہیں نا؟" دل کا اندیشہ زبان پر آ ہی گیا۔

جواد حیران ہوا۔ اس کی انا بیدار ہو رہی تھی۔

"کیوں یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟"

"تو پھر آپ گڑیا سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"بھئی گڑیا تو گڑیا ہے۔ اس سے شادی نہیں کی جا سکتی نا۔"

وہ ہونق سی بنی اس کا منہ تکنے لگی۔ پھر جلدی سے اٹھ کر اس نے اپنا پرس اٹھایا اور دروازے کی سمت چلی۔

"بس میں چلی جاتی ہوں۔" وہ جیسے خود سے مخاطب ہوئی۔

جواد نے اس کا راستہ روک لیا۔ "تم میری بات سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ تم مجھے بے حد عزیز ہو۔ میں صرف تم سے تمہاری رائے لینا چاہتا ہوں۔ تمہیں تمہاری اہمیت کا احساس دلانا چاہتا ہوں ورنہ تو تمہاری اماں بی سے بھی میں تمہارا ہاتھ مانگ سکتا ہوں۔ پھر میں دیکھتا اماں بی کے سامنے تم کس طرح سے انکار کرتیں۔"

تمت گم صم سی بنا پلک جھپکے اس کی طرف دیکھتی گئی۔ "آپ مجھ جیسی چڑیل سے شادی کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

جواد چونک سا گیا۔ اگر وہ اس طرح سے اچانک یہ بات نہ کہتی تو جواد کو شاید عمر بھر یاد نہ آتا کہ ایک بار یہی بات اس نے چڑ کر تمت سے کہی تھی لیکن وہ اپنی اس بات پر نادم نہیں ہوا بلکہ زوردار لہجے میں بولا۔

"اچھا ہوا تم نے یاد دلایا۔ اس وقت بھی میں نے یہ بات تمہیں چڑ کر کہی تھی جب تم بغیر سوچے سمجھے عمران سے شادی کرنے پر تیار ہو گئی تھیں۔ اس وقت بھی میرے یہی ارادے تھے اور آج بھی میرا یہی فیصلہ ہے۔ میں صرف تمہیں زندگی کے اہم فیصلوں کو خود اعتمادی سے طے کرنا سکھانا چاہتا ہوں ورنہ تو اس گندی سی لڑکی کو میں کان پکڑ کر ساتھ لے جاؤں۔"

اس نے شرارت سے اس کا کان کھینچا لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا وہ اب بھی دنیا و مافیہا سے بے خبر کھڑی تھی۔

جواد نے کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔ "چلو میں تمہیں ہوسٹل چھوڑ آؤں۔"

اور جب وہ ہوسٹل کے گیٹ میں داخل ہوئی تو جواد نے کہا۔

"تمو! مجھے جلدی نہیں، تم خوب اطمینان سے اس پر سوچنا۔"

جواد بھائی نے یہ کیا کہہ دیا تھا۔ وہ حیران کن سوچوں کے بھنور میں چکرا کر رہ گئی۔ حیات کا یہ سرمدی پہلو اس کے لئے اب تک انجانا دیس تھا۔ اس نے کبھی اس گلستان کی سیر نہیں کی تھی۔ بہاروں کے اس لافانی مسکن میں کبھی جھانک کر نہیں دیکھا تھا۔ اجالوں کا یہ جہان اس کی نگاہوں کی پہنچ سے کتنا دور تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ انجانے جذبات یہ چھتا سرور چاہت کے یہ شرمیلے انداز اس کیلئے اک ایسی کتاب تھے جو کسی اور زبان میں لکھی ہو جس سے وہ ناواقف ہو۔ اک ایسا میٹھا نغمہ تھا جس کی مدھرتا اس کیلئے نہیں تھی۔

بچپن سے اب تک اس کے ذہن میں یہی ڈالا گیا تھا کہ وہ بے انتہا بدصورت ہے۔ گڑیا کی غیر معمولی خوبصورتی اور بے انتہا غرور نے اس کے تصور کو اور بھی پختہ کر دیا تھا۔ سب کی بے توجہی اور طعنوں نے اسے پیار سے ناآشنا ہی رکھا تھا۔ اسے وہ پیار بھی کتنی طلب اور ریاضت کے بعد ملا تھا جو بیٹیوں کا حق ہے۔

ہزاروں بار اس نے اماں بی اور دوسری ملنے والیوں کو تاسف سے کہتے سنا تھا کہ تمت کو کون بیاہ لے جائے گا۔ اسے عمران بھائی کی باتیں یاد آ گئیں جنہیں اس کا رشتہ بھی پیش کیا گیا تھا لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ ڈاکٹر فرحان نے بھی کتنی نفرت سے کہا تھا۔ "اپنی صورت آئینے میں دیکھو۔" اس کی کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ اسے تو کوئی پیار نہیں کر سکتا۔ پھر جواد بھائی اسے تنگ کرنے پر کیوں تلے ہیں۔ مگر ان کی نرالی باتیں، ان کی دھیمی دھیمی مسکراہٹیں اس کے دل میں ایک عجیب سا جذبہ بیدار کر رہی تھیں نجانے کیوں اس کا جی چاہتا تھا کہ ایک بار ان کے سینے سے لگ کر اتنا روئے کہ ساری تلخیاں، ساری باتیں اس میں بہہ جائیں۔ اس کی سوچیں اتنی محدود تھیں کہ جذبات کے ان لطیف گوشوں تک ان کی پہنچ ہی نہیں تھی، وہ بھی اک نوجوان لڑکی تھی لیکن اس کا دل امنگوں سے خالی تھا۔ اس کی روح خواہشات کے گرداب سے آزاد تھی۔ اس نے زمین پر قدم رکھ کر کبھی چاند کی تمنا نہیں کی تھی۔ اس نے چندھیائی

آنکھوں سے کبھی سورج کو نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ست رنگی دھنک کو کبھی آنکھوں میں بھر لینے کو بھی نہیں سوچا تھا۔ اندھیری راتوں میں رہتے بستے ہوئے اس نے کبھی دمکتے ستاروں کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔

وہ جواد بھائی کی باتوں کا یقین کیوں نہیں کر لیتی۔ اسے دل کی گواہی بھی جھوٹی لگتی تھی۔ اسے اپنی سماعت ہی اک دھوکہ معلوم ہوتی تھی۔ اسے اپنی بینائی پر شبہ تھا۔ اپنے اردگرد پھیلے مانوس اندھیرے میں چمکتے ہوئے اکلوتے ستارے کو دیکھ کر وہ کیوں سمجھ لیتی کہ یہ اس کے مقدر کا ستارہ ہے' اس کی سراب دیدہ آنکھیں کسی نخلستان پر اعتبار نہیں کرتی تھیں۔ وہ ریت کے اڑتے ہوئے گرم ذروں میں پا پیادہ تنہا تھی۔ اس نے کسی کارواں کے آنے کی امید نہیں لگا رکھی تھی۔

محرومیوں کے درمیان رہنے کی اس کو عادت سی ہو گئی تھی۔ ناتمام آرزوؤں' ناآسودہ تمناؤں کا زہر پیتے پیتے وہ بے حس ہو کر رہ گئی تھی۔ جواد بھائی بھی تو مجھ پر ترس کھاتے ہیں۔ اس نے کرب سے سوچا اور اذیت سے ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ شاید میں اسی لئے دنیا میں آئی ہوں کہ کوئی مجھ پر ترس کھائے اور کوئی میرا مذاق اڑائے۔

''میرے اللہ! بدصورتی کوئی گناہ تو نہیں۔''

ڈاکٹر فرحان کا پارہ آج ایک سو اسی ڈگری پر تھا۔ اس لئے کہ آج ان کا ایمرجنسی ڈے تھا۔ مشکل سے کہیں جان چھڑا کر آئے ہی تھے کہ نرس لپکی۔

''ڈاکٹر صاحب! بچے کی حالت پھر خراب ہو گئی ہے۔''

''کیا مصیبت ہے۔'' وہ بڑبڑائے لیکن تمت کو متوجہ دیکھ کر انہیں اٹھنا ہی پڑا۔ انہیں علم تھا کہ اگر وہ نہیں گئے تو تمت اٹھ کر چلی جائے گی۔ بعد میں تکرار کے مواقع الگ پیدا ہوں گے۔ وہ اس دن کے بعد اب تمت سے الجھنے سے کترانے لگے تھے۔ نرس کے پیچھے ہی کوئی صاحب لشم پشتم آئے۔

''ڈاکٹر صاحب! جلدی کیجئے۔ پلیز۔''

''آپ چلئے میں آتا ہوں۔'' ڈاکٹر فرحان نے درشتی سے کہا۔ اوور آل پہنتے ہوئے ان کے پیچھے ہی نکل گئے۔

تمت کسی کام سے گیلری میں آئی تو دیکھا ڈاکٹر فرحان اور وہی صاحب

سامنے سے چلے آتے ہیں۔ تمت نے غور سے دیکھا۔ پھر دیکھا اور ایک لمحے کو یقین کرتی رہی کہ جو کچھ وہ دیکھ رہی ہے حقیقت ہے یا نظر کا دھوکہ اور پھر بجلی کی سی تیزی سے بھاگتی چلی آئی۔ ڈاکٹر فرحان نے اسے یوں دیوانوں کی طرح بھاگتے دیکھا تو اس کو دماغ کی خرابی میں انہیں کوئی شک نہیں رہ گیا۔ ان کے ہمراہ چلنے والے صاحب بھی ایک لمحے کو ٹھٹک گئے کہ اچھی بھلی ڈاکٹر پر کیا مصیبت آن پڑی لیکن اگلے ہی لمحے وہ ان کے قریب آ رکی۔ وہ بھی تھم گئے۔

اردگرد کا خیال کیے بغیر ہی اس نے دونوں بانہیں ان صاحب کے گلے میں ڈال دیں اور بری طرح لپٹ گئی۔ وہ صاحب تو بھونچکے سے رہ گئے۔ ڈاکٹر فرحان کا چہرہ بھی فق ہو گیا۔ وہ صاحب اسے الگ کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔

''محسن بھائی! محسن بھائی! آپ کہاں چلے گئے تھے۔'' وہ ہانپ رہی تھی۔

''میں تو آپ کو اتنا یاد کرتی ہوں۔ ہر وقت یاد کرتی ہوں۔ آپ مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔'' انہوں نے اس کا چہرہ اٹھا کر غور سے دیکھا جس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پھر بے ساختہ بولے۔

''ارے تم تمت ہو؟''

''ہاں ہاں محسن بھائی!'' اس نے زور زور سے اثبات میں سر ہلایا اور ایک بار پھر ان سے لپٹ گئی۔ وہ نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی لیکن کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس کی آواز مسرت سے کانپ رہی تھی۔

ڈاکٹر فرحان نے غور سے ان پختہ عمر صاحب کی طرف دیکھا جو اب ڈاکٹر تمت سے بھی زیادہ خوش معلوم ہوتے تھے اور بار بار اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے تھے۔ اردگرد سے گزرتی ہوئی نرسیں اور عملے کے دوسرے لوگ بھی ٹھہر ٹھہر کر دیکھنے لگے۔

''ارے چندا!'' انہوں نے اسے خود سے الگ کیا لیکن اب بھی وہ ان کے بازو میں ہاتھ ڈال کر ان کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ محسن بھائی نے پھر اک نگاہ اس پر ڈالی۔

''بھئی تم تو بہت بڑی ہوگئی ہو۔ ہیں!!!''

وہ آنسوؤں میں ہنس رہی تھی اور ہنسنے میں رو رہی تھی۔ اس نے بھی اک نگاہ اپنے سراپے پر ڈالی اور بھولپن سے بولی۔

''محسن بھائی! دیکھا میں کتنی بڑی ہو گئی ہوں اور آپ اب آئے ہیں' بس میں نہیں بولتی۔'' وہ لاڈلے بچوں کی طرح ٹھنک رہی تھی لیکن ان کے شانے سے لگی ہوئی تھی۔

''ہوں' مجھ سے نہیں بولتی ہو۔'' انہوں نے دلار سے کہا۔

''نہیں نہیں بولتی ہوں۔'' وہ جلدی سے بولی اور پھر خود ہی ہنس پڑی۔

''اچھا تو تم ڈاکٹر بن گئی ہو۔''

''ہوں۔'' وہ بچوں کی طرح کھلکھلائی۔

''میں نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ میں ڈاکٹر بنوں گی' آپ کیلئے۔''

''واہ بھئی واہ! ہماری تمو تو سچ مچ ہی ڈاکٹر بن گئی۔'' وہ جیسے آج سے کئی سال پہلے کے زمانے میں پہنچ گئے تھے۔ جب تمت چھوٹی سی بچی تھی جو ہر وقت ان کے گھٹنے سے لگی رہتی تھی۔ وہ اسے پیار سے بہلاتے تھے۔

''محسن بھائی! آپ نے تو مجھے کبھی خط بھی نہیں لکھا۔'' وہ پھر رو پڑی۔

''تمو! پاگل ہوگئی ہو' روتی کیوں ہو۔'' وہ تڑپ اٹھے۔

''بس میں تو روؤں گی اور بھی روؤں گی۔ آپ مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے۔'' اس کی آنکھوں میں بھرے آنسو موتیوں کی طرح اس کے گالوں پر لڑھکتے آ رہے تھے۔ وہ انگوٹھا چوس رہی تھی۔

''انگوٹھا چوستی ہو اب تک' ہے گندی بچی!''

انہوں نے انگوٹھا اس کے منہ سے نکالا۔ اس کے آنسو پونچھتے ہوئے انہیں وہی چھوٹی سی تمت یاد آ گئی جو اب بھی ویسی ہی تھی۔ بھولی اور معصوم جیسے چھوٹی سی نادان بچی ہو۔ انہوں نے بے ساختہ اس کی پیشانی چوم لی۔

ڈاکٹر فرحان نے حیرت سے ان کی اس بے باکی کو دیکھا۔

''شاید بھائی ہیں ان کے۔'' وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے۔

''خبردار! جو تم اب روئیں۔ نہیں تو میں پھر جاتا ہوں۔''

''نہیں نہیں محسن بھائی!'' اس نے جلدی سے آنکھیں پونچھ کر ان کے کوٹ کی آستین پکڑی تھی۔

''اب تو میں نہیں روتی۔ کوئی بھی نہیں روتی۔'' محسن بھائی نے دیکھا کہ لوگ زیادہ متوجہ ہو رہے ہیں تو ڈاکٹر فرحان سے بولے۔

''معاف کیجئے ڈاکٹر صاحب! دراصل ہم لوگ ایک عرصے بعد ملے ہیں۔''

تمت جلدی سے بولی۔ ''ڈاکٹر فرحان یہ محسن بھائی ہیں۔''

نرس تمت کو بلانے آ گئی۔ ''مائی گڈنیس۔'' تمت نے گھڑی دیکھی۔ ''محسن بھائی! آپ جائیں نہیں۔ میں ابھی آ جاؤں گی۔'' وہ اس طرح کہہ رہی تھی جیسے انہیں پھر کھو دینے کا اندیشہ ہو۔

''ڈاکٹر تمت آپ پسند کریں تو میں آپ کی جگہ چلا جاتا ہوں۔'' ڈاکٹر فرحان نے پیشکش کی۔

''جی ہاں ہاں۔'' اس کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں لیکن پھر خاموش سی ہو کر بولی۔

''ڈاکٹر فرحان آپ تو' میرا مطلب ہے میں خود ہی چلی جاتی ہوں۔''

''مہربانی آپ کی' میں خود ہی اپنے مریضوں کو دیکھ لوں گی۔'' وہ اٹھتی ہوئی بولی۔

ڈاکٹر فرحان کا پارہ ہائی ہوا۔ ''آپ انکار کیوں کر رہی ہیں۔'' انہوں نے پوچھا تو تمت سٹپٹا گئی۔ ''وہ دراصل میرا مطلب ہے کہ آپ کو تکلیف ہو گی۔''

محسن بھائی نے مداخلت کی۔ ''تمت! تم جاؤ۔ میں بوبی کے پاس ہوں۔ تم آ جانا وہیں۔ مجھے تو اس کا خیال ہی نہیں رہا۔ عذرا پریشان ہو گی۔'' وہ اٹھ کر عجلت میں کمرے سے نکل گئے۔

ڈاکٹر فرحان کا غصہ اب تک ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔

☆......☆......☆

"آپ کیوں انکار کر رہی تھیں۔" انہوں نے تیزی سے کہا۔

تمت جواب تک محسن بھائی کے خیالوں میں تھی چونک گئی۔ ڈاکٹر فرحان نے پھر پوچھا تو وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

"دراصل میں اپنے فرائض میں غفلت نہیں کرنا چاہتی۔"

"تو گویا میں غفلت برتتا ہوں۔"

"یہ میں نے نہیں کہا۔ آپ خود کہہ رہے ہیں۔" وہ تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔

وہ کتنی خوش تھی۔ پاؤں کہیں رکھتی تھی اور پڑتا کہیں تھا۔ ایسے خواب تو اس نے ہزاروں بار دیکھے تھے کہ محسن بھائی اچانک کہیں سے آ جاتے ہیں لیکن یہ خواب کبھی حقیقت بنیں گے اسے یقین نہیں آ رہا تھا' اس کا جی چاہتا تھا کہ انہیں سامنے بٹھا کر دیکھتی چلی جائے یہاں تک کہ اسے یقین آ جائے۔

آج کا دن کتنا مسرت انگیز ہے' خوشیوں سے لدا ہوا۔ شادمانیوں کا پیامبر

وہ راؤنڈ لے کر گیلری میں سے ہوتی ہوئی آئی۔ اب کمرے کے باہر محسن بھائی متفکر کھڑے تھے۔

"محسن بھائی! کیا بات ہے؟"

"تمو! بوبی سخت بیمار ہے۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں۔ ڈاکٹر اتنی توجہ نہیں دیتے۔ اسے کچھ ہو گیا تو اس کی ماں مر جائے گی۔"

"چلئے دیکھیں۔" وہ آگے بڑھی۔

دروازہ کھول کر اندر گئے تو ایک خوبصورت سی لڑکی جو بچے کے سرہانے بیٹھی

تھی' تیزی سے اٹھ کر محسن بھائی کی طرف بڑھی۔

"آپ ڈاکٹر کو لے آئے۔ میرے بوبی کو کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی۔"

وہ رو پڑی۔ محسن بھائی نے ہولے سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"عذرا تم حوصلہ رکھو نا۔ دعا کرو بیٹے کیلئے۔ دیکھو میں ڈاکٹر کو لے آیا۔ یہ وہی تمت ہے جس کے بارے میں میں نے تمہیں بتایا تھا۔"

لیکن وہ بچے کیلئے اس قدر پریشان تھی کہ وہ تمت کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔

کتنی خوبصورت آنکھیں ہیں ان کی' اچھا ہوا محسن بھائی نے شادی کر لی۔ اس نے خوش ہو کر سوچا اور بچے پر جھک گئی۔ بچے کی حالت خطرناک نہیں تھی۔ موسمی بخار تھا جو بے توجہی سے بگڑ گیا تھا۔ اس نے دونوں کو تسلیاں دیں کہ پریشان ہونے کی بات نہیں۔ اس کا ٹمپریچر جلد کم ہو جائے گا۔

اس کا کتنا جی چاہ رہا تھا کہ ان سے ان کی شادی کے متعلق پوچھے لیکن وہ دونوں اس قدر پریشان تھے کہ ایسا کوئی استفسار بے موقع ٹھہرتا۔ اسے میٹنگ میں جانا تھا۔ شام کو چھٹی پر تھی۔ ان کے فلیٹ کا ایڈریس لے کر وہ مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی چلی آئی۔

ڈاکٹر فرحان سے سامنا ہوا تو پھر تکرار ہو گئی۔ اسے ویسے بھی ان پر سخت غصہ تھا۔ انہوں نے اس پیشے کو مذاق بنا رکھا تھا۔

"ڈاکٹر فرحان محض آپ کی غفلت کی وجہ سے بچے کی ایسی حالت ہوئی۔" اس نے صاف کہہ دیا۔

ڈاکٹر فرحان آگ بگولہ ہو گئے۔ "ڈاکٹر تمت! آپ کو مجھ پر الزام تراشی کا حق نہیں۔"

"آپ کو بھی دوسروں کی زندگی سے کھیلنے کا حق نہیں۔"

"آپ کو سوچ کر بات کرنی چاہیے۔ اس کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔"

"میں یہی احساس آپ کو دلانا چاہتی ہوں کہ آپ کی ذرا سی غفلت کے نتائج کیا سے کیا ہو سکتے ہیں۔"

"شٹ اپ!" ڈاکٹر فرحان آپے سے باہر ہو گئے۔

"آئندہ آپ میرے کسی مریض کو نہیں دیکھیں گی۔" انہوں نے ڈپٹ کر کہا۔

"ظاہر ہے جب آپ نہیں دیکھیں گے تو کسی دوسرے کو ہی دیکھنا پڑے گا۔ ویسے آپ جیسے مہذب انسان کو خواتین سے بات کرنے کے آداب تو آتے ہوں گے۔"

ڈاکٹر فرحان کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس کو کیا نہ کہہ دیں۔ ایک بار دانت پیس کر وہ کچھ کہنے ہی والے تھے کہ تمت نے مفاہمت کے انداز میں کہا۔ "ڈاکٹر فرحان! آپ دوسروں کو اپنی جگہ رکھ کر سوچیں۔ اگر آپ کا کوئی عزیز خدانخواستہ بیمار ہو اور ڈاکٹر اس کی طرف سے غفلت برتیں تو آپ کا کیا حال ہو۔ آپ کو کیا محسوس ہو۔"

"ڈاکٹر تمت! شکریہ مشورے کا۔" انہوں نے الفاظ منہ پر کھینچ مارے۔ "لیکن میں اور بات بڑھانا نہیں چاہتا۔" انہوں نے درشتی سے کہا اور دوسری طرف مڑ گئے۔

دن کی اس جھڑپ کا ڈاکٹر فرحان پر خاصا اثر ہوا۔ وہ شام کو محسن بھائی سے ملنے گئی تو معلوم ہوا کہ بچے کو ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر فرحان نے بھی اس پر توجہ دی تھی اور ظاہر ہے کہ بچہ گھر چلا گیا تھا تو محسن بھائی اب کہاں؟ اس نے گھڑی دیکھی تو وقت زیادہ ہو رہا تھا۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ چھپٹی اندھیرا نیچے اترتا آ رہا تھا۔ اس نے سوچا کل ہی ان کی طرف جائے گی۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ اس نے ان کا ایڈریس لے لیا تھا۔

محسن بھائی کے اس طرح اچانک مل جانے سے وہ کتنی مسرور ہوئی تھی۔ پل بھر میں سب تلخیاں یوں بھول گئی تھی جس طرح بچپن میں؛ وہ ان کی گود میں دبک کر روتی روتی ہنس پڑتی تھی۔

"ویسے کے ویسے تو ہیں محسن بھائی۔" اس نے پیار سے سوچا۔ کنپٹیوں پر سفید بال کتنے اچھے لگتے تھے۔ کتنے باوقار نظر آتے ہیں۔ ایک شبو آپا بھی نری جاہل ہیں۔ خرم بھائی سے تو محسن بھائی لاکھ درجہ اچھے ہیں۔ چلو ان کی بھی ایسی خوبصورت بیوی ہے۔ سب دیکھیں تو حیران رہ جائیں۔ اس نے خوش ہو کر سوچا۔

"یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو اور میں وہاں جناب کو ہوسٹل میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔ تمہاری تو آج ڈیوٹی نہیں تھی۔" تمت نے چونک کر دیکھا۔ جواد بھائی کھڑے تھے۔ ہاتھ میں بیگ تھا۔

"آپ جا رہے ہیں۔" اس نے جیسے اطمینان کا سانس لیا۔

"ہاں تم خوش ہو جاؤ کہ ہم جا رہے ہیں۔" جواد نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ وہ جواد کو اپنا ہمدرد سمجھ کر اس سے بہت سی دل کی باتیں کر لیتی تھی لیکن اب اس سے اس قدر جھجک ہوتی تھی کہ سامنا کرنا دشوار تھا۔

"اچھا تو جواد بھائی! سب کو سلام کہہ دیجئے گا۔ ایک دو روز کیلئے میں بھی آؤں گی۔"

"خیر اس طرح تو میں ٹلنے والا نہیں۔ چلو میرے ساتھ کہیں چائے پیتے ہیں۔ پھر تم بے شک مجھے رخصت کر دینا۔" جواد نے مزاحیہ انداز میں کہا تو تمت گڑبڑا گئی۔ ڈرتے ڈرتے بولی۔

"جواد بھائی! مجھے دیر ہو جائے گی۔"

"دو جھانپڑ نہ کھا لینا مجھ سے دیر ہو جائے گی سمجھ گئیں۔"

تمت سہم کر رہ گئی۔ وہ جواد کے ہاتھوں تماشا نہیں بننا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ ان کی بات مان لیتی تو سب گھر والے کیا کہتے۔ گڑیا تو اس کا جینا حرام کر دیتی۔ یہ بھی خیریت ہوئی کہ وہ دو تین روز خاصے مصروف رہے جو اس سے ملنے نہیں آ سکے تھے اور آج ان کا سفری بیگ ہمراہ دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ وہ جا رہے ہیں اسی لئے تو اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ وہ انہیں اس فیاضی سے خود پر رحم کھانے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

"اب چلو بھی کہ اٹھا کر لے چلوں۔" وہ آج اچھے موڈ میں تھے۔ تمت سے انکار نہ ہو سکا۔ ان کے ساتھ ساتھ بادل نخواستہ چل پڑی۔ جواد بھائی نے اس کی جانب رخ پھیرا اور بولے۔ "میرا خیال ہے اتنے دنوں میں تم نے خوب سوچ لیا ہو گا۔" تمت نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے چلتی گئی۔ جواد بھائی سے اسے خوف سا آنے لگا تھا۔ انہیں دیکھ کر اس کے دل میں عجیب سی دھڑکنیں بیدار ہونے لگتیں۔ دل

یوں دھڑکتا تھا جیسے اس کے بعد پھر کبھی نہیں دھڑکے گا۔ ان کے برابر چلتے ہوئے اسے یوں لگتا تھا جیسے اس کا ہر قدم اک بلندی پر پڑتا ہے اور وہ اتنی بلندی پر چلی جاتی ہے جہاں سب آئینے دھندلے ہو گئے ہیں۔ کسی میں اس کی بدصورتی کا عکس نہیں پڑتا۔ کوئی اس کے منہ پر سچ کے چھینٹے نہیں اڑاتا اور جواد کو وہ چھو سکتی ہے' اسے دیکھ سکتی ہے' اس کو محسوس کر سکتی ہے۔

جواد نے اس کے بازو کو چھوا۔ ''اب بھی کچھ سوچنے کو باقی ہے۔''

وہ چونک گئی۔ اس کی طرف اجنبی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ''میں' میں تو کچھ بھی نہیں سوچ رہی۔''

''خیر' اگر نہیں سوچ رہی تھیں تو اب سوچ لو۔''

''جواد بھائی!'' وہ جھجک سی گئی۔

''کہو۔'' وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ جواد کو گمان تھا کہ اگلے ہی لمحے وہ کوئی ایسی بات کہہ ڈالے گی جو اس کے دل کی بات ہو گی۔ جو اک نیا پیام لے کر آئے گی اور وہ اک دم خوشی سے اسے بازوؤں سے پکڑ کر گھما دے گا اور وہ حیران رہ جائے گی۔ ہمیشہ کی طرح سہم کر ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھتی جائے گی۔ اس کی اسی معصومیت سے تو اسے پیار تھا۔ اس پرفریب' الجھتی اور جھگڑتی دنیا میں وہ اس کی شہزادی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اس کے برابر چلتی ہوئی یوں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی تھی جیسے زمین اس کے پاؤں کے نیچے نہ ٹھہرتی ہو۔

''تمت کیا کہنے والی تھیں تم۔''

''میں' میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔''

''ابھی ابھی تو تم نے کہا ہے۔'' جواد نے ڈپٹ کر کہا تو وہ سراسیمہ ہو گئی۔

''سچ سچ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا؟''

''اچھا تو پھر کیوں نہیں کہا۔'' اس نے جان بوجھ کر ڈانٹا تو وہ روہانسی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی اور بے بسی سے بولی۔

''جواد بھائی! کیا کہوں؟''

''تمو جی! جو میں نے پوچھا ہے اس کا جواب دو۔''

وہ پھر متذبذب سی ہاتھ ملتی ہوئی التجا آمیز لہجے میں بولی۔

''جواد بھائی! آپ مجھے معاف کر دیں۔''

''کیوں بھئی' تم نے میرا کیا قصور کیا ہے جو میں تمہیں معاف کرتا پھروں۔''

''نہیں نہیں جواد بھائی! میں مر جاؤں گی۔''

جواد بے حد پریشان ہوا۔ اسے تسلی دیتا ہوا بولا۔

''تمو! پلیز بھئی تم روؤ تو نہیں۔ ارے بابا! میں ابھی کچھ نہیں کہتا' کچھ نہیں کہتا' پھر کبھی سہی۔''

پھر ہوٹل میں بیٹھ کر انہوں نے چائے پی۔ کچھ دیر باہر ٹھہرے بھی رہے لیکن جواد نے وہ بات نہیں چھیڑی وہ چاہتا تھا کہ اسے سمجھنے سوچنے کیلئے کچھ وقت دیا جا سکے۔ اسے اس نفسیاتی خلجان سے نکلنے کیلئے کچھ وقت درکار تھا۔ رفاقت کی ہمیشگی کو جنم دینے کیلئے مفارقت کے کئی لمحے درکار تھے۔ اس کی زندگی جو نفی کی پیداوار تھی۔ اس میں اثبات کی گنجائش پیدا کرنا بڑا صبر آزما تھا۔ وہ اسے سوچوں کے اس گرداب سے از خود نمودار ہونے کیلئے چھوڑے جا رہا تھا۔ اسے جذبات کی موجوں سے لڑ کر خود ساحل تک آنا چاہیے تھا تاکہ کوئی محرومی' کوئی پشیمانی' کوئی پچھتاوا اس کے قدم نہ ڈگمگا سکے۔ اس کا دامن نہ کھینچ سکے۔

اسی لئے تو رخصت ہوتے وقت اس نے ایک لمحے کو اسے بازوؤں میں لے لیا تھا۔ اس کی پیشانی سے پیشانی ٹکراتے ہوئے اس نے اک گمبھیر سرگوشی کی تھی۔

''تمت! تم میری ہو۔'' ایسی سرگوشی جس سے صدائیں آ آ کے لپٹتی تھیں جس سے نغمے سے پھوٹتے تھے جس میں ساز سے بجتے تھے جو فراموش ہو کر بھی روح میں جاگتی رہے لیکن یادوں کے افق پر شفق سی بن کر پھیل جائے۔

وہ ان قربتوں سے اس میں لمس کا احساس جگانا چاہتا تھا جو اس کی حسوں کو چھیڑ کر ایک نغمے کی تخلیق کر دے۔ وہ اسے چھو کر بچپنے کی گہری نیند سے بیدار کرنا چاہتا تھا۔ وہ لطیف احساسات سے آنکھیں بند کیے رہتی تھی۔ اسے ایک دم چونکا کر اس کی مندمی آنکھیں کھلوانا چاہتا تھا۔

تمت جو اس کی اچانک حرکت پر حیران رہ گئی تھی وہیں کھڑی کانپتی

رہی۔ جیسے موسلا دھار بارش میں چند لمحوں کو کسی نے اس پر سایہ کر کے ہٹالیا ہو اور اب وہ کھڑی شرابور ہوئی جاتی ہو۔ کھلی فضا میں بھی دم گھٹا گھٹا سا جاتا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اگلے ہی لمحے کسی نے اسے بازوؤں میں نہیں لے لیا تو وہ ٹوٹ ٹوٹ کر رہ جائے گی، بکھر بکھر جائے گی۔ اس کی سانسیں یہیں پر رک جائیں گی۔

نئے بنے ہوئے بالکل ایک جیسے چھوٹے چھوٹے فلیٹوں کے سامنے وہ ٹیکسی سے اتری اور بڑے غور سے ایک ایک نمبر دیکھتے ہوئے اس نے اک دروازے کی کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ گھنٹی زور سے چیخی اور وہ بے قراری سے دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ جذباتی ہیجان سے وہ گھٹ کر رہ گئی تھی۔ آنسوؤں میں جیسے گلے گلے ڈوبی تھی۔ ہمیشہ کی طرح وہ سہمی ہوئی سی، بسورتی ہوئی محسن بھائی کے دروازے پر کھڑی تھی۔

زندگی کی بوالعجبیوں نے اسے اس طرح بے دست و پا کر دیا تھا کہ وہ محسن بھائی کی پناہ ڈھونڈنے لگی تھی۔ جواد کے انوکھے سوال نے اسے چکرا کے رکھ دیا تھا۔ وہ سہم کر محسن بھائی کا گھر ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ اسی طرح جیسے بچپن میں ڈانٹ کھا کر سب کی جھڑکیاں سہہ کر وہ محسن بھائی کی گود میں آ کر رو دیتی تھی۔ ان کی پناہ میں تحفظ کے نرم گرم احساس تلے وہ سب کی سرد مہری بھول جاتی تھی۔

دروازہ اب بھی نہیں کھلا تو اس نے انگلی گھنٹی پر ہی رکھ دی اور اس وقت تک نہیں ہٹائی جب تک کہ کسی نے جھنجلا کر دروازہ نہیں کھول دیا۔

''تمو! چندا یہ تم ہو۔'' محسن بھائی نے مسرت سے چمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

''آ جاؤ نا، کھڑی کیوں ہو۔'' وہ ایک جانب ہٹ گئے۔ وہ یوں چلی جیسے کسی نے دھکا دے دیا ہو۔

☆......☆......☆

''محسن بھائی!'' اک سسکاری اس کے لبوں سے پھسلی۔ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر دیوار سے لگی رونے لگی۔ محسن بھائی پریشان ہو گئے۔ یہ تو بالکل ویسی کی ویسی چھوٹی سی تمت ہے۔ انہوں نے تو سمجھا تھا کہ شاید اب وہ کچھ بدل گئی ہوگی۔ ننھی

سی یہ معصوم روح اب تک محرومیوں میں گھری ہے۔ انہوں نے مغموم ہو کر سوچا اور پیار سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''تمو! کیا ہو گیا چندا؟''

اس نے مضبوطی سے ان کا بازو پکڑ لیا اور روتی چلی گئی۔ محسن بھائی خود کو اس کی بے قرار سسکیوں اور بے بس آنسوؤں کے طوفان میں ہچکولے لیتے ہوئے محسوس کرنے لگے۔ وہ اک عرصے بعد ملی بھی تھی تو آنسو بھری آنکھوں سے۔

''تمت! پلیز روؤ مت۔'' انہوں نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ اس کا آنسوؤں میں بھیگا ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹانے لگے۔ اس نے مزاحمت نہیں کی۔ چپ چاپ اپنا ہاتھ ہٹا دیا اور کچھ دیر ان کے سینے سے لگی ہچکیاں لیتی رہی۔ ایسی دلدوز ہچکیاں جو آنسوؤں سے زیادہ غمناک ہوتی ہیں جیسے درد آواز میں ڈھل گیا ہو، جیسے آنسو صدا بن گئے ہوں۔ محسن بھائی نے بھی اس کے کانپتے ہوئے وجود کو خود سے الگ نہیں کیا۔ وہ جو غم و اندوہ، محرومیوں اور حرماں نصیبیوں کا اک مادی روپ تھا۔ دوشیزگی کے ان پر بہار دنوں میں اس پر کیا بیت گئی تھی۔ وہ اس سے بے خبر ہوتے ہوئے بھی ویسی ہی ٹیس اپنے دل میں بھی محسوس کر رہے تھے جو اس کے لب کی آہ بن گئی تھی۔

وہ رفتہ رفتہ پرسکون ہو گئی۔ محسن بھائی نے اسے صوفے پر بٹھا دیا۔ اس چھوٹے ڈرائنگ روم میں ہر دیوار اس کی حفاظت میں سینہ تانے تھی۔ یہاں کا ذرہ ذرہ اس کا محافظ تھا۔ ہوا کتنی گمبھیر اور اس کے گرد لپٹی لپٹی سی تھی جیسے لباس پر کوئی اور لبادہ اوڑھ لیا ہو۔ اس کا دل ہلکا پھول سا ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ وہ اتنی پرسکون تو کبھی بھی نہیں تھی۔ غم و اندوہ کی وہ کیفیت چھٹ گئی تھی۔ وہ خود کو یوں اور نیا اور انوکھا محسوس کر رہی تھی جیسے اس کی تخلیق ابھی اور اسی پل میں ہوئی ہو۔ وہ بالکل بدل گئی تھی۔ اپنے پاس صوفے پر بیٹھے ہوئے محسن بھائی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بچوں کے سے چونچال پن سے بولی۔

''اتنی تو جناب مجھے دیر ہو گئی۔ آپ کا گھر ڈھونڈنے میں پہلے میں اس طرف کی سڑک مڑ گئی۔'' وہ ان کی انگلیوں پر بتانے لگی۔

''پھر ٹیکسی کو موڑا تو غلطی سے دائیں طرف نکلے گئے۔ پھر سکوئر سے سیدھے

چلتے گئے۔ اک پولیس مین سے پوچھا اور یہاں آ گئے۔" وہ کھلکھلائی۔

محسن بھائی اس کی معصوم خوشی پر سمجھ نہیں پاتے تھے کہ مسرور ہوں یا مغموم۔ اسے روتے دیکھ کر وہ کتنے گھبرا گئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے آنسوؤں کا تار کبھی نہ ٹوٹے گا لیکن اس کی یہ انبساطی کیفیت بھی وہ زائل نہیں کرنا چاہتے تھے اسی لئے انہوں نے استفسار نہیں کیا کہ وہ کیوں روئی تھی۔ خوشگوار لہجے میں بولے۔

"تم تو پوری کولمبس بن گئیں، ہیں۔"

وہ بچوں کے سے والہانہ پن سے بولی۔ "دیکھا محسن بھائی! پھر میں نے آپ کو ڈھونڈ ہی لیا۔ بچی آپ تو چلے گئے تھے نا۔ اتنا بھی خیال نہیں کیا کہ میں آپ کے بغیر کیسے رہوں گی۔"

"جیسے اب رہی ہو۔ دیکھو تو اتنی بڑی ہو گئی ہو۔" انہوں نے پیار سے اس کے گال تھپتھپائے۔ تمت نے اپنے گال پہ رکھتے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ زور سے رکھ دیا۔ وہ انہیں زیادہ سے زیادہ محسوس کرنا چاہتی تھی۔ وہ خود کو یقین دلا رہی تھی کہ اس نے انہیں پا لیا ہے۔

"محسن بھائی! آپ کو قسم لگے۔ مجھے سچ سچ بتائیں آپ مجھے یاد کرتے تھے کہ نہیں۔"

"ہشت گندی بچی۔" انہوں نے محبت آمیز مسکراہٹ سے کہا۔ "میں بھلا کیوں تمہیں یاد کرتا۔" ان کے ہاتھ پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں اداسیوں کے بادل اترنے لگے۔ ایک مغموم سی مایوسی سے بولی۔

"اچھا۔!! نہیں کرتے تھے۔" انہیں اس کی بے ساختگی پر پیار سا آ گیا۔ وہ اب بھی چھوٹی سی بچی تھی۔ جی چاہا اک بار جھک کر اسے چوم لیں۔

"ارے منی!!" انہوں نے پیار سے اس کی ناک مروڑی۔ "تمہیں میں بھولا ہی کب تھا جو یاد کرتا۔ جب سے میں نے اس گھر کو چھوڑا شاید ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب میں نے اس منی سی پیاری سی تمت کو یاد نہ کیا ہو۔"

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ جلدی جلدی انہیں گزری باتیں سناتی چلی گئی کہ جس دن وہ چپ چاپ چلے گئے تھے وہ کتنا پریشان ہوئی تھی کتنا روئی تھی۔ انہیں

کتنا یاد کرتی رہی تھی۔ یونہی ڈھونڈتی پھری تھی۔ کس کس طرح انہیں خواب میں دیکھتی رہی تھی۔ کیسے انہیں چپکے چپکے پکارتی رہی تھی۔ وہ اک والہانہ انداز میں انہیں سب باتیں سناتی ہوئی ہانپ رہی تھی۔ بولتے بولتے اس کا سانس پھول گیا تھا۔

وہ خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیرتی۔ اک لمحے میں ہی انہیں اتنے سارے لمحوں کی روداد سنا دینا چاہتی تھی۔ اتنے لمحوں کی مفارقت کا قصہ وہ ایک لمحے میں بیان کر رہی تھی۔ خوشی سنبھالے نہ سنبھلتی تھی۔ اس نے انہیں پا لیا تھا۔ اتنے دنوں بعد پا لیا تھا۔ وہ دیوانی سی ہو رہی تھی۔

محسن بھائی نے مسرت کا اس سے بڑھ کر جاوداں لمحہ نہیں پایا تھا۔ یہ ننھی سی لڑکی شاید ساری عمر کی محرومیاں دھوئے دیتی تھی۔ اس کا یہ پیار، اس کا یہ التفات کتنا پیارا تھا۔ اس کے یہ والہانہ انداز، زندگی کی سارکلفتیں ساری تلخیاں خس و خاشاک کی طرح بہائے لئے جاتے تھے۔ دلوں کو اطمینان یوں ہی ملتے ہیں۔ انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ روح یوں آسودہ ہو جاتی ہے انہیں اس کا تجربہ نہیں تھا۔ ان کا جی چاہا وہ چھوٹی چھوٹی سی معصوم باتیں اسی طرح انہیں سناتی چلی جائے وہ کبھی خاموش نہ ہو۔ اس کے ہر لفظ میں اک پاکیزہ چاہت کی دل نواز دھڑکیاں تھیں۔

اسے باتیں کرتے کرتے کچھ یاد آ گیا۔ "وہ کہاں ہیں؟"

"کون؟" محسن بھائی جو اس کی باتیں سن نہیں رہے تھے محسوس کر رہے تھے اس کی گفتگو کے آئینے میں اپنے ماضی کا عکس دیکھ رہے تھے چونک سے گئے۔

"وہی عذرا۔ آپ کی وائف اور جوئی" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"اور بے بی۔" وہ ہنس پڑے۔ "اب اس کے سامنے بھی کہیں وائف نہ کہہ دینا۔ وہ تو میرے ایک دوست کی وائف ہیں۔ اس دن وہ گھر نہیں تھے کہ بچے کی طبیعت اتنی خراب ہو گئی۔ اسی لئے مجھے ہی ہسپتال لانا پڑا۔"

"اچھا؟" وہ مایوس سی ہو گئی۔ پھر کچھ جھجکتے ہوئے بولی۔ "آپ نے نہیں۔"

"ہوں۔" محسن بھائی یوں مسکرائے جیسے اس کی بات سمجھ گئے ہوں۔

"میرا مطلب ہے آپ نے آپ نے شادی نہیں کی۔"

"چھوڑو پرے شادی میں کیا رکھا ہے۔" انہوں نے لاابالی پن سے کہا اور

اس کی آنکھوں کے سامنے شبو آپا کی شبیہ لہرا گئی۔

''کاش محسن بھائی میں شبو آپا کو آپ کی دلہن بنا سکتی۔'' اس نے ان کی آنکھوں میں جھانکتی اک پیاسی تمنا کو ڈوبتے ابھرتے دیکھا لیکن لبوں پر آتے ان الفاظ کو روک لیا۔

شام گہری ہو چلی تھی۔ وہ اسے ہسپتال تک چھوڑنے آئے تو تمت نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں کچھ دنوں تک گھر جاؤں گی۔'' ان کی آنکھیں ایک لمحے کیلئے چمک سی گئیں۔ ان کے لبوں پر کوئی بات آتے آتے رہ گئی۔ پھر بڑے ہی سکون سے بولے۔ ''سب کو سلام کہہ دینا۔''

گھر کی فضا ویسی ہی سرد اور غیر مانوس تھی۔ سرد مہری ہوا میں رچی بسی تھی۔ اجنبیت اور خشکی' پیار سے خالی' محبت کی خوشبو سے عاری' رشتوں کی گرمی سے خالی اسے محسوس ہوتا جیسے وہ ان دیواروں میں مقید ہو جیسے سانس اٹک اٹک جاتی ہو۔ یوں گھٹی گھٹی سی جیسے آکسیجن ٹینٹ میں سے آکسیجن کی نالی کسی نے کھینچ لی ہو۔

اماں بی نے عینک کے شیشوں پر سے دیکھتے ہوئے اس کے جھکے ہوئے سر پر اوپرا سا ہاتھ پھیرا۔

''آ گئیں تم' کتنے دن کی چھٹی پر۔'' اور اس نے حیران ہو کر سوچا کہ ان کے جیتے جاگتے ہاتھ میں ذرا سی بھی گرمی نہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کا ہاتھ اس کے سر سے چھوئے بغیر گزر گیا ہے۔

''جی دو دن کی چھٹی پر۔'' وہ منمنائی اور چند لمحے کھڑی رہی کہ شاید وہ کچھ اور کہیں' کچھ اور پوچھیں لیکن وہ پھر ہاتھ میں پکڑی بنائی میں الجھ گئی تھیں اور اس نے شپٹا کر سوچا تھا کہ لوگ اپنی ماؤں سے کیا باتیں کرتے ہیں۔

نازی اور گڑیا نے بھی اس کی آمد کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا بلکہ گڑیا پہلے کی نسبت زیادہ کھنچی کھنچی تھی۔ یوں ہی رسمی سی خیر خیریت پوچھی گئی۔ بہنوں کی وہ روایتی نہ ختم ہونے والی باتوں کا ان کے درمیان تصور بھی نہیں تھا۔ ہاں گلاں اسے خوب بھینچ بھینچ کر ملی تھی۔ اس کے میلے کپڑوں سے آتی ہوئی لہسن اور پیاز کی بو اسے یوں محسوس ہوئی جیسے مٹی کی پیاری خوشبو۔ دھرتی کی سوندھی مہک۔ جو کتنی اپنی اپنی سی معلوم ہوتی

ہے۔ وہ جلدی جلدی اسے اپنی بیماریاں گنانے لگی جو اسے لاحق تھیں۔ وہ اس کے آنے سے کتنی خوش ہو گئی تھی جیسے کوئی ناقابل یقین خوشگوار سی بات ہو گئی ہو۔

ابا میاں کام سے گئے ہوئے تھے۔ وہ یہ سن کر کتنی مسرور ہوئی تھی جیسے دو جہاں کی دولت پا لی ہو' فالج سے ان کا اس طرح صحت یاب ہو جانا ایک معجزے سے تو کم نہیں تھا لیکن یہ معجزہ اس کی دعاؤں کی تخلیق تھا۔ اس کی دعاؤں کا حاصل تھا۔

وہ ایک سائے کی طرح گھر میں چل پھر رہی تھی جیسے کوئی اجنبی کسی محلے کی پرپیچ گلیوں میں راستہ کھو گیا ہو۔ وقت جیسے رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ یہ لمحے کتنے بھاری ہو گئے۔ سب لوگ کتنے لاتعلق تھے۔ اپنی اپنی فضاؤں میں سانس لیتے ہوئے جیسے کسی سے کوئی تعلق نہ ہو' کوئی واسطہ' کوئی رشتہ نہ ہو۔

اچانک شام کو جواد آ گیا۔ سب کے رویے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بہت دنوں بعد آیا ہے۔ وہ اتفاقاً اپنے کمرے سے باہر یہ دیکھنے آئی تھی کہ ابا میاں آئے ہیں کہ نہیں کہ آگے انہیں بیٹھے دیکھا۔ وہ زرد سی پڑ گئی۔

''ہیلو ڈاکٹر صاحب!'' اس نے خوشدلی سے اٹھ کر کہا۔ ''آیئے آیئے تشریف لایئے۔''

نجانے کیوں اس کی جواد کی طرف دیکھنے کی بھی ہمت نہیں پڑ رہی تھی جیسے اس کی طرف دیکھے گی تو پگھل کر پانی ہو جائے گی۔ گڑیا نے کچھ ناگواری سے اس کی طرف دیکھا تو وہ اور بھی سٹ گئی۔

''اچھا تو ڈاکٹر صاحب فرمایئے کتنے زندوں کو مردہ کیا۔ کتنے مردوں کو زندہ۔'' اس نے مسخرے پن سے کہا۔ وہ ایک بار صرف اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ گڑیا نے بات پلٹنے کو کہا۔

''جواد بھائی! آج معلوم ہے آپ کتنے دنوں بعد آئے ہیں۔'' وہ ہنس پڑا اور یوں ہی کان کھجاتا ہوا بولا۔

''بھئی حساب میں تو ہمیں شروع سے انڈہ ملتا رہا ہے۔ یہ بڑا سا انڈہ'' نازی کو ہنسی آ گئی۔

''جناب کو پتہ ہونا چاہیے کہ قریباً ایک مہینے بعد آپ نے جھانکا ہے۔''

''جھوٹ' بالکل جھوٹ۔'' اس نے احتجاج کیا۔ ''ارے بابا! کب سے اندر بیٹھا ہوں اور تم کہہ رہی ہو کہ جھانکا ہے۔''

''خیر یہ تو میں نے محاورتاً کہا تھا۔''

''اچھا تو بتائیے' اتنے دنوں کیوں نہیں آئے۔'' گڑیا نے شکوہ کیا لیکن جواد نے رسمی انداز میں اپنی مصروفیات گنانی شروع کر دیں۔

''بھئی کام کچھ زیادہ رہا ورنہ میں ضرور آ جاتا۔''

''آپ کو کسی کا خیال ہو تو تب ہے نا۔'' گڑیا نے کہہ ہی دیا۔

''مثلاً کس کا؟'' وہ آج بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔ کرسی پر آگے کو جھک کر وہ گڑیا کی طرف پوری طرح سے متوجہ ہو گیا۔ گڑیا کی دراز پلکیں اس کی خوبصورت پتلی آنکھوں میں اترتی ہوئی شرمیلی چمک کو چھپانے کیلئے جھالروں کی طرح جھکی پڑتی تھیں۔ اس کا دلکش چہرے پر گلال بکھرتا بڑا دلنواز معلوم ہوا جیسے سارا کمرہ ایک دم روشن ہو گیا ہے۔ اک انجانی سی کسک تمت کے دل میں جاگ اٹھی۔ کتنی خوبصورت ہے یہ۔ جواد کتنے غور سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ کیا اسے گڑیا کی دلکشی نظر نہیں آتی تو پھر وہ گڑیا سے ہی شادی کیوں نہیں کر لیتا۔ اس نے پشیمان ہو کر سوچا۔

''ڈاکٹر صاحب کو اپنے کسی مریض کی یاد آ رہی ہے۔'' جواد نے اسے خیالوں میں گم دیکھا تو اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''نہیں تو۔'' وہ چونک گئی۔

''بھئی تمہارے کچھ مریض یہاں بھی تو ہیں۔'' اس نے کچھ عجیب سے لہجے میں کہا۔

''کون؟؟؟'' تمت ہونق سی بن گئی۔

''چلو مجھے ہی سمجھ لو۔'' وہ مسکرایا۔

''آپ نے ڈاکٹر کو دیکھ کر بیمار ہونا کب سے سیکھ لیا۔'' نازی ہنسی۔

''ہم تو بہت پہلے کے مریض ہیں یہی ڈاکٹر اب بنی ہیں اور پھر علاج بھی نہیں کرتیں۔'' وہ سب بظاہر مزاحیہ انداز میں کہہ رہا تھا لیکن تمت اس کے دل کی بات جانتی تھی۔

''سنا ہے تمت آئی ہے۔'' ابا میاں کی آواز پر تمت جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ گڑیا اور نازی نے حیرت سے دیکھا تمت عجلت میں کرسیوں میں سے راستہ بناتی ان کی طرف لپکی۔

''کیسی ہو بیٹی؟'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ایک لمحے کو اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ہمیشہ کی طرح تمت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ نازی اور گڑیا حیران تھیں کہ تمت' یہی بیوقوف سی تمت' بدصورت تمت کو ابا میاں نے گلے سے لگا لیا تھا۔ وہ جو کبھی سر پر ہاتھ بھی نہیں پھیرتے۔

☆......☆......☆

یہ بھی خوش قسمتی تھی عمران بھائی کی کہ ڈاکٹر سلہری جلد واپس آ گئے تھے ورنہ تو ان کے دورے بڑے لمبے ہوا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عمران بھائی کا آپریشن کامیاب ہوا ہے حالانکہ عمران بھائی بالکل ہی ہمت چھوڑ بیٹھے تھے۔ اتنے گھبرائے گھبرائے سے رہتے جیسے کسی متوقع سانحے کے منتظر ہوں۔ ہر وقت بیقرار سے' پریشان' مغموم و متذبذب' تمت انہیں سمجھاتی رہتی' تسلیاں دیتی' ان کی ہمت بندھاتی۔ دوسری طرف اصغری خالہ کو سنبھالنا دشوار تھا۔ وہ بار بار اس سے اس طرح سوالات کرتیں جیسے عمران بھائی کو آنکھیں دینا اس کے بس میں ہے۔ وہ پوری کوشش کرتی کہ ان کی ڈھارس بندھی رہے لیکن جب تک پٹی نہ کھل جاتی کوئی قطعی بات کہہ دینا ممکن بھی نہیں تھا۔

ایک شام کو وہ ہوسٹل سے واپس آئی تو دیکھا کچھ مہمان خواتین اندر بیٹھی ہیں۔ گڑیا نے شاید اسے آتے دیکھ لیا تھا' ڈرائنگ روم سے ہی چلائی۔

''تمت ذرا اندر آنا۔'' تھکی ہاری اب ہوسٹل سے آئی تھی' حلیہ بھی کچھ ایسا ویسا ہی ہو رہا تھا اور دوسروں کے سامنے جانے سے یوں بھی چھپتی تھی۔ ابھی متذبذب ہی تھی کہ نازی نے پکارا۔

''تمت! ذرا اندر آؤ۔'' وہ کان لپیٹ کر نکل بھی نہیں سکتی تھی کہ اماں بی بعد میں کان اینٹھتیں۔ اسی طرح بادل نخواستہ جھجکتی ہوئی اندر چلی آئی۔

''یہ تمت ہے۔'' گڑیا نے کچھ تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ تمت جس کے بال بے ترتیب اور لباس بے حد سادہ تھا ہونق سی بنی انہیں آداب کرنے لگی۔ گڑیا پھر چہکی۔

''تمو! یہ جواد بھائی کی امی ہیں' یہ ان کی بہن شیریں اور یہ ان کی بھابی ربیعہ۔''

تمت نے جو ابھی پوری طرح سے سنبھلی نہیں تھی' پشیمان سی ہو کر اس نے ان تینوں کی طرف دیکھا جن کی آنکھوں میں استعجاب صاف پڑھا جاتا تھا۔

''اچھا تو یہ تمت ہے۔'' جواد بھائی کی بھابی جس کی طرار آنکھیں تمت کا بے حد تنقیدی جائزہ لے رہی تھیں کچھ عجیب سے انداز میں کہا۔

''آپ ڈاکٹر ہیں۔'' شیریں نے بڑی شائستگی سے پوچھا لیکن انداز میں بے یقینی صاف جھلکتی تھی۔ جواد کی امی جنہیں سب روشن آپا کہہ رہے تھے بڑی بے نیازی سے بولیں۔

''تمت تمہاری سگی بیٹی ہے؟ یہ کس پر چلی گئی ہے۔ تمہارے گھر میں تو یہ کسی سے بھی نہیں ملتی۔'' ان کی بات پر سب نے ایک ساتھ یوں قہقہہ لگایا جیسے وہ کوئی لطیفہ بیان کر رہی ہیں۔ اماں بی نے ان کی تائید کی۔

''یہ تو سب ہی کہتے ہیں۔ خبر نہیں کس پر چلی گئی ہے۔'' تمت نے اذیت سے ہونٹ کاٹ لئے۔ میں نے جس کی کوکھ سے جنم لیا ہے اسے بھی میرے بیٹی ہونے پر شک ہے تو یہ دوسرے میرا مذاق کیوں نہ اڑائیں۔

''ویسے حیرت ہے۔ ہم لوگ تو پہلے یہی سمجھے تھے کہ یہ آپ کی کوئی کزن ہیں۔'' جواد کی بھابی نے چبا چبا کر کہا۔ تمت کا دل کوئی مٹی میں لئے لیتا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے ابھی ابھی کسی نے تیزاب سے اس کا چہرہ داغدار کر دیا ہو۔

جواد کی بہن نے گڑیا کی طرف رشک کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''گڑیا بھی تو سب سے مختلف ہے۔ سچ مچ کی گڑیا۔'' گڑیا کی نیلی آنکھیں نیلم کی بن گئیں اور اس کے گال گلابی ہو گئے۔ ربیعہ بھابی نے پیار سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''مختلف ہیں لیکن بے حد خوبصورت۔''

''یہی تو میرا بھی مطلب ہے۔'' شیریں نے جلدی سے کہا تو اماں نے ایک شان تفاخر سے کہا۔

''میری گڑیا جیسی تو خاندان بھر میں کوئی لڑکی نہیں۔''

''اس میں کیا شک ہے؟'' جواد کی امی نے جیسے قطعی فیصلہ سنا دیا۔

تمت کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ نہیں دیکھ رہی' کچھ نہیں سن رہی۔ اچانک

اماں بی کی ڈانٹ بھری۔ وہ اک لمحے کو کانپ گئی۔

''تمت! انگوٹھا نکال منہ سے' اتنی عمر ہو گئی پر یہ عادت نہ گئی اس کی۔''

تمت نے ہراساں ہو کر سب کی طرف دیکھا جو بڑی ناگواری سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جواد کی بھابی کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ شیریں نے کہا۔

''بھئی آپ تو ڈاکٹر ہیں' کچھ علاج اپنا بھی تو کیجئے۔''

تمت گنگ سی ہو گئی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے' جیسے کوئی بھی اپنا نہیں تھا۔ وہ اجنبیوں میں گھری تھی۔ وہ نیم پاگل سی ہو رہی تھی۔ سب کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھتی وہ باہر چل دی لیکن اب بھی سب کی طنزیہ ہنسی اس کا تعاقب کر رہی تھی۔

کمرے میں آ کر وہ چپ چاپ لیٹی چھت کو گھورتی رہی۔ اس کا ذہن خالی تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے خالی تھیں۔ وہ ان باتوں کی عادی ہو گئی تھی۔ اس گھر کی دیواروں میں تو وہ ہمیشہ ہی پشیمان رہی تھی' روتی ہوئی' بسورتی ہوئی اپنی بدصورتی پر خجل اور نادم جیسے اس گھر کی دیواروں میں آئینے لگے ہوں جو ہر لحظہ اسے اس کی بدصورتی کے عکس دکھلاتے ہوں۔ وہ چپ چاپ بستر پر لیٹی اور نجانے کب سو گئی۔

شاید وہ لاشعوری طور پر خود کو اردگرد سے بے خبر رکھنا چاہتی تھی۔ شام گہری ہو گئی لیکن اس کی نیند نہیں ٹوٹی۔ کسی کو خیال بھی نہ آیا کہ اس نے دوپہر کا کھانا بھی کھایا ہے یا نہیں۔ رات کو جب سب لوگ اپنے اپنے بستروں پر چلے گئے تو گلاں کو اس کا خیال آیا جو سہ پہر سے بھوکی سو رہی تھی۔ وہ کمرے میں آئی تو دیکھا وہ اب بھی سو رہی ہے۔

گھر میں ہونے والی کھسر پھسر سے وہ بے خبر نہیں تھی اور بے خبر رہتی بھی کیسے۔ ساری باتیں تو اس کے اپنے گرد گھومتی تھیں۔ حالات کا اندازہ تو اس نے فضا سے ہی کر لیا تھا لیکن سب کچھ جان بوجھ کر بھی وہ انجان رہنا چاہتی تھی۔ اس کی رائے' اس کے محسوسات اور اس کے جذبات کا خیال کس کو کرنا تھا۔ وہاں تو بنا جرم بتائے فیصلہ سنا دیا جاتا تھا۔ اس کے ٹھنڈے پڑتے وجود میں بغاوت کی ایک چنگاری بھی نہیں

تھی۔ اس کی سہمی ہوئی انا میں اتنا دم خم نہیں تھا کہ اس کی پرزہ پرزہ شخصیت کو جوڑ کر مکمل بنا دے۔ اس میں سرکشی کا وہ جذبہ ہی نہیں تھا جو اس کی خمیدہ گردن کو اٹھا دے۔ اس نے دوسروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس گھر کے باسی تو جیسے بھیڑیئے تھے اور وہ ان کے سامنے اک کمزور بھیڑ کی طرح سہمی سکڑی رہتی تھی۔

اسی لئے تو گڑیا نے بڑے دبنگ لہجے میں کہا تھا۔ ''اب جواد کے خواب دیکھنا چھوڑ دو' اس کا خیال دل سے نکال رکھو۔ اس کی اماں تو کہہ گئی ہیں کہ جواد نے پتہ نہیں کس خیال میں ہمیں تمت کیلئے بھیجا تھا۔ اس کی عقل پر تو پتھر پڑ گئے ہیں پر ہماری آنکھیں سلامت ہیں۔ برادری میں کیا انگوٹھا چوستی ہوئی دلہن لے کر جائیں گے۔''

تمت کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ جواد بھائی اس حد تک پہنچ جائیں گے۔ گڑیا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی گھر والوں کی مضحکہ اڑاتی نگاہوں نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ گڑیا نے بڑے غصے سے کہا تھا۔ ''اب اس بھول میں بھی نہ رہنا کہ جواد تمہیں واقعی پسند کرتا ہے۔ اگر وہ تم سے کچھ کہتا بھی رہا ہے تو تم پر ترس کھا کر۔ وہ سنجیدگی کے ساتھ تم سے محبت کرنے سے تو رہا اور تمہارا اس کا مقابلہ بھی کیا۔ تم خود ہی سوچو' اتنا تو خوبصورت اور سمارٹ ہے وہ اور تم۔'' وہ معنی خیز خاموشی میں ہنسی۔ ''عمر بھر باتیں سنو گی۔'' وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں ہنستی ہوئی پلٹ گئی۔

تمت وہیں کھڑی کھڑی سی رہ گئی۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس کی ہنسی کی کرچیاں اس کے سارے وجود میں چبھتی جاتی ہیں جیسے اس کی ہنسی ایک کریہہ المنظر جسم میں ڈھل گئی ہیں جو اسے لرزائے دیتا ہے۔ دل کے کسی گوشے میں اک ٹیس سی اٹھی۔ وہ بے کل ہو کر اٹھ بیٹھی۔ روح میں دور بہت دور کسی نے جواد کو پکارا۔ وہ ہانپ گئی۔ جیسے ابھی اس کے پھیپھڑے پھٹ جائیں گے۔ وہ بیقراری سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ آنکھوں میں اک دھندلا سا چہرہ یکبارگی چمک کر مٹ گیا جیسے کسی کی دیکھتے دیکھتے بصارت اچانک ختم ہو گئی ہو۔ سب نے اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی تھی۔ کسی نے اس کے دل میں تو نہیں جھانکا تھا کہ وہ سہما ہوا سا دل کبھی دھڑکتا بھی ہے وہ جو سراسیمہ سی ہر وقت گنگ رہتی ہے۔ کسی کا نام بھی لے سکتی ہے۔

جواد کی امی تو صاف کہہ گئی تھیں کہ ہمیں تو گڑیا پسند ہے۔ آپ بات پکی ہی سمجھیں۔ جواد کا دماغ ہم خود ہی درست کر لیں گے۔ اماں بی کیلئے تو اندھیرے میں سورج نکل آیا تھا۔ صمدانی صاحب نے تو دبی زبان سے کہا بھی کہ لڑکے کی پسند کو ملحوظ رکھنا چاہیے لیکن اماں بی نے ان کے خوب ہی لتے لئے۔ ''تمت اور جواد کا کیا جوڑ۔ دو دن نباہنا مشکل ہو جائے گا اور پھر ہمارا کیا دوش۔ اس کے گھر والوں کی مرضی۔''

اور تمت گاڑی میں بیٹھی سوچتی گئی۔ میں اب تک اپنی بدصورتی کو اکیلے ہی بھگتتی آئی ہوں تو اب کسی کو کیوں اس پر رحم کھانے دوں۔ زندگی پیار سے خالی رہی تو اب محبت کی بھیک کیوں لوں۔ میری جھولی میں نفرت کے اتنے ڈھیر ہیں کہ ان میں محبت کی شناخت بہت مشکل ہے۔

اپنے ہسپتال میں آ کر اس نے یوں سکھ کا سانس لیا تھا جیسے کوئی بھولا بھٹکا مسافر تھکا ہارا اپنی منزل پر پہنچ کر آسودگی کا سانس کھینچتا ہے۔ وہ گھر جو اس کا اپنا تھا لیکن اس کی فضا' اس کے در و دیوار اس میں رہنے والے لوگ کتنے اجنبی تھے اور یہاں ہسپتال میں اس کے اردگرد رہنے والے لوگ جو اجنبی تھے جنہیں زندگی میں اس نے پہلی بار دیکھا تھا لیکن سب کتنے مانوس' کیسے اپنے اپنے سے نظر آتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہسپتال کی اس کراہتی ہوئی فضا میں جہاں دوائیوں کی بو رچی بسی تھی۔ وہ ہمیشہ سے رہتی آئی تھی۔

ڈاکٹر فیروزہ نے اس سے پوچھا تھا۔ ''تمت کیسی رہیں تمہاری چھٹیاں۔''

''بہت اچھی۔'' اس نے بظاہر مسکرا کر جواب دیا تھا لیکن اس کے دل پر جیسے گرم گرم آنسو گرنے لگے تھے۔ سب ڈاکٹرز جب گھروں سے آتیں تو خوشی سے چہکتی ہوئی' ہفتہ بھر ان کی باتیں ہی ختم نہ ہوتی تھیں لیکن اس نے اپنے گھر میں کیا پایا تھا اس کا بھی کتنا جی چاہتا تھا کہ بہنوں کے ساتھ مل کر بیٹھے' اماں بی سے پیار بھری باتیں کرے۔ وہ اسے اپنے ہاتھوں سے کھلائیں' اصرار کر کے اس کی چھٹیاں بڑھوا لیں' بار بار شکایت کریں کہ وہ ہوسٹل کے کھانے کھا کھا کر کمزور ہو گئی ہے اور جب وہ آنے لگے تو اسے امام ضامن کے پیسے باندھیں۔

لیکن وہ تو نہ کسی کو اس کے آنے کی خوشی تھی نہ جانے کا غم۔ وہ جو اس کی

ماں تھی' اس کی اپنی ماں لیکن جو اس کے دل میں نہیں جھانک سکتی تھی۔ وہ تو اس گھر کے کسی باسی کی بھی کچھ نہیں لگتی تھی۔ سب نے اجنبیت کی دیواریں کس قدر بلند رکھی تھیں کہ وہ ان کے دوسری طرف کی فضا کو محسوس بھی نہیں کر سکتی۔ اس کی سب سے الگ صورت نے اسے سب سے الگ بنا دیا تھا۔ سب نے اسے یوں علیحدہ کر دیا تھا جیسے کوئی انتہائی قابل نفرت چیز ہو۔

اپنے کمرے میں اس نے ابھی سامان ہی ترتیب سے رکھا تھا۔ کچھ سفر کی تھکن تھی اور کچھ تھکے ہوئے جذبات' مسلی ہوئی آرزوؤں کا بوجھ۔ وہ نڈھال سی ہو رہی تھی کہ کسی نے لگاتار دستک دینا شروع کی۔ اس وقت وہ صرف تنہائی چاہتی' مکمل تنہائی' ذہن کو آسودگی دینے کیلئے' روح کو پرسکون کرنے کیلئے اسے کئی کٹھن لمحوں سے گزرنا تھا۔ اس جاں گسل وقت میں اس نے نیا جنم لیا تھا۔ محبت سے شناسائی اور ناآشنائی کی منزلیں کتنی جلدی گزر گئی تھیں۔ اس تپتی زندگی میں سایہ محض اک لمحے کو لہرا کر گیا تھا۔ اس اک ننھے سے لمحے کی یاد مٹانے کیلئے اسے ہزاروں لمحوں کی اذیت سہنا تھی۔ وہ تنہائی چاہتی تھی' تنہائی۔ جو ازل سے اس کا مقدر تھی۔ جو اس سے مانوس تھی۔ اک ہمدرد اور غمگسار دوست کی طرح جو اس کے گرد لپٹ لپٹ کر اسے تحفظ کا احساس دلاتی تھی۔

دستک مسلسل ہو رہی تھی۔ اس نے چٹخنی اتاری اور تھوڑا سا پٹ کھول کر بولی۔

''کون ہے؟؟؟''

کسی نے پورا پٹ تیزی سے دھکیل دیا اور وہ سہم کر الٹے قدموں چلتی کمرے کے وسط تک آ گئی اور لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

☆......☆......☆

''جواد بھائی آپ؟''

جواد جس کے چہرے پر عجیب سی وحشت برس رہی تھی دانت پیس کر بولا۔

''ہوں۔ میں ہی ہوں۔''

تمت نہ جانے کیوں کانپ رہی تھی۔ جواد نے پلٹ کر دروازہ بند کیا اور سختی

سے اس کا بازو پکڑ کر بولا۔ ''تمت جو میں نے سنا ہے وہ درست ہے۔''

تمت کی آنکھیں خوف سے تارہ بن گئیں۔ وہ اس کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہی۔

''بولتی کیوں نہیں ہو۔'' اس نے جھنجھوڑ کر ڈانٹ پلائی تو وہ بچوں کی طرح رو دی۔

''جواد بھائی! آپ نے کیا سنا ہے؟''

''کہ تم ڈاکٹر فرحان سے شادی کرنا چاہتی ہو۔''

تمت کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ''اگر ایسی ہی بات تھی تو تم نے مجھے دھوکے میں کیوں رکھا۔''

تمت کا ذہن جیسے ماؤف ہو گیا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جواد کیا کہہ رہا ہے۔ یونہی معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہے۔ جواد نے اسے ہکا بکا دیکھا تو بولا۔

''میں نے بھی یقین نہیں کیا تھا لیکن جہاں سے پوچھا تو یہی سنا۔''

تمت گنگ سی ہو گئی تھی۔ آنسو اس کی پلکوں پر لرز رہے تھے۔ باوجود کوشش کے بھی اس کے ہونٹوں سے ایک لفظ نہیں نکل رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اس کے قدم اکھڑ رہے تھے۔ زمین ڈول رہی تھی۔ اس کے حواس گم ہو رہے تھے۔ وہ لڑکھڑائی۔ اس کیلئے کھڑا ہونا دشوار تھا۔ وہ وہیں اس کے قدموں میں زمین پر بیٹھ گئی۔

جواد ایک لمحے کو پشیمان سا ہوا۔ جھک کر اس کی طرف دیکھا جو دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے بیٹھی تھی۔ وہ بھی اس کے برابر بیٹھ گیا اور اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کی ہراساں آنکھوں میں آنسو نہیں' دکھ پگھلے نظر آتے تھے۔ اس کا سانولا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ جواد کو اس پر باوجود غصے کے ترس آ گیا۔ اس کے قریب بیٹھ کر بولا۔

''تمت! کچھ تو کہو۔'' اس نے بچوں کی طرح اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی گئی۔ وہ یوں خاموش تھی جیسے بولنے پر قادر نہ ہو۔ جواد نے اسے شانوں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ وہ اس کے ہاتھوں میں اس طرح جھول رہی تھی جیسے اس کا جسم بے جان ہو رہا ہو۔ جواد پریشان ہو گیا۔

''تمت کیا بات ہے' تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

تمت نے یوں اس کی طرف دیکھا جیسے پہچان نہ پا رہی ہو۔ خود کو اس کے ہاتھوں سے چھڑاتی ہوئی بولی۔

''جواد بھائی مجھے کچھ مت کہیں' مجھ سے کچھ مت پوچھیں۔ کچھ مت پوچھیں۔''

جواد نے اسے چھوڑ دیا۔ اس معمہ سی لڑکی کو وہ اب تک نہیں سمجھ پایا تھا۔ وہ جو ایسی سہمی ہوئی رہتی تھی ایسا بے باک فیصلہ کس طرح کر سکتی تھی لیکن وہ تردید بھی نہیں کرتی تھی۔ وہ صاف کیوں نہیں کہہ سکتی کہ یہ سب غلط ہے۔ اگر اس کے دل میں میرے لئے ذرا سی بھی جگہ ہوتی تو وہ اس الزام پر تڑپ اٹھتی لیکن کوئی بات ضرور تھی جو ہسپتال میں پھیلی تھی۔

وہ پلنگ کی پٹی پر سر جھکائے بیٹھ گئی۔ جیسے وہی مجرم ہو۔ جواد کو اس پر ترس آنے لگا۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس نے سر اٹھا کر رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''جواد بھائی! پلیز آپ چلے جائیے' پلیز' پلیز۔ چلے جائیے آپ۔ پھر میری زندگی میں کبھی مت آئیے گا۔ کبھی مت آئیے گا۔ پلیز' آپ چلے جائیے۔''

جواد اک لمحے کو حیران سا رہ گیا۔ تیزی سے اس کے قریب آیا لیکن اس کے بولنے سے پہلے ہی تمت نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتی ہوئی لجاجت سے بولی۔

''جواد بھائی آپ چلے جائیے۔'' جواد نے غصے سے اس کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور تیزی سے بولا۔

''تمو! میں نے زندگی میں صرف تم سے پیار کیا ہے۔ صرف تمہیں چاہا ہے۔ تمہارے دل میں میری کوئی جگہ نہیں۔'' تمت کو محسوس ہوا جیسے یہ لفظ اس کے انگ انگ میں چبھے جاتے ہیں۔ اس کے رگ و پے میں ایک ٹیس سی بن کر اتر رہے ہیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا اور بلکتی ہوئی بولی۔

''میں اس قابل نہیں ہوں جواد بھائی۔ میں اس قابل نہیں۔'' جواد پھر اس کے برابر جھک گیا۔ معلوم نہیں اس کے دل میں کیا ہے لیکن سب گھر والے یہاں ہسپتال

والے بھی تو جھوٹ نہیں بولتے لیکن پھر وہ اتنی بے قرار کیوں ہے۔

''تمت! تم ایسا کیوں کہتی ہو۔ میں نے تمہاری معصومیت سے پیار کیا ہے۔ میں نے تمہاری شخصیت سے پیار کیا ہے۔ تمت تم بھی اسے دل کی بات کیوں نہیں کہہ دیتی۔''

تمت نے اپنے اردگرد پھیلی انوکھی فضا کو دیکھا۔ جواد کے ہونٹوں سے نکلے انوکھے لفظوں کو سنا۔ وہ سب جھوٹ بولتے ہیں یا جواد بھائی غلط کہتے ہیں۔ اس کے ذہن کے تار جھنجھنا اٹھے۔ ٹپٹا کر بولی۔

''جواد بھائی! آپ جائیں نا' بس آپ چلے جائیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے' کچھ نہیں۔'' جواد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''تمو! تم انکار کر رہی ہو؟''

تمت کو کمرے کی ساری چیزیں اپنے اوپر گرتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ ساری کائنات گھوم رہی تھی۔ اسے چکر سے آ رہے تھے' نجانے کس طرح اس کے ہونٹوں سے ہاں نکل گیا جیسے کسی نے آخری ہچکی لی ہو۔

جواد کو محسوس ہوا جیسے اس کے پاؤں تلے سے زمین نہیں رہی۔ اس نے ہاتھ یوں اٹھایا جیسے اسے تھپڑ مارنے والا ہو۔ وہ یونہی بے حس بیٹھی رہی۔ ہولے سے اس کا شانہ تھپتھپا کر بولا۔

''تمو! ہم دوست تو ہو سکتے ہیں نا۔ اچھے دوست۔ ویسے میں خوش ہوں کہ تم نے خود پر اعتماد کرنا' خود سے فیصلہ کرنا سیکھا ہے۔ میں نے ہمیشہ یہی چاہا ہے۔''

تمت کی آنکھوں میں حسرتیں جل بجھ رہی تھیں۔ گردن جھکا کر اس نے اپنے شانے پر رکھے اس کے ہاتھ کو اپنے رخسار تلے دبا لیا اور ہونٹ بھینچ کر سسکیاں لینے لگی۔

جواد جب تھکے تھکے قدموں سے گیلری میں سے گزر رہا تھا تو اس نے ڈاکٹر فرحان کو اسی طرف آتے دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائے اور آگے بڑھ گئے۔ جواد نے کچھ سوچ کر سر جھٹکا اور خاموشی سے لمبی خاموش سڑک پر نکل گیا۔

دوسری صبح وہ بیدار ہوئی تو خالی الذہن ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے متعلق سوچنا

ہی چھوڑ دیا تھا۔ سوچ سوچ کر وہ اکتا بھی تو گئی تھی۔ سب کچھ لاحاصل تھا۔ وہ اپنی صورت بدلنے پر قادر نہیں تھی اور اماں بی کے فیصلوں کو بدلنا ناممکنات میں سے تھا اور پھر وہ جواد کے قابل ہی کب تھی۔ گڑیا نہ ہوتی تو جواد کے گھر والے نازی کو پسند کر لیتے۔ اس میں گڑیا کا کیا دوش۔

اسی لئے وہ پرسکون ہو گئی تھی۔ جس بات کا کوئی حل نہ ہو اس پر سوچنا عبث ہے۔ اس نے تو شروع دن سے ہی محرومیوں سے نباہ کرنا سیکھا تھا۔ چپ چاپ اپنا حق دوسروں کو دیتی رہی تھی تو آج کس طرح سے کچھ کہہ دیتی۔ اس نے تو ناکامیوں کا مزہ یوں چکھا تھا کہ اب ان کا ذائقہ بھی تلخ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کی حالت اس سہمے ہوئے بچے کی مانند تھی جو چپ چاپ کڑوی دوا پی کر پانی بھی نہیں مانگتا۔

ڈیوٹی پر جانے کو تیار ہو رہی تھی کہ کسی نے آ کر بتایا کہ کوئی صاحب ملنا چاہتے ہیں۔ وہ پلنگ سے دوپٹہ اتار کر اوڑھتی ہوئی باہر نکلی۔ صمدانی صاحب کھڑے تھے۔ تمت حیرت دمسرت کے ملے جلے جذبات میں گڑبڑا کر دھیرے سے بڑبڑائی۔

''ہائے ابا میاں' آپ۔'' اور وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

صمدانی صاحب نے اس کے زرد چہرے کی طرف دیکھا اور دکھ کی ایک لہر سی ان کے رگ و پے میں دوڑتی محسوس ہوئی۔

''تمت بیٹی کیسی ہو؟'' انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو جیسے وہ ہوش میں آ گئی۔ ایک دم ہی ان کے سینے سے لگ کر رو پڑی۔ صمدانی صاحب نے تڑپ کر اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ وہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ اس کے آنسوؤں میں محرومیوں کا غم گھلا تھا۔ وہ سسکیوں کی زبان میں نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی۔ جس کی چوٹ انہیں دل پر محسوس ہوتی تھی۔

''بیٹی کیوں رو رہی ہو؟'' انہوں نے اس کے آنسو پونچھے۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی آنسو تیر رہے تھے لیکن اپنی حالت پر اس نے قابو پا لیا تھا۔ آنکھیں خشک کرتی ہوئی بولی۔ ''ابا میاں' آپ ٹرین پر آئے ہیں۔''

''نہیں ایک دوست کی کار میں۔ میں نے سوچا اپنی بیٹی کو دیکھتے چلیں۔'' تمت کھل کر مسکرائی۔ اب غم کے جذبات پر خوشی غالب آتی جاتی تھی۔ ابا میاں کو اس کا

خیال تھا تو ملنے چلے آئے۔ اس نے ایک نغمے کی طرح لہرا کر پردہ اٹھایا۔

''اندر آ جایئے نا۔'' وہ اندر چلے آئے۔ پورے کمرے پر ایک نگاہ دوڑاتے ہوئے بولے۔ ''بھئی واہ بیٹا ہماری تو بڑی سلیقے والی ہے' اتنا اچھا کمرہ سجا رکھا ہے۔''

تمت خوشدلی سے مسکرائی اور بے یقینی سے بولی۔ ''اچھا۔''

صمدانی صاحب نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ اپنی ہی نگاہ میں بڑی اہم ہو گئی۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے اور وہ اشتیاق سے ان کی ایک ایک بات سنتی رہی۔ وہ ان لمحوں کو روح میں بھر لینا چاہتی تھی۔ وہ جیسے عمر بھر کی تشنگی مٹانا چاہتی تھی۔ اس کی حالت اس نئی نویلی دلہن کی سی تھی جس کو سسرال کی اجنبی فضا میں میکے کا کوئی شناسا چہرہ نظر آ جائے۔ گزرے لمحوں کی کلفت وہ ایک پل میں بھول گئی تھی۔ ابا میاں اس کے پاس آئے تھے۔ اس سے ملنے آئے تھے۔ اس کے کمرے کی سجاوٹ کی تعریف کر رہے تھے۔ اتنی خوشیاں اسے سہارنی مشکل تھیں۔

''ابا میاں! چائے منگواؤں۔''

''نہیں تمت بیٹی میں ابھی ابھی پی کر آ رہا ہوں۔ بس تم سے ایک بات پوچھنی ہے۔''

''جی۔'' اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

''بیٹی میں سمجھتا ہوں کہ اس گھر میں تمہارے ساتھ کبھی انصاف نہیں ہوا۔ تم ہمیشہ نظر انداز ہوتی رہی ہو اور اس میں میں خود کو بھی قصوروار سمجھتا ہوں۔''

''نہیں تو ابا میاں۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''نہیں بیٹی۔ مجھے اپنی اس کوتاہی کا اعتراف ہے کہ باپ کی حیثیت سے میں نے اپنے فرائض کو نہیں پہچانا۔ وہ صرف تم ہو جس نے میرے اندر سوئے ہوئے باپ کو جگایا ہے۔ وہ صرف تم ہو بیٹی' تم نے بیٹی کا مفہوم مجھے سمجھایا ہے۔''

تمت پریشان ہو گئی۔ یونہی ہاتھ ملنے لگی۔ صمدانی صاحب کہتے گئے۔ ''میں تمہیں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جواد نے تمہارے لئے پیام دیا تھا۔ تمہاری اماں بی کا خیال ہے کہ اس کے گھر والوں کو گڑیا پسند ہے لیکن ہمیں جواد کی پسند دیکھنا ہے۔ اس کے گھر والوں کی نہیں۔ بیٹا اب تم سمجھ دار ہو' تم بغیر کسی جھجک کے مجھے اپنی رائے سے

آگاہ کر دو۔''

تمت کی وہ حالت کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ ساکت سی بیٹھی ان کی طرف ایک ٹک دیکھے جاتی تھی۔ انہوں نے پھر اسے تسلی دی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ مشورے کی محتاج تھی۔ وہ اس بات کی منتظر تھی کہ کوئی ہاتھ پکڑ کر اسے سیدھے راستے پر لگا دے۔ صمدانی صاحب نے اس کی ڈھارس بندھائی لیکن وہ خاموش نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔

کبھی تو اس کا جی چاہتا کہ اپنا دل ان کے سامنے کھول کر رکھ دے۔ انہیں اک اک زخم دکھا دے۔ اپنا چاک چاک دامن ان کے سامنے پھیلا کر دنیا بھر کی چاہتیں مانگ لے۔ جن میں سے اسے کبھی حصہ نہیں ملا تھا لیکن ابا میاں کی محبت اس کے دل کو سکون دے سکتی ہے لیکن اس کی صورت تو نہیں بدل سکتی تھی۔ جواد کے گھر والے تو خوبصورت دلہن چاہتے تھے اور پھر اس نے یہ سوچا ہی کب تھا کہ جواد اس کا ہو جائے۔ اسے تو اس نے ہمیشہ گڑیا کی ملکیت جانا تھا۔ صمدانی صاحب نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جو اس کی عمر سے کہیں زیادہ بردبار نظر آتا تھا لیکن اس کے انداز سہمے سہمے تھے۔

ایک لمحے کو اس نے سر اٹھایا اور سادگی سے بولی۔ ''ابا میاں! میں تو کچھ بھی نہیں چاہتی' کچھ بھی نہیں چاہتی۔''

☆ ☆ ☆

صمدانی صاحب کو صاف معلوم ہوا کہ یہ اس کے دل کی آواز نہیں۔ ٹھہری ہوئی آواز میں بولے۔ ''بیٹے! تمہیں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے کا حق ہے' جو کچھ تم چاہو' تمہیں پانے کا حق ہے۔ زندگی یوں ہاتھ باندھے اور منہ پر انگلی رکھ کے نہیں گزارتے۔''

''ابا میاں!'' اس نے بھرے ہوئے گلے سے کہا۔ ''ابا میاں! آپ مجھ سے پیار کرتے ہیں؟''

صمدانی صاحب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر امید و ناامیدی کی دھوپ چھاؤں گڈمڈ ہو رہی تھی۔

''ہاں ہاں تمو! کیوں نہیں' تو تو میری سب سے پیاری بیٹی ہے۔'' انہوں نے پیار سے کہا اور اسے سمجھانے لگے۔ تمت کو محسوس ہوا جیسے وہ ایک بار پھر جی اٹھی ہے۔ بچوں کے سے بھولپن سے بولی۔

''ابا میاں! آپ گڑیا کے تو نہیں' سارے کے سارے میرے ہیں نا۔''

صمدانی صاحب ہنس دیئے۔

''گڑیا کی اماں بی جو ہیں اور تمہارے ابا میاں۔'' اس کی آنکھوں میں ستارے سے چمک اٹھے۔

بے ساختہ بولی۔ ''پھر تو ابا میاں! مجھے کچھ نہیں چاہیے اور کچھ نہیں۔ بالکل کچھ نہیں' باقی سب گڑیا لے لے...... سب لے لے۔''

محسن بھائی نے دروازہ کھولا۔ اسے دیکھ کر کھل اٹھے' ڈھیر سے اک چپت اس کے سر پر لگا کر بولے۔

''بھول گئی تھیں اپنے محسن بھائی کو جو آج صورت دکھائی ہے۔''

تمت کو ان کی مانوس آواز' ان کا اپنائیت بھرا لہجہ بے حد پیارا لگا۔ ایک دم ہی اس کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

''نہیں تو محسن بھائی۔''

''آؤ نا اندر۔'' انہوں نے بچوں کی طرح اس کے شانے کے گرد بازو لپیٹ دیا۔ اس گھر کی فضا کتنی گرم تھی جیسے ماں کی گود' یہاں لمحے کتنے عزیز ہو جاتے تھے۔ پورے وجود کو چھو چھو کر گزرتے تھے۔ اٹکھیلیاں کرتے ہوئے وہ صوفے پر بیٹھ گئی تو محسن بھائی نے غور سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تمو! بڑی کمزور ہو رہی ہو' کیا بات ہے' بیمار تھیں۔''

''نہیں تو محسن بھائی!'' اس نے جھجک کر ہاتھ رخسار پر رکھا۔

''ٹھیک تو ہوں۔''

''اچھا ٹھیک ہو۔'' وہ ہنس پڑے اور کھڑکی سے پردہ ہٹاتے ہوئے بولے۔

''گھر گئی تھیں نا تم۔''

''جی!!!'' تمت نے سعادت مندی سے کہا۔

''کیا حال ہے سب کا۔''

پتہ نہیں تمت کا جی کیوں چاہا کہ وہ رخ پھیریں تو ان کا چہرہ دیکھے۔ ڈائری کے صفحات اس کی نگاہوں میں گھومنے لگے۔ ''سب ٹھیک ہیں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

محسن بھائی پلٹے اور اک نگاہ اس پر اس طرح ڈالی کہ جیسے کہہ رہے ہوں کہ اک اک نام لے کر سب کی روئیداد کہو۔

''محسن بھائی سب خیریت ہے' سب اچھے ہیں۔'' تمت نے بات پھر مختصر کی تو ان کے چہرے پر اک تجسس اور تذبذب کی سی کیفیات چھانے لگیں۔ جیسے کچھ معلوم کرنا چاہتے ہوں لیکن سوال نہ کرتے ہوں جیسے جاننا چاہتے ہوں لیکن استفسار زبان پر نہ لاتے ہوں۔ تمت ان کی کیفیت بھانپ رہی تھی۔ اسے پشیمان سے محسن بھائی پر بڑا ہی پیار آیا۔ اٹھ کر ان کے قریب چلی آئی اور بولی۔ ''محسن بھائی!!''

وہ جھجکی تو انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ تھوڑی سی

متذبذب ہوئی اور پھر بولی۔

"میں آپ کو شبو آپا کے بارے میں بتاؤں۔" وہ ایک دم چونکے۔ ان کے متغیر چہرے پر اک ملال کی سی کیفیت آئی اور گزر گئی۔ جیسے کسی ناقابل حصول لیکن عزیز چیز کا تصور اک داغ دے جائے لیکن اپنی حالت پر قابو پا کر بولے۔ "کیوں کوئی خاص بات ہے؟"

تمت نے ان کے اس خودساختہ سکون کو دیکھا جس نے ان کی آنکھوں میں دکھ ہی دکھ گھول دیئے تھے۔ کاش وہ ان آنکھوں میں مسرت کے دیپ جلا سکتی۔ اپنے اتنے سارے دکھوں میں ان کے یہ دکھ بھی شامل کر کے انہیں مسرتوں سے ہمکنار کر دیتی۔ اسے خاموش دیکھا تو وہ بڑی بردباری سے بولے۔

"ہاں تمو! تم کیا کہہ رہی تھیں؟" تمت حسب عادت سہم سی گئی اور رک رک کر بولی۔

"محسن بھائی! میں شبو آپا کی بات کر رہی تھی۔"

"ہوں کیا بات ہے؟" انہوں نے پھر پوچھا۔

"محسن بھائی! ان کی خرم بھیا کے ساتھ شادی ہو گئی۔ ان کا ایک بیٹا بھی ہے معظم۔"

وہ اپنے چہرے سے' اپنی آواز سے کچھ بھی ظاہر نہیں ہونے دے رہے تھے۔ "یہ تم نے مجھے پہلے بھی بتایا تھا۔"

تمت کو چپ سی لگ گئی۔ اسے ڈھنگ نہیں مل رہا تھا کہ کس طرح ان سے شبو آپا کے بارے میں بات کرے۔ وہ کتنے گہرے تھے کہ سارے دکھ' ساری محرومیاں خود میں اس طرح سمیٹے ہوئے تھے کہ ان کا ایک زخم بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اک ٹیس بھی ان کے چہرے پر ظاہر نہیں ہوتی تھی۔

"تمو! بڑی خاموش بیٹھی ہو۔ منہ پر انگلی بھی رکھ لو تو لگے میں بڑا ظالم ماسٹر ہوں اور یہ چھوٹی سی بچی دبکی بیٹھی ہے۔" وہ بے دلی سے مسکرا دی۔ بولی کچھ نہیں۔

محسن بھائی کو اچانک جیسے کچھ یاد آ گیا۔ "تمو! ادھر آنا ذرا چندا!!"

"جی!!" وہ ان کے قریب چلی آئی۔

"یہ میری کوٹ کی جیب میں دیکھنا کیا ہے؟"

تمت نے اک نگاہ ڈالی۔ "محسن بھائی رومال ہے نا۔"

"ذرا نکال کے تو دیکھو۔"

تمت نے رومال نکالا۔ وہ ایک دم ہی چونک گئی۔ "ہائے محسن بھائی یہ تو وہی ہے۔"

"کیا ہے؟"

محسن بھائی نے اس کا منہ چڑایا۔ "وہی ہے نا!!" وہ کھلکھلائی۔

"بالکل۔!!" وہ ہنسے۔

"اب تک آپ کے پاس ہے۔" اس نے پوچھا۔

"کیوں نہ ہوتا؟"

"نہیں میرا مطلب ہے۔ آپ نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔" وہ اشتیاق سے بولی۔

انہوں نے شرارت سے اس کے گال پر چٹکی لی۔ "اچھا تو سنبھال کر نہ رکھتا۔ تم نے تو اس کے پیچھے گڑیا سے اتنی مار بھی کھائی۔"

تمت کا چہرہ اتر سا گیا۔ بھولی باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں۔ دکھ کی ایک ٹیس سی' نہ جانے کہاں اٹھی۔

محسن بھائی نے مذاق سے کہا۔ "تمو! تجھے اب تو گڑیا نہیں مارتی۔"

وہ اک دم ہی ان کے قریب اکڑوں بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ ان کے گھٹنوں پر رکھ کے سرگوشی میں بولی۔

"محسن بھائی! ابامیاں کہتے ہیں کہ گڑیا کی اماں بی اور میرے ابامیاں۔"

اس کے چہرے پر بچوں کی سی بے ساختہ مسرت طاری تھی۔

"ارے واہ۔" انہوں نے ابرو اچکائے۔ "تم تو فائدے میں رہیں۔ پتہ ہے اماں بی تو ڈانٹتی رہتی ہیں اور ابامیاں کچھ بھی نہیں کہتے۔"

"ہاں' ابامیاں کچھ بھی نہیں کہتے۔ وہ مجھے بڑا پیار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں تم میری سب سے پیاری بیٹی ہو۔" اس نے بیتابی سے بتایا اور پھر سنجیدگی سے پوچھنے

لگی۔

''ہیں، محسن بھائی! میں سچ مچ اچھی ہوں۔''

''اور نہیں تو کیا' تم تو بہت اچھی لڑکی ہو۔ اتنا پڑھی لکھی ہو' ڈاکٹر ہو' سب کا علاج کرتی ہو اور پھر بھی ایسی بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔''

وہ ایک ٹک ان کے چہرے کی طرف دیکھتی گئی جیسے ذہن میں ان کی بات تول رہی ہو۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر اسے یقین دلایا کہ وہ سچ کہہ رہے ہیں۔

تمت یوں بولی جیسے اچانک کچھ یاد آ گیا ہو۔''ڈاکٹر تو میں آپ کیلئے بنی تھی محسن بھائی!''

''اچھا!!'' محسن بھائی کو بھی وہ بچپن کی تمت یاد آ گئی۔ وہ تو اب بھی ویسی ہی تھی۔ چھوٹی سی تمت۔ انہوں نے پیار سے اس کے بال بکھرا دیئے۔''بھئی مجھے پتہ ہوتا کہ تم اتنی زبردست ڈاکٹر بننے والی ہو تو میں اپنے پاؤں کا علاج نہ کرتا۔ تم ہی میرا علاج کرتیں' ہیں؟؟''

''ہائے اللہ نہیں' آپ نے بہت اچھا کیا۔ اب تو آپ بالکل ٹھیک ہو گئے ہیں۔''

''ہاں' ٹھیک تو ہو گیا ہوں۔'' ان کے لہجے میں اک حسرت سی ٹپکتی تھی۔

تمت کا جی چاہا کہ یونہی ان کے قریب بیٹھی باتیں کرتی جائے۔ ان کے دل میں جھانک دیکھے۔ اپنے دل کی ساری باتیں ان سے کہہ دے۔ اک اک دکھ ان کے سامنے کھول دے۔ ان کی تسلی لیتی جائے۔ ان کی باتیں چن چن کر اپنے آنسوؤں میں بھیگے آنچل میں باندھتی جائے۔

''چلو رومال تو مجھے دے دو کہ اب نیت خراب ہو رہی ہے۔'' محسن بھائی نے اس سے رومال لے کر اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا تو وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ ان کی گود میں سر رکھ کر وہ بلاوجہ ہنستی چلی گئی۔ اس کی اس ہنسی میں بچپن کا چونچال پن اور بے ساختگی تھی۔ محسن بھائی نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا اور پیار سے بولے۔

''پگلی ہو گئی ہو۔''

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر فرحان سے پھر جھڑپ ہوئی تھی اور معرکے کی ہوئی تھی۔ وجہ وہی ان کی لاپروائیاں۔ تمت کے ساتھ دو تین دن سے ٹھنی تھی۔ نہ انہوں نے بات کی' نہ ہی تمت نے بلایا۔ کسی وقت وہ حیران ہو کر سوچتی کہ ڈاکٹر فرحان تو میری صورت بھی دیکھنے کے روادار نہیں اور جواد کو وہ افواہ نہ جانے کس نے جا سنائی تھی۔ معلوم نہیں کس کے ذہن کی اختراع تھی لیکن جواد کو تو بدگمانیوں میں الجھا گئی تھی۔

راؤنڈ سے فارغ ہو کر ابھی پل بھر کو آرام کرنے بیٹھی ہی تھی کہ ڈاکٹر فرحان کھٹ پٹ کرتے کمرے میں آئے۔ تمت نے دیکھا لیکن خاموش رہی۔

''ڈاکٹر تمت صمدانی آپ یہاں ہیں۔'' وہ میز کے دوسرے کنارے پر آ کھڑے ہوئے۔ مارے طیش کے ان کی تیوریاں چڑھی تھیں۔

تمت سہم کر مبہم سی آواز میں بولی۔''جی فرمائیے۔''

''آپ خود کو سمجھتی کیا ہیں؟'' ڈاکٹر فرحان نے دانت پیسے تو وہ پشیمان سی ہو گئی۔ ہونٹ کاٹتی ہوئی سراسیمہ سی ہو گئی۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''آپ خود کو بہت قابل سمجھتی ہیں جو دوسروں کے خلاف رپورٹ دیتی پھرتی ہیں۔''

''جی میں تو' میں نے تو' کسی کو کچھ نہیں کہا۔'' وہ حیران رہ گئی۔

''اب زیادہ معصوم مت بنیے۔ آپ ہی نے ڈاکٹر آفریدی کو میرے خلاف رپورٹ دی ہے۔''

''آپ سے' آپ سے کس نے کہا۔'' وہ اس کی غیر معمولی درشتی سے روہانسی ہو گئی تھی۔

''کسی کو کہنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے خود علم ہے کہ یہ سب آپ ہی نے کیا ہے۔'' اس نے میز پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر آفریدی نے اس کی اچھی جھاڑ پونچھ کی تھی۔

تمت کرسی کی پشت سے لگ گئی۔ اٹکتی ہوئی بولی۔''آپ کو کیسے علم ہے؟''

''خدمت خلق کا بھوت بھی آپ پر ہی سوار رہتا ہے' دوسروں کو نصیحتیں کرنے

کا خط بھی آپ ہی کو ہے۔''

وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ چپ ہو گیا تو سکون سے بولی۔ ''اور کوئی ثبوت؟''

ڈاکٹر فرحان کا پارہ اور چڑھ گیا۔ جھنجھلا کے بولے۔ ''مجھ پر تو آپ اور بھی مہربان رہتی ہیں اور یہ آپ کی ان ہی مہربانیوں میں سے ایک مہربانی ہے۔''

''میں صرف آپ کو آپ کے فرائض کا احساس دلانا چاہتی ہوں اور بس۔ مجھے معلوم نہیں کہ آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ میں نے ڈاکٹر آفریدی سے کچھ نہیں کہا۔

☆......☆......☆

''میں غلط بیانی کا یقین کیونکر کر لوں۔'' انہوں نے طنز آمیز لہجے میں کہا تو تمت اکتا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کرسی کی پشت سے اوور آل اتار کر پہننے لگی۔ وہ اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ ''ڈاکٹر تمت! آپ کو اپنی رپورٹ واپس لینا ہوگی۔''

تمت پریشان ہو کر بولی۔ ''ڈاکٹر فرحان! آپ کو میری کسی بات کا یقین نہیں۔''

ڈاکٹر فرحان نے ایک بار اس کے سانولے معصوم چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر سچائی کا نور تھا لیکن وہ اس قدر گھبرائی ہوئی سی تھی جیسے کوئی کچا چور اپنا جرم چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اسے اور بھی پختہ یقین ہوا کہ یہ کام اسی کا ہے۔ ڈپٹ کر بولا۔ ''آپ جھوٹ نبھا نہیں سکتیں۔ بہتر ہے کہ غلط بیانی نہ کریں۔''

تمت کو الفاظ نہیں مل رہے تھے کہ اس کی تردید کرتی۔ وہ جو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس پر جھوٹا الزام لگائے جا رہا تھا اور اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اسے سختی سے ٹوک دے۔ اپنی بے بسی پر اس کی آنکھوں میں آنسو آئے جاتے تھے۔ آنسو چھپانے کو وہ پلٹی تو ڈاکٹر فرحان نے سختی سے اس کا بازو پکڑ لیا۔

''سنا آپ نے۔ ڈاکٹر آفریدی سے جا کر اپنی رپورٹ واپس لے لیجئے اور انہیں یقین دلایئے کہ آپ نے کسی ذاتی رنجش کی بنا پر ایسا کیا تھا۔ محترمہ یہ میرے کیریئر کا سوال ہے۔''

تمت کیلئے ضبط کرنا محال ہو گیا۔ چڑ کر اپنا بازو اس سے چھڑاتی ہوئی بولی۔

''میں نے کہا نہیں آپ سے ایک بار کہ ڈاکٹر آفریدی سے میں نے کچھ نہیں کہا۔'' اس کی آواز رندھ گئی تھی اور آنسو رخساروں تک آ گئے تھے۔ ڈاکٹر فرحان نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں کوئی آ تو نہیں رہا۔ جلدی سے اسے اپنا رومال پیش کرتے ہوئے بولا۔

''دیکھئے' آپ خواتین والا ہتھیار استعمال مت کیجئے۔ میں اس کے سامنے قطعی بے بس ہوں لیکن آپ اس معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ آپ خود سوچئے۔ ڈاکٹر آفریدی کی رائے خراب ہو جانا کتنا برا ہے۔'' وہ اب نرمی پر اتر آئے تھے۔

تمت نے ساڑھی کے پلو سے آنکھیں پونچھ ڈالیں اور سادگی سے بولی۔

''میں آپ کیلئے کیا کر سکتی ہوں؟''

ڈاکٹر فرحان کو اس کے انداز پر حیرت ہوئی۔ ''ڈاکٹر تمت! آپ نے واقعی میرے خلاف رپورٹ نہیں دی۔''

تمت جھنجھلا گئی۔ ''آپ کو کس طرح میری بات کا یقین آئے گا؟''

''اچھا؟؟؟'' اس نے بے یقینی سے کہا۔ ''اگر آپ نے نہیں دی تو پھر کون ہو سکتا ہے۔ سارے اسٹاف کے تعلقات تو میرے ساتھ اچھے ہیں۔''

''آپ کا کوئی مریض بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''خیر کوئی مریض اتنا بارسوخ نہیں۔''

''بارسوخ لوگوں کو تو آپ شکایت کا موقع بھی نہیں دیتے جو افتاد پڑتی ہے غریب لوگوں پر' ہو سکتا ہے کسی غریب میں اتنی جرأت ہو۔''

ڈاکٹر فرحان نے تیکھے تیوروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ کی یہی باتیں مجھے شک میں مبتلا کرتی ہیں۔''

''شک میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو اپنے رویئے پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ آپ میں کوئی بات ایسی ہے تو کسی کو شکایت کا موقع ملا۔''

''خیر آپ کو نصیحت کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔'' وہ پھر ہتھے

سے اکھڑ گئے۔ ''لیکن یہ جس کی شرارت ہے اسے تو ایک بار مزہ چکھا کر رہوں گا۔''

تمت نے ایک بار اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''اچھے لوگوں کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔''

اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

صبح ہی صبح کس کا فون ہے۔ وہ گھبرائی۔ ریسیور ہاتھ میں لے کر بولی۔

''یس! ڈاکٹر تمت صمدانی۔''

''یس ڈاکٹر تمت! میں بے چارا آپ کا مریض بول رہا ہوں' ہائے!!!''

دوسری طرف سے کراہتی ہوئی آواز آئی تو وہ پریشان سی ہو گئی۔ آواز بھی اس سے پہچانی نہیں گئی۔ نامعلوم کون تنگ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دوسری طرف ریسیور میں پھر کوئی دردناک آواز میں کراہا۔ ''ہائے ڈاکٹر''

تمت سنجیدہ ہو گئی۔ ''دیکھئے وقت ضائع مت کیجئے' اپنا نام بتائیے' کہاں سے بول رہے ہیں۔''

''ہائے ڈاکٹر! نام میں کیا رکھا ہے' پہچاننی ہے تو آواز پہچانو۔''

تمت بڑے غور سے آواز سنتی رہی۔ کہیں سنی تو ضرور ہوئی تھی لیکن کہاں یاد نہیں تھا۔ کس کی آواز تھی' یہ ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہوا تو کسی نے پھر کہا۔ ''افسوس یہ بھی دیکھنا تھا' خدایا! ابھی مجھے کون کون سے صدمے اٹھانے ہیں۔'' آواز میں مصنوعی تاسف جھلکتا تھا۔ تمت جھجکتی ہوئی بولی۔ ''آپ جواد بھائی تو نہیں۔''

''بدقسمتی یا خوش قسمتی سے میں جواد بھائی نہیں۔'' وہ پھر سوچ میں پڑ گئی۔ آواز تو مانوس تھی۔ منظر بھائی یا خرم بھائی میں سے کوئی نہیں ہو سکتا۔ اگر ہوں بھی تو اس بے تکلفی سے بات نہیں کریں گے۔ ہار کر بولی۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں پہچان نہیں پائی۔ دیکھئے میں سبھی مریضوں کے نام تو یاد نہیں رکھ سکتی۔''

''لیکن خاص مریضوں کے نام تو یاد رکھنے چاہئیں۔''

''میرا کوئی خاص مریض نہیں۔'' اس نے تنک کر کہا۔ ''آپ اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہے ہیں۔''

''مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی آواز نہیں پہچان سکی۔''

''اور مجھے بھی افسوس ہے کہ میں نے بھی قسم کھائی ہے کہ جب تک تم پہچانو نہیں تمہیں ہرگز نہیں بتاؤں گا' سمجھیں تم۔''

آواز میں ہلکی سی درشتی تھی۔ وہ ریسیور رکھ دینے کو ہی تھی کہ ایک ہی اسے کوئی انداز یاد آ گیا۔ بے تابی سے بولی۔ ''ہائے آپ عمران بھائی تو نہیں۔''

''یہ ہائے! کا کیا مطلب ہے؟'' وہ روٹھے روٹھے سے تھے' وہ ہنس پڑی۔

''عمران بھائی کیا حال ہیں۔'' وہ ڈرتی ہوئی اس سے آپریشن کے بارے میں پوچھ رہی تھی حالانکہ دل بے قرار تھا۔

''اب یاد آئے عمران بھائی؟ تم تو ایسی بھاگیں کہ میری پٹی کھلنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔''

وہ محجوب ہوئی۔ ''میں شرمندہ ہوں عمران بھائی۔ دراصل چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں۔''

''ہوں' میرے لئے تو چھٹیاں ختم ہو جاتی ہیں' دوسرے مریض زیادہ لاڈلے ہیں۔''

وہ ان کے انداز پر کھل کر ہنسی۔ ''نہیں تو عمران بھائی! آپ تو سب سے لاڈلے ہیں۔ اب جلدی سے بتائیے آپ ٹھیک تو ہیں نا۔''

''یہ تو تم خود ہی آ کر دیکھ لو' میں کیوں بتاؤں۔''

''پلیز بتائیے نا۔ اب آپ بالکل ٹھیک دیکھ سکتے ہیں۔''

''یہ بھی تم خود ہی آ کر دیکھنا۔''

''پلیز عمران بھائی۔ تنگ مت کریں' مجھے اتنی بیتابی ہو رہی ہے۔''

''بیتابی ہو رہی ہے تو آ کر دیکھ جاؤ۔''

''اوں ہوں بتاتے کیوں نہیں۔'' وہ جھنجلائی۔

''اور تم۔ مجھے بتا کر گئی تھیں۔ پٹی کھلنے کے بعد میں تمہارا چہرہ ڈھونڈتا رہا اور

تم پتہ چلا کہ دو تین دن ہوئے تشریف لے گئیں۔ میں تو فون بھی نہ کرتا۔ اماں کے کہنے پر کیا۔"

تمت نادم ہوئی۔ "سچ مچ عمران بھائی۔ اب آپ اور شرمندہ نہ کریں۔"

"خیر خالی خولی شرمندگی سے تو کام نہیں چلے گا۔ تمہیں تو میں سزا دوں گا ایسی کہ بس تم یاد ہی کرو گی۔" انہوں نے دانت پیسے تو وہ سہم سی گئی۔ رک رک کر بولی۔

"عمران بھائی! میں واقعی سب سے بری ہوں' میں تو۔"

"ارے رے' یہ تم سے کس نے کہہ دیا۔" عمران نے عجلت میں اس کی بات کاٹی۔

اس کی آنکھوں میں خودبخود آنسو آ گئے۔ وہ آنسو پیتی ہوئی خاموش رہی۔ عمران نے سرزنش کے انداز میں کہا۔ "سنو' تمت ایسا کبھی مت کہنا۔ اچھا دنیا میں کوئی برا نہیں ہوتا۔ دنیا والے اسے بنا دیتے ہیں۔ اب اگر تم رونے کی تیاری کر رہی ہو تو جلدی سے ہنس دو۔"

تمت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ یوں ہولے سے در آئی جیسے تاریکی میں اجالے کی ہلکی سی لو چمک اٹھتی ہے۔ آنکھوں میں آئے آنسو رخساروں پر بہہ گئے تھے۔

"تمت گڑیا کی شادی پر آؤ گی تو ملنا۔ میرا تو اس گھر میں داخلہ ہی بند ہے۔"

"گڑیا کی شادی؟؟؟" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

"تمہیں نہیں معلوم۔" عمران نے پوچھا۔

"مجھے ابھی تک اطلاع نہیں ملی۔" اس نے عجیب سی حیرت سے کہا جس میں سو محرومیاں جھلکتی تھیں۔

"جواد سکالرشپ پر باہر جا رہا ہے نا اسی لئے شادی میں جلدی کی۔"

وہ چپ سنتی رہی جیسے جواد اور گڑیا اس کیلئے غیر ہوں۔ گڑیا نے تو ہمیشہ اس کے حصے کی چیز پائی تھی۔ ہمیشہ دھونس جما کر اس کا حصہ بھی لیا تھا تو زندگی کے اس موڑ

پر بھی۔ وہ بہت اونچی' بہت بلند کھڑی جواد کا ہاتھ تھامے اس کی پستی پر ہنس رہی تھی۔ اس کے خوبصورت چہرے پر جیت اک روشن ہالہ بن گئی تھی جس نے اس کے جہاں سوز حسن کو خیرہ کن بنا دیا تھا۔ تمت کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ اس کے سارے جذبات آنکھیں موندے تھے۔ اسے معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی حس ختم ہو گئی ہے۔ کوئی اس کے قریب نہیں آتا۔

"تمو! کیا ہوا' ریسیور رکھ دیا ہے تم نے۔" دوسری طرف سے عمران اس کی غیرمعمولی خاموشی سے حیران ہوا۔ تمت سن رہی تھی لیکن بول نہیں سکتی تھی۔ وہ یوں گم صم کھڑی تھی جیسے پتھر کی ہو۔ عمران نے دو ایک دفعہ پکارا تو وہ ہولے سے بولی۔

"جی!"

"چپ کیوں ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں تو عمران بھائی! میں ذرا سسٹر سے بات کر رہی تھی۔" اس نے جلدی سے بہانہ گھڑ لیا لیکن آواز کانپ رہی تھی۔

"تو پھر آ رہی ہو؟"

"جی!" اس کی شکستہ آواز میں ایسی ٹیس سی اٹھتی تھی جیسے کوئی آنکھیں بند کر کے جسم میں چبھا ہوا کانٹا نکال رہا ہو۔

"تو پھر وعدہ؟"

"وعدہ۔" اس نے ہولے سے کہا اور خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

اماں بی نے بھی حکم نامہ لکھوا بھیجا تھا کہ گڑیا کی شادی پر فوراً چھٹی لے کر پہنچو۔ تمت نے محرومیوں کا زہر پینا سیکھا تھا اس نے کبھی اپنی خواہش پوری ہوتے نہیں دیکھی تھی۔ وہ تو ہر لمحے کسی نہ کسی چیز کے چھن جانے کی منتظر رہتی تھی۔ چپ چاپ کچھ نہ کچھ دے دینے کو تیار رہتی تھی۔ جواد کی شادی کی خبر بھی اس کیلئے اک آنسو کی طرح تھی جو دل کا درد بن کر آنکھوں کے راستے بہہ جائے اور محرومیوں کا اک داغ سا بن کر روح میں گھاؤ لگا دے۔

کچھ چھٹیاں مل گئی تھیں۔ وہ گھر جانے کیلئے بکس میں کپڑے رکھ رہی تھی۔ گھر' گھر اس کیلئے کوئی پناہ گاہ نہیں تھا۔ تحفظ کا کوئی نشان نہیں تھا۔ گھر کے تصور سے

اسے محبت تھی۔ اک خاموش سی الفت تھی لیکن ایسی سہمی ہوئی سی محبت جو یکطرفہ ہوتی ہے اور اپنی ہی نارسائی میں کھوئی ہوئی ہمیشہ سلگتی رہتی ہے۔ دروازے پر دستک ہوئی اور فوراً ہی کوئی اندر آ گیا۔ تمت نے پلٹ کر دیکھا اور کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ وہ تو جواد تھا۔ پھر جلدی سے چونک کر بولی۔

''جواد بھائی! آپ کیسے ہیں؟''

''کوئی اعتراض؟؟؟'' اس نے اک بے ساختہ مسکراہٹ کے ساتھ خم ہو کر کہا۔''یہاں کسی کام سے آیا تھا۔ سوچا تمہیں بھی دیکھتا چلوں۔''

☆......☆......☆

تمت بے دلی سے مسکرا کر رہ گئی۔ بکس بند کرتے ہوئے بولی۔''آپ کیلئے چائے تو منگواؤں۔''

''نہیں تمت' موڈ نہیں۔ تم کہیں جا رہی ہو۔'' اس نے استفسار کیا۔

''جی گھر جا رہی ہوں۔ سہ پہر کی گاڑی سے۔'' اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔

''اتنی جلدی جا کر کیا کرو گی؟''

''اماں بی نے کہلوایا ہے۔''

''تم ساری زندگی اماں بی کے کہنے پر ہی رہنا' اچھا!''

''نہیں تو!!!'' اس نے چہرہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''تمت! کل چلی جانا' نا۔''

''کل' اچھا کل چلی جاؤں گی۔'' اس نے سعادت مندی سے کہا۔''پر چھٹیاں تو میں نے آج ہی سے لے لی ہیں۔''

''تو کیا ہوا۔ باقی چھٹیاں گھر پہ گزار دو گی' ایک چھٹی میرے ساتھ بھی گزار لو۔''

''جی!!!'' وہ پشیمان سی ہو گئی۔

''تمو! تم سمجھ نہیں سکتیں کہ تمہاری یہ معصومیت' یہ ریاکاری اور چالاکی سے پاک باتیں' تمہاری الجھی ہوئی شخصیت مجھے کتنی عزیز ہے۔ تم اتنی بھولی' تم مرد کی فطرت کو کیا سمجھو' مرد عورت کو ہمیشہ اک پہیلی کے روپ میں چاہتا ہے جس کی کوئی نہ کوئی ادا چھپی رہے۔ ڈھونڈنے سے اچانک دریافت ہو' کھوجنے سے عیاں ہو' کھلی

ہوئی کتاب کی طرح سامنے آ جانے والی عورتیں بہت جلد کشش سے محروم ہو جاتی ہیں۔"

تمت حیرت سے منہ کھولے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے ایسی باتیں تو کبھی نہیں سنی تھیں۔ ایسے انجانے احساسات تو اس کے اندر کبھی بیدار نہیں ہوئے تھے۔ یہ جواد بھائی کیا کہہ رہے ہیں۔ اس نے حیران ہو کر سوچا اور ڈرتے ڈرتے بولی۔

"جواد بھائی! مجھے آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔"

جواد کو اس پر ٹوٹ کے پیار آیا۔ جی چاہا کہ اسے ڈاکٹر فرحان کی گرفت سے چھڑا کر دور کہیں بہت دور لے جائے جہاں اس کی ایسی ہی معصوم باتوں میں کھویا ہے۔ وہ چھوٹی سی لڑکی جو کچھ بھی نہیں جانتی تھی جس کے اندر کی عورت اتنی سہمی ہوئی تھی کہ پلک تک نہیں جھپکتی تھی۔ اس کے جذبات کا گلا یوں گھونٹا گیا تھا کہ ان میں کبھی ہلچل پیدا نہیں ہوئی تھی۔ نہ جانے ڈاکٹر فرحان نے اسے کیونکر رضامند کر لیا تھا۔ اس بھولی بھالی لڑکی نے کیا سوچ کر ہاں کر دی تھی۔ خدا کرے فرحان اس کی آنکھ میں کبھی آنسو نہ آنے دے۔ اس نے دل کی گہرائیوں سے تمنا کی اور گم صم سی کھڑی تمت سے بولا۔

"تمو! میں چاہتا ہوں آج کا دن ہم اچھے دوستوں کی طرح ایک ساتھ گزاریں۔ بہت سی اچھی اچھی ہمیشہ یاد رہنے والی باتیں کرتے ہوئے ماضی یا مستقبل کا ہر تصور بھلا کر صرف حال کا ذکر کریں کہ یہ لمحے اک یادگار بن کر ہماری عزیز متاع ہوں۔ جب بھی اچھے دوستوں کا ذکر آئے تو ہم ایک دوسرے کا نام لیں۔ تمو! میں زندگی ان ہی خوشگوار یادوں کے نام کرنا چاہتا ہوں۔"

تمت کا جی چاہتا تھا کہ اس بکھرے بکھرے سے جواد کے سینے سے لگ کر سب کچھ کہہ دے۔ ٹوٹا ہوا دل اس کے سامنے رکھ دے۔ اس کے شفقت بھرے ہاتھ کو ہمیشہ کیلئے مانگ لے۔ ایسی جرأت تو اس کی فطرت میں نہیں تھی اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب کچھ بھی سوچنا لاحاصل تھا۔ جواد اس سے دور بہت دور ہٹا دیا گیا تھا۔ وہ دل میں جھانکتی تو اسے موجود پاتی لیکن آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کرتی تو کچھ نہ دیکھ پاتی۔

"تمت! میں تمہیں اداس تو نہیں کرنا چاہتا۔" اسے خاموش دیکھ کر جواد نے

کہا۔

"میں تو تمہارے لئے خوشیاں ڈھونڈتا رہا ہوں۔ میں تمہیں سوگوار نہیں دیکھنا چاہتا میں خوش ہوں کہ تم نے اپنی زندگی کا فیصلہ خود کیا ہے۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم دوسروں کے فیصلوں کے درمیان پس کر نہ رہ جاؤ۔"

اک زخمی سی مسکراہٹ تمت کے لبوں کو چھو گئی۔ جواد بھائی شاید نہیں جانتے کہ مجھے عمر بھر دوسروں کے فیصلوں کی قیمت چکانا ہے۔ وہ اک آہ بھر کر رہ گئی۔ اس میں تردید کا حوصلہ نہیں تھا اور اب اس کا فائدہ بھی کیا ہے۔ بڑی چالاکی سے جواد کو اس کے موقف سے ہٹایا گیا تھا۔ گڑیا کے حسن نے کس شان سے اسے سرنگوں کیا تھا۔ اس کی بدصورتی کی اک اور سزا اسے سنائی جا رہی تھی جس کے خلاف وہ احتجاج بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی بے چارگی آنسوؤں میں ڈھلنے لگی۔ اس کی محرومیاں گلے میں پھندے سے ڈالنے لگیں' بے بسی سے ہاتھ ملتی ہوئی وہ اک لفظ بھی نہیں کہہ پائی تھی' سب کچھ دیکھتی تھی لیکن نابینا سمجھی جاتی تھی۔ سب کچھ سنتی تھی لیکن کوئی اس کیلئے کچھ نہیں کہتا تھا۔

نہ جانے کس طرح یہ لفظ اس کے ہونٹوں تک آئے اور ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتے چلے گئے جیسے کوئی درد سے کراہ رہا ہو' جیسے کرب والم سے ہونٹ لرز گئے ہوں اور بے ساختہ سسکیاں لبوں تک آ گئی ہوں۔

"جواد بھائی! میں ہمیشہ آپ کو یاد رکھوں گی۔ میں آپ کو یاد کروں گی' بہت یاد کروں گی' آپ' آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔" وہ سر جھکا کر انگوٹھا چوس رہی تھی لیکن جواد نے اسے ٹوکا نہیں۔

☆......☆......☆

گڑیا کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ سارا کام تو تمت پر ہی آ پڑا تھا۔ گھر مہمانوں سے بھر گیا تھا۔ نازی تو ویسے ہی کاہل تھی۔ گڑیا دلہن تھی۔ اماں بی کو بھی کام سے زیادہ حکم دینے کی عادت تھی۔ لے دے کہ بیچاری تمت ہی پسی گئی۔ ادھر ادھر گھومتے گھومتے وہ خود گھن چکر بن گئی تھی۔

سب بہنیں خوب بنی ٹھنی تھیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت لگ رہی تھی

لیکن طرح دار بیگموں کے روپ میں بیٹھی تھیں جیسے اپنے ہی گھر مہمان ہوں۔ بارات آ بھی گئی لیکن اسے کپڑے تک بدلنے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ مہمانوں کے اترنے سے پہلے بھی اس نے الٹی سیدھی ساڑھی لپیٹی اور بال سمیٹتی ہوئی باہر آئی لیکن پھر بھی اماں بی سے ڈانٹ پڑی کہ بارات کو پہنانے کیلئے جو ہار منگوائے گئے تھے مل نہیں رہے تھے۔ خدا خدا کر کے مہمانوں کا استقبال ہوا۔ انہیں نشستوں پر بٹھایا گیا۔ جواد کی بھابی نے بڑی طنزیہ سی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''آپ تیار نہیں ہوئیں۔'' تمت گڑبڑا سی گئی۔ چہرے سے بال ہٹاتی ہوئی ہولے سے بولی۔

''جی میں تو تیار ہوں' بس بال جلدی میں ٹھیک سے نہیں بندھے۔''

''اچھا؟'' انہوں نے عجیب سے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ جواد کی بہن شیریں' ان کا بیٹا اٹھائے ہوئے آئی۔ اسے دیکھا تو عجیب سے تمسخر سے بولی۔

''ہیلو ڈاکٹر تمت!''

تمت نے جواباً ہیلو کہا اور آگے بڑھ گئی۔

جواد کو آرسی مصحف کیلئے بلایا گیا تو اتنے ہجوم میں تمت پس کر رہ گئی۔ ساری بہنوں نے دوپٹہ پکڑا نیگ لیا لیکن تمت کا کسی کو خیال نہیں آیا۔ وہ سب سے پیچھے ایک کونے میں کھڑی تھی۔ دلچسپ باتیں ہو رہی تھیں' قہقہے لگائے جا رہے تھے لیکن اس کو کسی نے بھی شریک کرنے کی زحمت نہیں کی۔ اس نے تو اتنا بھی نہیں دیکھا تھا کہ جواد دولہا بنا کیسا لگتا ہے اور گڑیا کے چہرے پر اس کی اپنی شکست کتنے رنگوں میں سنورتی ہے اور جواد نے میک اپ سے چمکتے سرخ و سفید چہروں میں اس کے سانولے سلونے چہرے کو نہ پا کر دکھ سے سوچا تھا کہ وہ اس ہنگامے سے دور نہ جانے کس دور دراز گوشے میں بیٹھی انگوٹھا چوس رہی ہوگی اور شاید فرحان کے متعلق۔ اس سے آگے سوچنا کتنا اذیت ناک تھا۔

دوسرے دن ولیمے پر جانے کو بھی بڑے تیار ہوئے تھے لیکن تمت دن بھر کاموں میں جتی رہی تھی۔

اماں بی نے جاتے ہوئے یہی کہا تھا کہ شام کے کھانے کا انتظام اچھی طرح

سے دیکھ لے' کوئی کام ادھورا نہ رہ جائے۔ کہیں بعد میں گڑیا کو سسرال والوں کی باتیں نہ سننی پڑیں۔

ابا میاں نہ جانے کس کام سے گھر آئے تو اسے سر جھاڑ منہ پھاڑ کچن سے نکلتے دیکھا تو حیران رہ گئے۔ وہ یونہی ہنس پڑی۔ دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی۔

''ابا میاں! میں نے کہا ذرا صفائی وغیرہ کرا لوں۔ شام کو گڑیا جو آئے گی۔''

''اک تم ہی رہ گئی ہو سب کام کرنے کو۔'' وہ خاموش سی ہو کر ہونٹ کاٹنے لگی۔ تو ابا میاں بولے۔

''چلو چلو' اب حلیہ ٹھیک کروا دینا' لڑکیاں بالیاں کچھ یوں رہتی ہیں۔''

''ابا میاں! میں ذرا برتن رکھوا لوں۔'' اس نے بہانہ گھڑا۔

''رکھوا لے گی گلاں خود ہی اور یہ کریمن کو کس لئے بلوایا ہے۔ چلو تم تیار ہو جاؤ 10 منٹ میں۔''

وہ جھجکی۔ ''ابا میاں! رہنے دیں' اتنا کام ہے۔ میں نہیں جاتی۔''

''بیٹا۔'' انہوں نے پیار سے اس کی طرف دیکھا۔

''خود پر اتنا بوجھ لو جتنا جھیل سکو' اب تیار ہو جاؤ۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔'' وہ پس و پیش کرنے لگی لیکن وہ اندر چلے گئے۔

ابا میاں کے ساتھ وہ پورچ میں اتری تو اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ کس کے پاس جا کر بیٹھے۔ سبھی اس کے شناسا تھے لیکن سب ہی کتنے اجنبی تھے کہ کسی کو مخاطب کرنے کی جرأت وہ خود میں نہیں پاتی تھی۔ اس کے قدم اٹھتے نہیں تھے۔ یوں لگتا تھا کہ سبھی اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ وہ جھینپی جھینپی سی چلتی جاتی تھی لیکن کہاں رکے یہ نہیں جانتی تھی۔ اچانک ایک جانب بیٹھے ہوئے مہمانوں میں سے کسی نے اٹھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ وہ سہم سی گئی۔ اتنی جلد وہ اندازہ ہی نہیں کر سکی کہ وہ کون ہیں۔

''تمت بیٹا! تو تو فرشتہ ہے میری چاند۔ خدا تیرے نصیب نیک کرے۔ تجھے سدا خوش رکھے میری بچی!''

تمت نے سنبھال کر پیشانی پر پیار کرتے ہوئے انہیں دیکھا۔ ''اصغری

خالہ۔'' وہ محجوب سی ہوگئی۔ ''عمران بھائی کیسے ہیں؟ اس دن انہوں نے مجھے فون پر کچھ بھی نہیں بتایا۔''

''خدا کا شکر ہے۔ وہ تو بالکل ٹھیک ہوگیا ہے۔ اب تو دیکھتا ہے سب کچھ۔''

''اچھا!'' تمت مسرور ہوئی۔ ''اصغری خالہ میں نے کہا تھا نا آپ کی دعاؤں سے وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ لوگ تو یونہی گھبرا رہے تھے۔''

''بیٹا! تو نہ ہوتی تو ہمارا پتہ نہیں کیا حال ہوتا۔''

''نہیں تو خالہ۔'' بات اس کے منہ میں ہی رہی۔ سامنے ہی بیٹھی اماں کی قہر آلود نگاہیں اسی پر تھیں۔ سہم کر وہ خاموش سی ہوگئی۔ اصغری خالہ کو بھی شاید اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

''جاؤ بیٹی! اپنی سہیلیوں میں بیٹھو' ہنسو بولو۔''

وہ اماں بی کی نظر بچاتی دوسری طرف چل دی لیکن دھڑکا اب بھی دل کو لگا تھا۔ گھبرائی گھبرائی سی ادھر سے ادھر دیکھتی تھی لیکن کوئی ایسا نظر نہیں آتا تھا جس کے پاس بیٹھ جائے۔ ہال میں دور صوفے پر گڑیا دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اس کے گرد سب رشتے دار لڑکیاں اکٹھی تھیں۔ وہ ہچکچا رہی تھی کہ کس طرح اتنے لوگوں میں چلی جائے۔

☆......☆......☆

اپنا نام سن کر وہ چونکی۔ مڑ کر دیکھا گیلری میں عمران بھائی کھڑے تھے۔ وہ ان کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ ویسے کے ویسے ہی' اسے یقین کرنا محال ہوگیا۔ روشن آنکھیں' خوبصورت چہرہ' کہیں کہیں زخموں کے مندمل ہونے کے ہلکے نشانوں نے انہیں اک دلکش سی بردباری عطا کر دی تھی۔ مسرت سے سرشار ہو کر وہ تیزی سے ان کی طرف لپکی۔

''عمران بھائی! آپ بالکل ٹھیک ہو گئے نا۔''

''تمہیں کوئی شک ہے۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا اور چلتے ہوئے گیلری کے آخری سرے کی طرف آ نکلے۔ تمت بھی ان کے ساتھ ساتھ چلتی گئی۔ وہ بالکل اسی طرح مسرور تھی جیسے اس کا عرصے سے بیمار مریض صحت یاب ہوگیا ہو۔

چہکتی ہوئی بولی۔ ''عمران بھائی! اب تو آپ بالکل ٹھیک دیکھ سکتے ہیں۔''

عمران بھائی نے اک ذومعنی سی نگاہ اس پر ڈالی۔ ''تمہیں دیکھ سکتا ہوں' تو سمجھو سب کچھ دیکھ سکتا ہوں۔''

''شکر ہے آپ بالکل ٹھیک ہو گئے۔'' وہ اپنے جذبات کے اظہار کیلئے مناسب لفظوں کی تلاش میں تھی۔ عمران نے اس سادہ سی پرخلوص لڑکی کی طرف دیکھا جو ہلکی گلابی رنگ کی ساڑھی میں سیدھے سادھے بال بنائے یوں نظر آتی تھی جیسے اس نے کبھی آئینہ نہ دیکھا ہو۔ انہوں نے بے ساختہ اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ وہ سمٹ گئی۔ اور سہم کر ان کی طرف دیکھا۔

''تمت!!'' انہوں نے پکارا۔ ایسی آواز تمت نے کبھی نہیں سنی تھی جس کی بازگشت ہمیشہ روح میں گونجتی رہے۔ معلوم نہیں کیوں اسے جواد یاد آ گیا۔

''تمو! میں بہت برا ہوں' بہت شرمندہ ہوں۔ میں نے تمہیں بڑا ستایا ہے' تمہیں تنگ کیا' تمہیں ٹھکرایا۔ تمو! میں زندگی بھر تم سے اپنی غلطیوں کی معافی چاہتا رہوں گا۔''

''نہیں تو عمران بھائی!!'' وہ اس کی نگاہوں سے پشیمان سی ہوگئی۔ ''مجھے تو' مجھے تو خیال بھی نہیں۔'' ان کا ہاتھ پیچھے ہٹا کر وہ دروازے سے لگ گئی۔

''مجھے تو یہ خیال ستاتا رہتا ہے کہ میں نے نادانی میں تمہیں کھو دیا۔''

تمت سن ہوگئی۔ بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتی گئی وہ کہتا گیا۔

''تمو! سنو تمو' میں تمہیں تم سے مانگنا چاہتا ہوں ہمیشہ کیلئے' زندگی بھر کیلئے۔ تم پچھلی تلخ باتیں بھلا دو۔ مجھے زندگی کے ساتھی کی ضرورت ہے۔ ڈیکوریشن پیس کی نہیں۔ مجھے تم جیسی پرخلوص لڑکی کی ضرورت ہے۔ تمت! مجھے تمہاری ضرورت ہے۔''

''عمران بھائی!'' وہ کانپ رہی تھی۔ اس کا چہرہ سپید تھا۔ لرزتی ہوئی ٹانگوں پر وہ اپنا وجود بڑی دقت سے سنبھالے ہوئے تھی۔

''تمت! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' عمران نے اس کی حالت غیر دیکھ کر کہا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہیں پاتی تھی۔ عمران نے پشیمان ہو کر کہا۔

''تمو! اگر تمہیں یہ سب پسند نہیں تو میں تمہیں ہرگز مجبور نہیں کروں گا' کبھی نہیں' تمت کبھی نہیں۔''

''عمران بھائی! میں اتنی بری ہوں' میں تو کسی کے قابل نہیں۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر رو دی۔

''تمت! کیا کہہ رہی ہو؟'' عمران نے عجلت سے دونوں ہاتھ اس کے چہرے سے الگ کر دیئے۔

''کچھ نہیں' بس کچھ نہیں۔'' اس نے سر کو دائیں بائیں جھٹکا۔ وہ نیم پاگل سی نظر آتی تھی۔

''تمت بولو۔ بولو نا۔ بات ہونٹوں پر نہیں روک لیا کرتے۔ کہہ دو نا تمہارے دل میں کیا ہے۔''

تمت کچھ دیر ساکت سی رہی۔ پھر ہانپتی ہوئی بولی۔ ''عمران بھائی! آپ مجھ پر ترس نہ کھائیں۔''

عمران نے جھٹ اس کی بات کاٹی۔ ''نہیں تمت! ایسا مت کہو۔ تم میرے دل میں بستی ہو۔ تم میری روح میں رہتی ہو۔''

''نہیں عمران بھائی نہیں۔'' اس نے مڑ کر کہا۔ ''میں بدصورت ہوں' میں کالی ہوں' میں انگوٹھا چوستی ہوں۔ مجھے کچھ نہیں آتا' مجھے کوئی پسند نہیں کرتا اور آپ اتنے اچھے' اتنے سمارٹ۔''

''تمت!!!'' عمران نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھا۔ ''مجھے تمہاری ضرورت ہے' صرف تمہاری' تم جیسی بھی ہو' جتنی بھی بدصورت ہو' جتنی بھی کالی ہو' انگوٹھا چوستی ہو' کچھ بھی ہو مجھے تم نے دوسری زندگی دی ہے تو یہ زندگی تمہارے نام ہے۔'' تمت کیلئے یہ سب کتنا انوکھا تھا۔ وہ خود کو فراموش کر بیٹھی تھی۔ اسے معلوم ہوتا تھا اس نے کبھی آئینہ نہیں دیکھا۔ صرف خود کو عمران بھائی کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ عمران بھائی کی آواز فضاؤں میں رچ بس گئی تھی اور ایک ایک بوند امرت بن کر اس کے مردہ جسم میں رمق جان لا رہی تھی۔

''تمت! تم نہیں جانتی کہ تمہاری پرخلوص باتوں نے مجھے جینا سکھایا ہے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر پھر زندگی کی شاہراہ پر لا کھڑا کیا ہے۔''

وہ بنا پلک جھپکے اس کی جانب دیکھتی جاتی تھی۔ عمران نے اس کا ہاتھ ہاتھوں

میں لے لیا۔

''تمت! تم کہو تو میں تمہارے گھر والوں سے تمہارا ہاتھ مانگوں۔'' اس کا ہاتھ ٹھنڈا یخ ہو رہا تھا۔ عمران نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور بولا۔

''مجھے مایوس تو نہیں کرو گی۔'' گیلری کے دوسرے سرے پر کسی کے بولنے کی آواز سے دونوں چونکے۔ عمران جلدی سے باہر نکلتا ہوا بولا۔ ''تمت! پھر بات کریں گے۔''

تمت وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ پھر ہولے ہولے چلتی گیلری سے باہر آ گئی۔ عمران کے الفاظ اب بھی اس کا پیچھا کر رہے تھے جیسے ننھے منے شریر بچے کھل کھلاتے ہوئے کسی کے پیچھے چلے آئے ہوں۔ ہزار کہے سے بھی نہ مانتے ہوں۔

گھر بھر ایک بھونچال کی زد میں تھا کہ اصغری خالہ نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا۔ سب حیران آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ ان کی آمد کا سبب کیا ہے۔ اماں بی ابھی پوری طرح سے سمجھ بھی نہیں پائی تھیں کہ اصغری خالہ نے انہیں گلے سے لگا لیا۔ گلے شکوے ہونے لگے' پرانی باتیں دہرائی گئیں۔ شکایتوں کے دفتر کھل گئے۔ اصغری خالہ کے سامنے اماں بی کی ایک نہ چلی اور زیادتی بھی انہی کی تھی کہ برے وقت میں انہوں نے صاف آنکھیں پھیر لی تھیں۔ لیکن دونوں گھرانوں کے ملاپ کا واسطہ تمت بنی تھی۔ اس کا بے ریا خلوص دلوں کی کدورتیں دھو گیا تھا۔ اصغری خالہ نے تمت کو عمران کیلئے مانگا تھا۔ اماں بی پس و پیش کر رہی تھیں' انہیں تو نازی کی فکر تھی۔ تمت تو ڈاکٹر تھی اپنے پاؤں پر کھڑی تھی نازی تو بی اے کر کے گھر بیٹھی تھی تو اچھے رشتے کے انتظار میں بہاروں ایسے دن بیتے جاتے تھے۔ اسی لئے اماں بی کیلئے وہ ہاتھ کا چھالا بن گئی تھی۔ یونہی اشارتاً ذکر بھی کیا لیکن اصغری خالہ نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ عمران کو اور انہیں صرف تمت چاہیے۔

نازی نے سنا تو جیسے دل میں ایک پھانس سی چبھ گئی۔ عمران جیسا سمارٹ لڑکا تو ہر ایک کے خوابوں کا شہزادہ بن سکتا تھا۔ تمت نے جانے اس کے ساتھ کیا ساز باز کی تھی جو وہ یوں اس پر لٹو ہوا تھا۔ اصغری خالہ کو بھی اور کچھ نہیں سوجھا۔ رشتہ مانگنا تھا تو اس کا مانگتیں۔ وہ بڑی تھیں' اس کا حق بھی بنتا تھا۔ ایک آئیڈیل کے تصور سے اس کے

سپنے بھی رنگین تھے۔ کوئی بھی ہو خواہ عمران ہی کیوں نہ ہو۔ اسے تو تمت پر حیرت ہو رہی تھی۔ یوں تو بات تک ڈھنگ سے کرنی نہیں آتی لیکن عمران بھائی کو کیسا شیشے میں اتارا تھا۔ اسے تمت سے شدید نفرت ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ اس کا حق لئے جاتی ہے۔ جی چاہتا تھا چلا چلا کر روئے۔ اسے اماں بی پر غصہ آ رہا تھا۔ اسے اصغری خالہ پر غصہ آ رہا تھا۔ اسے دنیا کی ہر چیز بری لگ رہی تھی۔

تمت نے سنا تو دبک کر رہ گئی۔ خوف سے اس کا رواں رواں کانپ اٹھا۔ اماں بی کیا کہیں گی، کہیں ناراض نہ ہوں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں چھپ جائے۔ سب کی نگاہوں سے روپوش ہو جائے۔ کوئی اسے نہیں دیکھے' اس سے کچھ نہیں پوچھے۔ وہ ایک حیرت ناک تجربے سے دوچار تھی۔ دنیا کچھ نئی نئی سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پاتی تھی کہ اب کیا ہوگا۔

اماں بی نے ابھی اصغری خالہ کو تسلی بخش جواب نہیں دیا تھا۔ ان کے دل میں نازی کی کھٹک تھی۔ وہ صرف نازی کی ماں بن کر سوچ رہی تھی کہ شاید کوئی بات بن جائے۔

چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ جواد اور گڑیا بھی بیرون ملک سدھار رہے تھے لیکن اس سے کسی نے ملنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اصغری خالہ کی آمد نے اسے گھر والوں کی نگاہوں میں مجرم سا بنا دیا تھا۔ وہ چوری بنی سب سے نگاہیں چراتی پھرتی تھی۔ عمران بھائی نے پہلے اس کا پیغام مسترد کر دیا تھا اور اب بڑے اصرار سے اس کا رشتہ مانگا تھا۔ اس میں نمایاں تمت ہی نظر آتی تھی۔ سب بڑی عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھتے تھے کہ وہ خاموش سی تمت کتنی ہوشیار نکلی تھی۔ مشکوک نگاہیں' طنزیہ جملے۔

ہسپتال پہنچی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا لیکن اس کی انجانی سوچیں بھی اس کے ساتھ ہی چلی آئی تھیں جن میں گھر کر وہ سمجھ نہیں پاتی تھی کہ وہ خوش ہے یا ناخوش۔ عجیب سا خوف اور ڈر اس پر مسلط تھا۔ گھر والوں نے اس کو اپنی ہی نگاہوں میں حقیر کر دیا تھا۔

اس کی ساتھی ڈاکٹر زملیں تو خلاف معمول بہت خاموش خاموش تھیں۔ اس نے پوچھا تو پتہ چلا کہ ایک حادثے میں ڈاکٹر فرحان کی اکلوتی بہن کا انتقال ہو گیا ہے۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہسپتال میں انہیں بروقت طبی امداد نہیں مل سکی تھی ورنہ زندگی کی امید کی جا سکتی تھی۔ ڈاکٹر فرحان جب سے واپس آئے تھے اس کی بری حالت تھی۔ تب سے اپنے کمرے میں بند تھے' گم صم سے بیٹھے سگریٹ پیتے رہتے تھے۔ یہی دیکھ کر ڈاکٹر آفریدی نے بغیر پس و پیش ان کی چھٹیاں بڑھا دی تھیں۔ تمت کو بھی بہت افسوس ہوا۔ ڈاکٹر فیروزہ نے بھی تاسف سے کہا۔ ''ویسے انہوں نے بہت اثر لیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے انہیں بہن سے بہت پیار تھا۔''

اپنی چیزیں کمرے میں چھوڑ کر چائے کے گھونٹ جلدی جلدی حلق سے اتار رہی تھی کہ چپڑاسی نے بتایا کہ ڈاکٹر فیروزہ اپنے منگیتر کے ساتھ ڈرائیو پر جا رہی ہیں اور ان سے معذرت کر گئی ہیں۔ ڈاکٹر طلعت ڈیوٹی پر تھیں کیا کرے' تنہا جانا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر ٹہلتی ہوئی سوچتی رہی۔ نہیں جاتی تو ڈاکٹر فرحان سوچیں گے کہ اس سے تلخ کلامی ہوتی رہتی ہے اسی لئے وہ جان بوجھ کر نہیں آئی۔

یہی سوچ کر وہ تنہا ہی چل پڑی۔

''ڈاکٹر فرحان کمرے میں ہیں۔'' اس نے ان کے کمرے سے نکلتی ہوئی سسٹر لیلیٰ سے پوچھا جس نے عجلت سے آنکھیں رومال سے صاف کر لیں لیکن دھلی دھلی آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ تمت نے پوچھنا مناسب نہ سمجھا لیکن دل ہی دل میں ڈر سی گئی کہ نہ جانے کیا بات ہے جو سسٹر لیلیٰ رو رہی ہیں' ہمدردی کی ایک لہر سی اس کے دل میں بیدار ہو گئی۔

دروازہ کھول کر اس نے پردہ ہٹایا اور ہولے سے بولی۔ ''ڈاکٹر فرحان میں آ سکتی ہوں۔''

اس کی آواز پر سامنے پلنگ پر بیٹھے ہوئے ڈاکٹر فرحان نے اس کی طرف دیکھا اور ایک ٹک دیکھتے ہی چلے گئے۔ تمت حیران رہ گئی۔ اتنے سے دنوں میں وہ کتنے کمزور ہو گئے تھے۔ بے ترتیب کمرہ' الجھے بال' میز پر ایش ٹرے' سگریٹ کے باقیات سے بھری پڑی تھی۔ تمت دکھ کی ایک شدید کیفیت میں ڈوبتی چلی گئی۔ ایسے رکھ رکھاؤ والے ڈاکٹر فرحان ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔

اچانک ڈاکٹر فرحان کو نہ جانے کیا ہوا۔ ایک دم اٹھ کر اس کے گلے سے لگ

گئے۔ تمت بھونچکی سی رہ گئی اور اس کے شانے پر سر رکھے ہچکیوں سے رو رہے تھے۔
ان کے تیزی سے بہتے ہوئے آنسوؤں کی نمی اسے شانے پر محسوس ہو رہی تھی۔ حیرانی و
غم سے وہ بدحواس سی ہو کر رہ گئی۔ کسی اتنے بڑے آدمی کو اس نے آج تک روتے
نہیں دیکھا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ انہیں کیونکر تسلی دے۔ انہیں بچوں کی طرح
روتے دیکھ کر اسے عجیب سا دکھ ہو رہا تھا جیسے فرحان اس کا اپنا بچہ ہو جس کے گرم آنسو
اسے اپنے دل پر گرتے محسوس ہو رہے تھے۔

''تمت! ڈاکٹر تمت!'' انہوں نے سر اس کے شانے سے اٹھایا۔ چھوٹی سی
تمت اب بھی ان کے بازو میں تھی جس کا رنگ صدمے سے فق ہو رہا تھا۔

اس نے اپنے دوپٹے سے ان کے آنسو پونچھے۔ ''ڈاکٹر فرحان حوصلہ کیجئے نا'
جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔''

''تمت! ڈاکٹر تمت! جو نہیں ہونا چاہیے تھا وہ ہوا ہے فری کو میرے گناہوں
کی سزا ملی ہے۔ وہ میری کتنی پیاری بہن تھی۔'' وہ ایک بار پھر رو پڑے۔

تمت کو ان پر بڑا رحم آیا۔ اس کی اپنی آنکھیں بھی بھیگ رہی تھیں لیکن وہ
ضبط کیے جاتی تھی۔

''ڈاکٹر تمت! کاش وہاں کوئی آپ جیسی ڈاکٹر ہوتی تو فری کو موت چھین نہ
لے جاتی۔'' اس نے تمت کو چھوڑ دیا اور خود نڈھال سے ہو کر وہیں کرسی پر ڈھیر ہو
گئے۔

''خدا کی مرضی میں کس کو دخل ہے۔'' اسے تسلی کیلئے الفاظ نہیں مل رہے
تھے۔

''یہ خدا کی مرضی نہیں اس کا غضب ہے۔ میں دوسرے سے غفلت برتتا رہا
لیکن میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی میرے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔''

''آپ نے اپنی غلطی تسلیم کی یہی آپ کی عظمت ہے۔ ہمیں مشیت کے
فیصلوں پر سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔'' وہ خاموش ہو گئے۔ جیسے کوئی چھوٹا سا نادان بچہ اپنے
کیے پر نادم ہو۔ وہ ہولے ہولے اسے سمجھاتی رہی۔ اتنے سکون اور بردباری سے کہ
اس کا ایک ایک لفظ ڈاکٹر فرحان کے دل میں اترتا محسوس ہوتا تھا۔ اس کے لہجے کی

شیرینی ڈاکٹر فرحان کی تلخی کم کیے دیتی تھی۔

''ڈاکٹر فرحان اس طرح کمرے میں بند ہو جانا تو ٹھیک نہیں۔ آپ خود کو
کام میں معروف رکھیں گے تو آپ کو بڑا سکون ملے گا۔'' اسے خاموش دیکھا تو تمت
نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ وہ اب بھی خاموش رہے۔ سگریٹ کے ٹکڑے
ایش ٹرے میں مسلتے رہے۔ تمت نے گھڑی دیکھی اور اٹھتے ہوئے بولی۔ ''اچھا تو میں
چلوں۔ پھر آؤں گی۔'' ڈاکٹر فرحان نے یکا یک اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

☆......☆......☆

"ڈاکٹر تمت! پلیز آپ ابھی مت جائیں۔" ان کی آنکھیں بھیگی تھیں اور انداز میں التجا گھلی ملی تھی۔ تمت حیران رہ گئی۔ ایسے اکھڑ اور بدمزاج ڈاکٹر فرحان کو کیا ہو گیا تھا۔ ان کی حالت اتنی قابل رحم تھی کہ تمت نے ہاتھ نہ چھڑایا۔ پھر خلوص سے دوسرے ہاتھ سے ان کے ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ "آپ کہتے ہیں تو میں کچھ دیر اور بیٹھ جاتی ہوں۔ ڈیوٹی ہے نا' اس لئے جلدی کر رہی ہوں۔"

ڈاکٹر فرحان کے چہرے پر طمانیت سی بکھر گئی۔ انہوں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "ڈاکٹر تمت! آپ کے سامنے اعتراف کر کے میرے ضمیر کا بوجھ کم ہو گیا ہے۔ آپ کی باتوں میں کتنا سکون ہے' کتنی سچائی ہے۔"

تمت جھینپ کر ہونٹ کاٹنے لگی۔ ڈاکٹر فرحان نہ جانے کیا کچھ کہتے رہے۔ وہ شاید بار بار کے اعتراف سے پشیمانی و ندامت کے اظہار سے' متاسف ہو ہو کر اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے تھے۔ بہن کی جدائی نے انہیں آئینہ دکھلا دیا تھا۔ اپنی نااہلیاں اور کوتاہیاں انہیں یاد آتی تھیں تو تڑپ کر رہ جاتے تھے لیکن تمت کی تسلی و تشفی نے اس کے ہمدردانہ رویئے نے انہیں اس سبک سری سے نجات دلا دی تھی جو وہ اپنے آپ میں محسوس کر رہے تھے۔ انہیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ چلی جائے گی تو وہ ندامتوں کے بوجھ تلے دب کر رہ جائیں گے' پشیمانیوں میں گھر جائیں گے۔

تمت کچھ دیر بعد بھی ان کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ انہیں سمجھاتی رہی۔ انہیں تسلیاں دیتی رہیں۔ پھر چلنے کیلئے اٹھی تو انہوں نے روکا نہیں۔ وہ خدا حافظ کہہ کر چل دی تو ان کی آنکھوں میں ایک التجا امنڈ آئی۔

"ڈاکٹر تمت! فرصت ہو تو پھر بھی آیئے گا۔"

"ضرور۔" خلوص کی بنا سے اس کا چہرہ چمک اٹھا۔

ہاتھوں میں اون اور دوسری خریداری کے بنڈل سنبھالے تھکی تھکی سی چال چلتی وہ اپنے کمرے تک آئی تو جھجک کر کچھ دور کھڑی رہ گئی۔ عران بھائی پہرہ داروں کے انداز میں برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا تو لمبے لمبے ڈگ بھرتے اس کے قرب چلے آئے۔

"یہ ڈاکٹر صاحبہ کہاں آوارہ گردی کرتی پھر رہی ہیں؟"

وہ کچھ شرمائی' گھبرائی اور جھجک کر انہیں سلام کرنے لگی۔ انہوں نے مزاحیہ انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"جیتی رہو' آؤ نا کمرہ کھولو۔" اسے ٹھٹھک کر کھڑے دیکھا تو وہ بولے۔

"جی اچھا۔" وہ تعمیل کو بڑھی۔ انہوں نے اس کے ہاتھ سے چابی پکڑ لیا اور دروازہ دھکیل کر اس بولے۔

"چلو آؤ!!" وہ اندر گھسی تو عمران بھائی پردے کے پیچھے سے بولے۔ "آ جاؤں؟"

تمت نے جلدی سے چیزیں پلنگ پر رکھیں اور پردہ ہٹا کر بولی۔ "عمران بھائی! آ جائیں نا' کھڑے کیوں ہیں؟" وہ کرسی پر براجمان ہو گئے۔ "اچھا تو مس ڈاکٹر! کیسے حال ہیں تمہارے؟"

وہ مسکرائی' جواب کچھ نہیں دیا اور یوں ہی چیزیں سمیٹنے لگی۔ اسے کوئی بات نہیں سوجھ رہی تھی۔ یہی عمران بھائی تھے جن سے اس نے گھنٹوں باتیں کی تھیں لیکن اس وقت اس کی صاف دلی ہی سب کچھ کہلواتی رہی تھی لیکن اب اسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ عمران بھائی اس کے خواستگار ہو سکتے ہیں لیکن اس میں انہیں کیا نظر آیا ہے۔ میں تو اپنی ماں کو بھی اچھی نہیں لگتی تو انہیں۔

"بھئی میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔" وہ ایک دم اس کے قریب اٹھ کر چلے آئے۔ وہ سمٹ کر الماری سے جا لگی۔

"ایک تو تم عجیب ہو اور ایک تمہاری اماں بی طرح دیئے جاتی ہیں۔ سیدھی سادھی ہاں کر کے نہیں دیتیں۔"

تمت ہونٹ کاٹنے لگی۔ اسے اماں بی کے رویئے سے پہلے ہی شک ہو گیا تھا۔ چپ چاپ انگوٹھے سے قالین کریدتی رہی۔

''تم بھی تو کچھ کہو نا۔'' انہوں نے اس کے بال اچھالے۔ وہ صرف ایک بار ان کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ اس کے لرزتے لب کتنے مجبور تھے۔ ان کی ایک جنبش پر بھی اسے اختیار نہیں تھا۔ سامنے کھڑے ہوئے عمران بھائی کو ہاتھ بڑھا کر چھو لینا کتنا آسان تھا لیکن اسے اپنا بنا لینے کی تمنا کرنا بھی کتنا شوار تھا۔ اس تمنا کے راستے میں کتنی دیواریں حائل تھیں۔ وہ تو اتنی بے بس تھی' دوسروں کے فیصلوں کے سامنے مجبور تھی۔

عمران بھائی الجھے۔ ''عجیب مصیبت ہو تم' بگی' بھئی کچھ کہہ دو گی تو زبان نہیں گھسے گی۔''

تمت سہم گئی۔ مجھے تو اذن گویائی کبھی نہیں ملا۔ میں کیا کہہ دوں جس طرح جواد کو ثریا کا مقدر بنا دیا گیا۔ اس طرح عمران بھائی بھی نازی کی بارات لے کر جائیں گے اور میں بدصورتی کے طعنے سہتی پھر بھی چپ رہوں گی کچھ نہیں کہہ پاؤں گی۔ میں بدصورت ہوں۔ میں خوبصورتی کی تمنا کیونکر کروں۔

''تمت!'' عمران بھائی مخاطب ہوئے۔ ''تم پریشان ہو کچھ مجھے بتاؤ' کیا بات ہے۔ اگر تمہیں اس بات پر کوئی اعتراض ہو تو تم خود کو مجبور مت سمجھو۔'' تمت نے تڑپ کر سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں محرومیوں کے دل کے دل اتر آئے تھے۔ عمران بھائی مجھے تو یہ باتیں کہنا نہیں آتیں۔ اس نے سوچا۔ اماں بی تو اٹل حاکم ہیں۔ ان کے سامنے تو میں پلکیں بھی نہیں اٹھا سکتی۔ میں کس پر اعتماد کر کے ضد کروں' کون ہے جو میری ضد پوری کرے گا۔

''ہاں بولو۔'' عمران بھائی نے کہا۔

''کچھ نہیں' کچھ نہیں۔'' اس نے سراسیمہ ہو کر کہا اور انگوٹھا چوسنے لگی۔

عمران کو معلوم ہوا جیسے وہ کسی بے جان مورت سے یہ سب کچھ کہتا رہا ہے جو نہ دیکھتی ہے' نہ سنتی ہے' نہ کچھ کہہ سکتی ہے۔ یہ انگوٹھا چوستی ہوئی لڑکی محبت کا اقرار کیا کرے گی۔ نہ جانے وہ اتنی ٹھنڈی' بے حس اور پتھر کیوں ہے۔ اس کے دل میں کوئی ارمان نہیں۔ اڑی اڑی سی رنگت لئے وہ یوں کھڑی ہے جیسے کوئی مشکل پرچہ حل کرنے

آئی ہو۔ اپنے چاہنے والے کے سامنے نہیں کسی جلاد کے سامنے کھڑی ہے۔

اس کے لرزتے ہونٹ دیکھ کر عمران کو اس پر رحم آ گیا۔ نہ جانے وہ کس الجھن کا شکار ہے۔ کس نے اس کے جذبات پر پہرے بٹھا دیئے ہیں جو وہ عورت ہو کر بھی حس لطیف سے بیگانہ ہے۔ چاہتوں کے مفہوم سے نا آشنا ہے۔ ہمدردی سے عمران نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ بڑی لگاوٹ سے اسے پلنگ پر بٹھایا اور سمجھانے کے انداز میں بولے۔

''تمو! بس تم اسی طرح خاموش رہنا' مجھے جو کرنا ہے میں خود سمجھ لوں گا لیکن تم یہ یقین رکھو کہ میں نے اتنی شدت سے انجم کو بھی نہیں چاہا تھا۔ تمہاری چاہت میں عقیدت بھی شامل ہے۔ سچ کہتا ہوں مجھے تم سے اتنی ہی عقیدت ہے جیسے تم میری دیوی ہو۔ میری دیوی ہو۔'' انہوں نے پوری سچائی سے کہا اور جھک کر اس کے پاؤں چھو لئے۔

تمت کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ حیرت سے گنگ ہو گئی۔ اسے اپنی سماعت پر اعتبار نہیں آتا تھا۔ عمران بھائی یہ کیا کہہ رہے ہیں' کیوں کہہ رہے ہیں۔ وہ اس لائق بھی ہے کہ کوئی اس سے پیار کرے' کوئی اس کو چاہے۔ نہیں' نہیں یہ ایک سہانا خواب ہو سکتا ہے۔ کوئی رنگین تصور ہو سکتا ہے' کوئی حسین سپنا ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت تو نہیں ہو سکتی۔ عمران بھائی اس کی کیفیت بھانپ رہے تھے۔ وہ اسے اسی تصور میں سرشار رکھنا چاہتے تھے۔ وہ اسے یقین کر لینے کو ایک عرصہ دینا چاہتے تھے۔ چاہتوں کا مفہوم جان کر اسے مان لینے کیلئے اسے وقت چاہیے تھا۔ جھک کر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے انہوں نے خدا حافظ کہا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

''تمت! تم ہو' خیریت تو ہے۔'' محسن بھائی اسے دیکھ کر حیران ہوئے تو اسے احساس ہوا کہ وہ کیسے ناوقت اٹھ کر یہاں چلی آئی ہے۔ ان کا فکرمند ہونا فطری تھا لیکن وہ عمران بھائی کے فقروں میں کھوئی کھوئی سی نہ جانے کیسے ان کے گھر تک آ پہنچی تھی۔ اس کا چہرہ اب بھی پیلا تھا۔ دل اب بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسے اب بھی اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آتا تھا۔

''آ جاؤ' کھڑی کیوں ہو باہر۔'' محسن بھائی نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔

وہ ہولے ہولے اندر داخل ہوئی اور محسن بھائی کے برابر سے گزرتی چلی گئی لیکن پھر نہ جانے اسے کیا ہوا کہ پلٹ کر اپنے پیچھے آتے ہوئے محسن بھائی کے سینے سے لگ گئی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے یوں امنڈے کہ رخساروں پر آنسوؤں کے تار سے بندھ گئے۔

محسن بھائی کو اس کی توقع نہیں تھی۔ پریشان سے ہو گئے لیکن اس کی ہچکیاں رکنے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ ان کے دل پر قیامت سی گزر گئیں۔ اس کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے انہوں نے کرب سے سوچا کہ ہر روز کوئی نیا دکھ اس چھوٹی سی لڑکی کی تلاش میں رہتا ہے۔ میں کس طرح اس کا دامن خوشیوں سے بھر دوں۔ وہ ان کے سینے سے لگی مسلسل روتی جاتی تھی۔ ان کے بازو کو اس نے اتنی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا جیسے پناہ کی تلاش میں ہو۔ اسے بچوں کی طرح چمکارتے ہوئے بولے۔

''تمو! کسی نے کچھ کہا تجھے' کیا ہوا' شاباش بتاؤ مجھے۔'' انہیں ننھی منی تمت یاد آ رہی تھی جو بچپن سے محرومیوں پر روتی آئی تھی لیکن اس کی بے قراری بتاتی تھی کہ اس کے بڑے ہوتے ہوتے محرومیاں بھی جوان ہو گئی ہیں۔ اس نے بھیگا چہرہ اٹھایا اور معصومیت سے بولی۔ ''محسن بھائی! مجھے کیا ہوا ہے؟''

محسن بھائی حیران رہ گئے۔ انہیں اس کی دماغی حالت مشکوک نظر آنے لگی۔ نہ جانے جذبات کے کس ہیجان نے اسے خود سے اتنا بے خبر کر دیا تھا۔ محسن بھائی نے اس کے آنسو پونچھے اور محبت سے بولے۔ ''تم ابھی خاموش رہو۔''

''جی!'' وہ حیران ہوئی۔ ''میں نے کوئی غلط بات کی ہے۔''

''نہیں۔'' انہوں نے تردید کی۔ ''میرا مطلب ہے کچھ دیر پرسکون رہو۔'' انہوں نے اسے صوفے پر بٹھا دیا۔

وہ خاموش بیٹھی نہ جانے کیا سوچتی رہی۔ محسن بھائی اب تک کافی بنا لائے۔ پیالی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ ''پہلے آرام سے یہ کافی پیو' پھر مجھے بتاؤ کہ بات کیا ہوئی ہے۔''

اس نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور سادگی سے بولی۔ ''محسن بھائی! بات تو کچھ بھی نہیں ہوئی' سچ مچ کچھ نہیں۔''

''تو پھر پگلی ہوئی ہو جو اتنا روئی ہو۔'' وہ جھینپ کر خاموش ہو گئی اور کافی کی چسکیاں لینے لگی۔ پھر کچھ سوچتی ہوئی جھجک کر بولی۔

''محسن بھائی! میں اچھی ہوں؟''

محسن بھائی نے غور سے اس کی طرف دیکھا لیکن بظاہر لاپروائی سے بولے۔

''ہاں' ہاں کیوں نہیں۔''

''اچھا!!!'' اس نے بے یقینی سے کہا۔ ''میرا مطلب ہے' میں انجم آپا سے بھی اچھی ہوں۔''

''یہ انجم آپا کا سلسلہ مجھے سمجھ میں نہیں آیا۔''

وہ گڑبڑا کر بولی۔ ''میں تو یونہی پوچھ رہی تھی۔ وہ بہت پیاری ہیں نا۔''

''مجھے تو اک عرصہ ہوا انہیں نہیں دیکھا۔ معلوم نہیں اب کیسی ہیں لیکن ان کی اک الگ شخصیت ہے اور تمہاری الگ' تم دونوں بہت اچھی ہو سکتی ہو' مقابلہ کیوں کرتی ہو' ہیں۔''

''وہ تو میں...... وہ تو میں نے یوں ہی کہا تھا' آپ سے پوچھ کر دیکھوں' آپ کیا کہتے ہیں۔''

''کیوں' مجھ سے کیوں پوچھو؟''

''مجھے آپ کی باتوں کا یقین آتا ہے نا۔''

''اور دوسروں کی باتوں کا؟''

''مجھے لگتا ہے سب جھوٹ بولتے ہیں۔'' اس نے شکوہ کیا۔

''اور تم خود۔'' انہوں نے چھیڑا۔

''میں تو سچ بولتی ہوں' پر میری بات سنے گا کون؟''

''میں جو ہوں تمہاری باتیں سننے کو۔'' اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس کے ہونٹ ایک بار کھل کر مل گئے جیسے کچھ کہتے کہتے رک گئی ہو۔ محسن بھائی نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں کہو' میں دیکھوں کتنا سچ بولتی ہو۔''

''نہیں کوئی بات نہیں۔'' تمت ٹال گئی۔

جب وہ اٹھنے لگی تو محسن بھائی نے اک لمحے کو اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور بڑے بردبار لہجے میں بولے۔

''تمو! جس نے تم سے کہا ہے نا کہ تم اچھی ہو اس کی بات پر یقین کر لو۔ انجم آپا یا کوئی دوسرا کتنا بھی حسین ہو' اس کے دل کو صرف تم اچھی لگتی ہو' تم بھی اپنے دل سے پوچھنا وہ کیا کہتا ہے؟''

تمت اک لمحے کو ہراساں سی ہو گئی جیسے چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔ حیرت و استعجاب' ندامت و خجالت کی کیفیت میں اس نے ان کی طرف دیکھا۔ اس کے سانولے چہرے پر ایک شرمگیں سی شفق چھا رہی تھی۔ محسن بھائی کو یہ سب کس نے سمجھا دیا تھا۔ اسے محسن بھائی سے بہت سی شرم آنے لگی۔ ہونٹ دانتوں سے کاٹتی وہ جلدی سے باہر نکل آئی۔ اس کے گال تپ رہے تھے۔

''ڈاکٹر فرحان! اب بن باس چھوڑیے اور ہسپتال کی خبر لیجئے۔'' اس کا موڈ بے حد خوشگوار تھا۔ ڈاکٹر فرحان کی ان بہت ساری چھٹیوں میں وہ اکثر ان کے یہاں آتی رہی تھی۔ فرصت میں ان کے پاس بیٹھی' ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہتی۔ اس کے آ جانے سے ڈاکٹر فرحان کو بھی سکون سا مل جاتا تھا جیسے کسی مہربان معالج کو دیکھ کر مریض کی تکلیف آدھی رہ جائے۔

☆......☆......☆

وہ کتنی سادہ و پرخلوص تھی۔ کتنی معلوم اور شائستہ' سہمی سہمی سی' جیسے کسی انجانے حادثے کے خوف سے دبک گئی ہو' خاموش بیٹھی ہو تو کسی کو خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ اس کی باتیں کتنی شیریں ہیں۔ اس کا مہربان چہرہ' صحت کی دیوی کا چہرہ نظر آتا تھا۔ ایسی مہربان ہستی جو سب کے درد میں برابر کی ساجھی تھی۔ ڈاکٹر فرحان بڑی عقیدت سے اس کی باتیں سنتے جیسے وہ کوئی مقدس کتاب پڑھ کر سنا رہی ہے اور وہ مودب بیٹھے اس کے ایک ایک حرف کو متبرک سمجھ رہے ہیں۔

''نہیں ڈاکٹر تمت! میں شاید اب کسی مریض کو نہیں دیکھ سکوں گا۔'' اس نے اذیت سے ہونٹ کاٹے۔

''اک ڈاکٹر کو تو اس طرح نہیں کہنا چاہیے۔'' تمت نے سکون سے کہا۔

''مجھے ہر چہرے میں فری یاد آئے گی۔ مجھے ہر روپ میں وہ دکھائی دے گی۔ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔''

''نہیں نہیں ڈاکٹر فرحان! آپ کو منفی انداز میں نہیں سوچنا چاہیے۔ آپ کو تو تہیہ کر لینا چاہیے کہ جو دکھ آپ کو ملا ہے آپ دوسروں کو اس سے بچائیں۔ دوسروں کو اپنی طرح تڑپنے نہیں دیں گے۔ آپ تو ڈاکٹر ہیں' آپ کو فخر ہونا چاہیے کہ آپ دوسروں کے دکھ بانٹ سکتے ہیں۔''

ڈاکٹر فرحان کو اس کے چہرے کے گرد سچائی کا نور ہالہ کیے معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سادہ چہرے پر ریاکاری کی جھلک تک نہیں تھی۔ ''بس بہت کر لیا آرام آپ نے۔ اب کام شروع کیجئے۔ بس اب تو مزید چھٹی کی درخواست نہ بھیجئے گا۔'' تمت نے شگفتہ انداز میں کہا۔

''ڈاکٹر تمت! کاش سبھی ڈاکٹر آپ جیسے ہو جائیں۔'' ڈاکٹر فرحان نے پوری سچائی سے کہا تو تمت نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''ڈاکٹر فرحان! کتنی خوشی کی بات ہے کہ میں آپ کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو گئی ہوں۔ اب ہمارے ہسپتال سے شاید کسی کو بھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ ہم دوسروں کو بھی یہی پیغام دیں گے۔'' عزم کی چمک سے اس کا چہرہ دمک اٹھا۔

''وعدہ' ملائیے ہاتھ۔'' ڈاکٹر نے ہاتھ بڑھایا۔ تمت نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

اسی وقت پردہ ہٹا اور سسٹر لیلیٰ نے اندر جھانکا۔ چند لمحوں تک وہ مشکوک سی کھڑی رہی پھر اس نے پردہ چھوڑ دیا۔

''سسٹر لیلیٰ!'' تمت نے اسے آواز دی۔ ''سسٹر لیلیٰ!'' وہ پھر پکاری۔ وہ پلٹ آئی لیکن دونوں سے نگاہیں چرا رہی تھیں۔

''معاف کیجئے میں یونہی مخل ہوئی۔''

''نہیں لیلیٰ! کوئی بات نہیں۔'' تمت نے کہا۔ ''تم کس کام سے آئی تھیں؟''

''جی وہ۔'' لیلیٰ گڑگڑائی۔ ''ڈاکٹر صاحب کے کسی مریض کا فون آیا تھا۔ میں انہیں بتانے آئی تھی۔'' وہ ڈاکٹر فرحان کو اس کے مریض کا نام اور فون نمبر بتانے

لگی اور پھر عجلت میں کمرے سے نکل گئی۔

''سسٹر کچھ گھبرائی ہوئی سی لگتی تھی۔'' تمت نے کہا۔

''اچھا' میں نے توجہ نہیں دی۔'' ڈاکٹر فرحان نے بے توجہی سے کہا۔

''اس نے پوچھنے کی مہلت ہی نہیں دی اور پھر باہر بھاگ گئی۔''

''پھر ملے تو پوچھ لیجئے گا۔'' ڈاکٹر فرحان نے کہا۔ گھڑی پر نگاہ ڈال کر وہ اٹھتی ہوئی بولی۔ ''اچھا تو ڈاکٹر فرحان! آپ کی واپسی کب ہو رہی ہے؟''

''آج موڈ بنائیں گے اور کل سے انشاء اللہ ڈیوٹی پر حاضر۔''

''بہت خوب۔'' اس نے خوش دلی سے کہا اور اسے خدا حافظ کہہ کر کمرے سے نکل آئی۔ وہ کتنی خوش تھی۔

محسن بھائی کی باتوں نے اسے اپنی ہی نگاہوں میں کتنا اہم بنا دیا تھا۔ عمران بھائی کی باتوں پر اسے یقین آتا جاتا تھا۔ اک اک بات اس کے لاشعور میں گونجتی اور شعور میں سچائی کا پیارا روپ پا لیتی۔ اس کی کیفیت ایسی ناسمجھ دوشیزہ کی تھی کہ پیار کی اک نگاہ اس پر شعور کے ہزاروں در کھول دیتی ہے۔

وہ اک لڑکی بن کر سوچ رہی تھی اور صرف عمران بھائی کے متعلق۔ نامعلوم خوف زائل ہو رہے تھے۔ وہ آزادی سے سانس لینے کے قابل ہو گئی تھی۔ اسے بھی تو محبت کی آرزو تھی۔ چاہے جانے کی تمنا تھی۔ جذبات کی مندھی آنکھیں کھلنے لگی تھیں۔ وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ کتنی انوکھی آوازیں سن رہی تھی۔ وہ کتنی انجانی باتیں محسوس کر رہی تھی۔

کمرے میں آئی تو ڈاکٹر فیروزہ نے خرم بھائی کا پیغام دیا کہ وہ جلد گھر پہنچے۔ تمت سہم سی گئی جیسے اماں بی اس کے سامنے کھڑی ہوں۔

''کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ میں نے ان سے پوچھ لیا تھا۔'' فیروزہ نے اسے تسلی دی۔ ''اور ہاں ڈاکٹر آفریدی سے چھٹی کی بات ابھی کر لو۔ وہ تو پہلے ہی ڈاکٹر فرحان کو چھٹیاں دے دے کر تنگ آ گئے ہیں۔'' ڈاکٹر فیروزہ نے اطلاع دی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' اس نے خواب کے سے عالم میں کہا اور باہر نکل گئی۔

گھر جا کر تو اس نے نقشہ ہی بدلا دیکھا تھا۔ سب اسے کتنی چاہت سے ملے

تھے۔ جب اماں بی نے بھی اسے گلے سے لگایا تو وہ پشیمان سی ہو گئی تھی۔ ممتا کا یہ انوکھا ذائقہ اس کے روئیں روئیں میں گھل گیا تھا۔ یہ پل بھر کا قرب برسوں کے فاصلے مٹا گیا تھا۔ وہ بار بار ان کا چہرہ دیکھتی جس پر ہمیشہ اس کیلئے اجنبیت رہی تھی لیکن آج اپنائیت کے رنگوں سے کھلا کھلا سا تھا۔

معصوم سی تمت کتنی مسرور ہو گئی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ گھر بھر میں تتلی کی طرح اڑتی پھرے۔ کچھ نہ کھائے' کچھ نہ پئے' کچھ نہ کرے۔ اماں بی کے ہاتھ سے کھانا کھائے' ان سے کہے کہ اس کا منہ دھو دیں۔ اس کے بال سنواریں' ان سے پوچھے کہ وہ کون سے کپڑے پہنے۔ بس اک اک لمحہ ان سے پوچھ کر بتائے۔ تحفظ کے اک انوکھے احساس میں سرشار وہ دیوانی سی ہو رہی تھی۔ اماں بی کو اس نے اتنا ترسنے کے بعد پایا تھا وہ جی بھر کر خوشی منانا چاہتی تھی۔ اک اک کو یہ خبر پہنچانا چاہتی تھی۔ محسن بھائی اور جواد بھائی اسے کتنا یاد آ رہے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ چپکے سے انہیں بتا کر پھر اماں بی کی ممتا بھری آغوش میں آ چھپے۔

پچھلے کمرے میں اس نے جب خاموش خاموش سی انجم آپا کو دیکھا تو وہ ان کا اترا اترا سا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ پہلے تو ایسی نہیں تھیں۔ شادی کے بعد تو وہ ہر وقت بنی سنوری رہتی تھیں۔ شوخ میک اپ' بھڑکیلے ملبوسات' وہ تو اپنے گھر میں بھی کبھی تیار ہوئے بغیر نہیں آئی تھیں تو آج انہیں یہ کیا ہوا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ ان سے پوچھ کر دیکھے لیکن معلوم کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔

اماں بی سے سن کر تو وہ سکتے میں رہ گئی کہ جواد بھائی نے انہیں طلاق دے دی ہے۔ ''ہائے اللہ کیوں۔'' اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ اسے ترقی کا زینہ بنانا چاہتے تھے لیکن وہ مشرقی ماحول کی پروردہ ان کی بے لگام آزادی کا ساتھ نہیں دے سکی تھی۔ یہی ان کا جرم تھا جس کی سزا انہیں طلاق نامے کی صورت میں ملی تھی۔ جواد بھائی کو ایسی بیوی چاہیے تھی جو اپنی خوبصورتی کا استعمال جانتی ہو جسے ادائیں بیچنے کا سلیقہ ہو جو اپنے شوہر کیلئے باس سے نیا عہدہ حاصل کر سکے۔

کتنے ذلیل ہیں یہ مرد۔ وفا کی وقعت ان کی نگاہوں میں کچھ بھی نہیں' عورت کتنی مجبور ہے۔ ایک مرد نے کتنی آنکھوں کو رلایا ہے۔ اماں بی کی آنکھوں میں آنسو

دیکھ کر اس کا دل کٹ کر رہ گیا تھا اور جب اسے معلوم ہوا تھا کہ ابا میاں اسی صدمے سے ہسپتال میں پڑے ہیں تو وہ غم سے دیوانی سی ہو گئی۔ اماں بی نے بڑی دانش مندی سے اسے معاملے کی اونچ نیچ سمجھائی تھی کہ اب گھر کی عزت اور ابا میاں کی زندگی اور انجم کو تباہی سے بچانے کا ایک ہی راستہ تھا کہ انجم کو عمران سے بیاہ دیا جائے۔ وہ انجم کو پہلے سے پسند کرتا ہے۔

وہ ساکت سی ہو کر ان کی باتیں سنتی رہی لیکن روح میں جو اک مدھر سا نغمہ گونجتا تھا وہ چیخوں میں ڈھل گیا۔ اس نے تو ابھی جینا بھی نہیں سیکھا تھا کہ اس کی زندگی اس سے چھینی جا رہی تھی۔ اماں بیگم کے لہجے میں التجا نہیں تھی' کوئی ہمدردی نہیں تھی' ذرا سا لگاؤ بھی نہیں تھا' وہ تحکم تھا' وہ سختی اور پختگی تھی جس کے بغیر ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کے حکم سے سرتابی کی مجال کسے تھی۔ وہ بات کہاں کرتی تھیں۔ وہ فیصلہ سناتی تھی۔ وہ پہلا لگاؤ وہ پہلی محبت اک ڈھونگ تھا۔ اس کو راہ پر لانے کا اک حربہ۔ اماں بی نے صاف کہہ دیا تھا کہ تم عمران سے خود ہی بات کرنا' ہو سکتا ہے دوسری طرح سے وہ بگڑ جائے۔ یہ بھی اچھی بات نہیں کہ بہن کے ہوتے ہوئے تمہاری اس کے منگیتر سے شادی کریں اور ابھی تو نازی بھی بیٹھی ہوئی ہے۔

سب ہی کہتے تھے کہ عمران بھائی انجم کو چاہتے ہیں وہ شروع سے ہی اس کیلئے پیام دیتے رہے ہیں لیکن یہ سب بھول گئے تھے کہ وہ کسی کو انجم سے بھی زیادہ چاہتے ہیں۔ وہ تو اب کسی اور کیلئے پیام دے چکے ہیں' کسی اور کی خواستگاری کر رہے ہیں۔

اور خود وہ بھی تو بھول گئی تھی کہ عمران بھائی نے اس سے کیا کہا تھا۔ اسے یاد نہیں رہا تھا کہ محسن بھائی نے اسے عمران بھائی کی باتوں پر یقین کر لینے کو کہا تھا۔ اس نے خیال بھی نہیں کیا کہ اتنے دنوں میں وہ عمران بھائی کے بارے میں یہی سوچتی رہی تھی۔ سب کچھ فراموش کر کے جب اس نے عمران بھائی سے کہا تھا کہ وہ انجم آپا کیلئے ہاں کر دیں تو وہ حیرت سے اس کا منہ تکتے رہ گئے تھے۔ اس نے ایک بار پھر کہا تو وہ بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتے گئے۔ اس نے پھر انہیں مجبور کیا تو انہوں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سختی سے پوچھا۔

''تمت! یہ تم دل سے کہہ رہی ہو یا اس کیلئے تمہیں مجبور کیا گیا ہے۔''

وہ سراسیمہ ہو کر ہونٹ کاٹنے لگی۔ الفاظ اس کے ہونٹوں سے نہیں نکلتے تھے۔ وہ اس کے قریب چلے آئے اور اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے درشتی سے بولے۔

''تمت! میری بات کا جواب دو۔''

تمت ان کی طرف دیکھ بھی نہیں پاتی تھی۔ کچھ کہنے کو اس کے ہونٹ آمادہ ہی نہیں ہوتے تھے۔ وہ چوری بنی کھڑی تھی۔ وہ اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولے۔

''تم میری دیوی ہو' میں تمہیں پیار کرتا ہوں لیکن آج جی چاہتا ہے' تمہیں توڑ دوں۔ تم اس قدر جلد کیوں مجبور ہو جاتی ہو' کوئی اور کیوں نہیں دل پر جبر کرتا' سبھی تمہارا دل کیوں توڑتے ہیں۔''

تمت کی ویران آنکھوں میں آنسوؤں سے زیادہ دکھ گھلے تھے۔ وہ کپڑے کی بے جان گڑیا کی طرح اس کے ہاتھوں میں جھول رہی تھی۔ عمران نے ایک بار میں ہی اسے بازوؤں میں لے لیا اور سرکشی سے بولے۔

''بس میں کچھ نہیں جانتا مجھے کچھ نہیں معلوم۔ مجھے شادی کرنی ہے تو صرف تم سے' سمجھیں۔''

تمت کو اس کے بازوؤں میں ایک نئی دنیا آباد نظر آتی تھی۔ اک انجانا جہان تھا جس سے وہ اب تک ناآشنا تھی۔ اسے معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی جان لبوں پر آ گئی ہے۔ اب وہ اک سانس بھی نہیں لے سکتی۔ عمران کی گرفت مضبوط تھی اور وہ کمزور ہوئی جاتی تھی۔ ان بازوؤں سے باہر وہ کہاں پناہ تلاش کرے گی۔ یہ منزل چھوڑ دے تو پھر بھٹکنے سے حاصل۔

''تمت! مجھے کسی کی پروا نہیں صرف تمہاری ضرورت ہے' مجھے تمہاری۔''

عمران کا جنون بڑھتا جاتا تھا۔

''عمران بھائی!'' اس نے اک ہچکی سی لی۔ ''انجم آپا کو آپ کی ضرورت ہے۔''

''بکو مت!!!'' انہوں نے دونوں ہاتھوں میں اس کے بال پکڑ لئے۔ ''مجھے

تم سے زیادہ معلوم ہے کہ میری ضرورت کس کو ہے۔ جب میں اندھا تھا تو اس وقت کسی کو میری ضرورت کیوں نہیں پڑی۔'' دانت پیس کر انہوں نے غصے میں اس کے بال جھکول دیئے۔

تمت نے بال چھڑانے کو ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ اذیت سے اس کی آنکھوں میں خود بخود آنسو آ گئے تھے۔ انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک کر اتنے زور سے اس کے بال کھینچے کہ اس کی گردن پیچھے جھک گئی۔ شدت کرب سے اس کا سانولا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''جی چاہتا ہے تمہارا گلا دبا دوں' زبان گدی سے کھینچ لوں۔'' اذیت وخوف سے اس کے خشک ہونٹ لرز رہے تھے۔ اس کی زبان جیسے گنگ ہو گئی تھی۔ وہ بے ہوش ہونے کو تھی۔ وہ خود کو ان کی گرفت سے چھڑا بھی نہیں پاتی تھی۔ وہ حالات کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہوئی جاتی تھی۔

''میری بات سن لو۔'' عمران نے اس کے بالوں کو جھٹکے دیئے۔

''میں انجم وجم کسی کو نہیں جانتا۔ سنا تم نے مجھے صرف تمہاری ضرورت ہے۔ تمہاری اور بس۔''

''عمران بھائی میرے بال چھوڑیں نا۔'' وہ درد سے کسمسائی۔

''عمران یہ کیا بدتمیزی ہے۔'' اصغری خالہ کی آواز پر عمران بھائی نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دہائی دیتی ہوئی بولیں۔

''غضب خدا کا' چھوڑ لڑکی کے بال تجھے شرم نہیں آتی۔'' عمران نے غصے سے سرخ چہرے کے ساتھ ان کی طرف دیکھا اور اسے دھکا دے کر ان کی طرف بڑھا۔

''امی! اس کمینی تمت کی بچی کو دیکھا آپ نے۔ مجھے کہتی ہے کہ انجم سے شادی کر لوں۔'' اصغری خالہ نے اسے سنبھال لیا اور بار بار اسے چومنے اور اس کے بال سنوارنے لگیں۔

☆.....☆.....☆

تمت کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ وہ کہاں ہے۔ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

''اگر اب اس نے کچھ کہا تو میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔'' وہ واقعی دیوانے ہو رہے تھے۔

''بیٹا! ہم اسے مجبور تو نہیں کر سکتے۔'' ان کے انداز میں کچھ کھو دینے کا ملال جھلکتا تھا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا۔'' وہ ان کے قریب چلا گیا۔ تمت ڈر کر اور بھی دبک گئی۔ انہوں نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''تم نے اس کا دل دیکھا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ کسی اور کو پسند کرتی ہو۔''

''جی!!!'' وہ بھونچکے سے رہ گئے اور تمت کی گردن جھول گئی وہ بیہوش ہو گئی تھی۔

عمران بھائی سے پھر وہ نہیں ملی لیکن نہ جانے کس طرح عمران بھائی نے انجم آپا کیلئے رضامندی دے ڈالی تھی۔ اسے تو اعتبار نہ آتا تھا۔ اس کے اندر جیسے کچھ ٹوٹ سا گیا تھا۔ در و دیوار کتنے بیگانے سے لگتے تھے۔ وہ ہر پل خود کو عمران بھائی کے بازوؤں میں محسوس کرتی تھی۔ اس کے بالوں میں درد کی ٹیسیں اٹھتی تھیں۔ عمران بھائی کا قہر آلود چہرہ اسے خود پر جھکا نظر آتا تھا۔

ابا میاں ہسپتال سے صحت یاب ہو کر گھر آ گئے تھے۔ تمت کی تیمارداری نے ان کی صحت پر خوشگوار اثر ڈالا تھا اور انجم کے رشتے کی بات نے انہیں بالکل ہی تندرست کر دیا تھا۔ اماں بی چھوٹی موٹی تیاریوں میں مگن تھیں۔ نازی گنگناتی پھرتی تھی۔ انجم کے رخساروں پر شفق سی پھولنے لگی تھی۔ سب اس سے بیگانہ ہو گئے تھے۔

اس کی موجودگی کو سب نظر انداز کیے دیتے تھے۔ سب اس کے وجود سے بے خبر تھے۔ کسی کو احساس نہیں تھا کہ اس نے کتنی بڑی قربانی دے ڈالی ہے۔

کسی کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی طرف دیکھنے کی بھی کسی کو فرصت نہیں تھی۔ اماں بی کتنے فخر سے کہتی تھیں کہ انجم اور عمران کی جوڑی بہت سجے گی۔ انجم کی نگاہوں کی ایک فاتحانہ چمک اسے اپنا تمسخر اڑاتی محسوس ہوتی تھی۔ شبو آپا نے بے تکلفی سے یہاں تک کہہ دیا تھا "عمران نے نہ جانے کس بیوقوفی میں تمت کیلئے پیغام دے دیا تھا۔ اچھا ہے بے چارے کو جلدی عقل آ گئی۔ اصغری خالہ بھی اسے نظر انداز کر دیتی تھیں۔" سب کتنے بدل گئے تھے۔ گھر کی فضا ویسی ہی اجنبی سی ہو گئی تھی جس میں اس کا دم گھٹ گھٹ جاتا تھا۔

اس نے اپنا سامان باندھا اور چل کھڑی ہوئی۔ اماں بی نے جاتے ہوئے اسے کہہ دیا تھا کہ انجم کی شادی پر چھٹی نہ ہی ملے چلو رہنے دینا ہم نے کون سا لمبا چوڑا کام کرنا ہے۔ اس کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح اس کے سر پر اوپرا سا ہاتھ پھیرا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئیں اور تمت کی بھیگی آنکھوں میں ممتا کے خواب ٹوٹ کر رہ گئے۔

سر جھکائے وہ گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ گیٹ سے یوں لٹی لٹی سی نکل رہی تھی جیسے اپنا آپ پیچھے چھوڑ چلی ہو۔ کسی کو اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ جا رہی تھی لیکن کوئی اسے رخصت کرنے نہیں آیا تھا۔ کسی نے اسے خدا حافظ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں۔ کسی کو اسے گلے لگانے کا خیال نہیں آیا۔ وہ ایک فالتو چیز تھی جس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔

وہ مغموم سی گیٹ سے نکل رہی تھی کہ اسے رک جانا پڑا۔ عمران بھائی عین اس کے مقابل آ کر رک گئے تھے۔ تمت نے ایک بار نگاہیں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور سر جھکا دیا۔ وہ بڑی معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"تمت!!!" ان کی سنجیدہ آواز ابھری۔ "میں ہمیشہ تمہاری عزت کرتا رہوں گا۔" تمت نے چہرہ اٹھایا۔ آنسو اس کے رخسار بھگو رہے تھے۔ عمران بھائی پریشان ہو گئے۔

"تمو! کیوں رو رہی ہو؟"

"نہیں تو، نہیں۔" اس نے گھبرا کر آنسو پونچھ ڈالے۔

"تمت خدا کرے تم فرحان کے ساتھ ہمیشہ خوش رہو۔" انہوں نے ہولے سے کہا اور آگے بڑھ گئے۔ تمت لڑکھڑا گئی۔ اسے اردگرد کی چیزیں گھومتی محسوس ہوئیں۔ بڑی دقت سے قدم اٹھاتی وہ گیٹ سے باہر نکل گئی۔ "میری قربانی بھی رسوا ہو گئی۔" اس نے بے بسی سے سوچا۔

ڈاکٹر تمت صمدانی اس بار تو لمبی چھٹیاں منائیں آپ نے۔ ڈاکٹر فرحان نے اسے دیکھ کر خوش دلی سے کہا۔ وہ مردہ سی ہنسی ہنس کر خاموش ہو گئی۔

"بہت کمزور ہو رہی ہیں آپ۔"

"نہیں تو، یونہی آپ کو محسوس ہوتا ہے۔"

"اب ڈاکٹر ہو کر ڈاکٹر سے جھوٹ مت بولیے۔ بیمار تو نہیں رہیں آپ۔"

"نہیں، بالکل بھی نہیں۔" اسے جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔

"گھر میں تو خیریت ہے۔" لہجہ اپنایت بھرا تھا۔

"میرے والد کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہاں بھی زیادہ تر ہسپتال میں ہی رہی۔"

"اوہو اب کیسے ہیں، گھر آ گئے ہیں، بالکل ٹھیک ہیں؟"

"چلیے پھر آپ کو معاف کیا ورنہ میں نے کہا کہ مجھے ہسپتال بلوا کر خود چھٹیاں منانے بیٹھ گئیں۔ آپ نے چلتے وقت بتایا بھی نہیں۔" ان کا انداز شاکی تھا۔ تمت نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"مجھے بہت جلد جانا پڑ گیا، کسی سے کہہ نہیں سکی۔"

"آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے ایک کزن آئے تھے۔ آپ کے بارے میں پوچھتے رہے۔"

"کون؟؟؟"

"عمران نام تھا شاید ان کا۔ مجھ سے بھی ملے تھے لیکن میرا ایمرجنسی ڈے تھا۔ زیادہ بات نہ ہو سکی۔"

''بس آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ چھٹی پر ہیں۔ پھر مزاحاً پوچھ رہے تھے کہ وہ کیسی ہیں اور میں نے کیا کہا۔ یہ تو آپ کو بتاؤں گا نہیں۔انہوں نے چھیڑنے کے انداز میں کہا لیکن وہ گم سم کچھ سوچ رہی تھی۔ کیوں کوئی خاص بات ہے۔'' وہ مشکوک سے ہو گئے۔

''جی نہیں، کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔'' اس نے عجلت میں تردید کی۔ ڈاکٹر فرحان نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر اندازہ لگانا چاہا لیکن وہ مڑ کر اپنی چیزیں اٹھاتی باہر نکل گئی۔

وہ سوچتے ہی رہ گئے کہ پہلے تو وہ سہمی رہتی تھی لیکن اب کچھ بیمار بھی نظر آتی ہے جیسے کوئی تیکھا دکھ اندر ہی اندر کر کے لگا رہا ہو اور درد کی ٹیس چہرے پر ظاہر نہ کرنے کی کوشش میں رواں رواں ایک ٹیس بن گیا ہو۔ وہ کچھ پریشان نظر آتی ہیں لیکن کچھ کہتی نہیں۔

تمت حیرت سے سوچتی رہ گئی کہ ڈاکٹر فرحان کو تو خبر بھی نہیں کہ ان کے نام پر مجھے دو بار لوٹا گیا ہے۔ وہ جن کا تعلق اس سے اک ساتھی، اک رفیق کار سے زیادہ نہ تھا کس طرح ان کے نام سے اس کے متعلق بدگمانیاں پیدا کی گئی تھیں۔ وہ کتنی مجبور تھی لیکن اس کے دل میں کوئی نہیں جھانکتا تھا۔ اسے سب نے اتنا مجبور بنا دیا تھا کہ وہ خود اپنا سب کچھ چھین لینے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ زندگی کے کینوس پر جو مدھم سے رنگوں کا اک نقش سا ابھرا تھا۔ اس نے خود ہی اس پر سیاہ رنگ پھیر دیا تھا۔ اس نے اپنی ہی دنیا کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ اس کے اپنے پاس کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔

اسے اس کا دکھ نہیں تھا کہ عمران بھائی اور جواد اس سے چھین لئے گئے تھے۔ اسے یہی غم کھائے جاتا تھا کہ ڈاکٹر فرحان کا نام لے کر اسے بدنام کیا گیا تھا لیکن وہ ان زیادتیوں کی داستان کسے سنائے۔ کوئی اپنا نہیں تھا، کوئی ہمدرد نہیں تھا۔ اپنے بھی بیگانے تھے۔

اس نے خود کو مصروفیات میں گم کر دینا چاہا۔ مریضوں میں کھو جانا چاہا۔ دوسروں کے زخموں پر مرہم رکھتے رکھتے اس نے اپنے گھاؤ بھول جانا چاہے لیکن اک خلش دل کو بے قرار کیے دیتی تھی، کسی پل قرار نہیں لینے دیتی تھی۔

مسلسل کام اور ذہنی پریشانی رنگ لائی۔ بخار نے اسے پھونک کر رکھ دیا۔ دو دن تو اسے ہوش نہیں رہا۔ ٹمپریچر کم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ وہ بیہوشی میں ناقابل فہم باتیں کرتی۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے ڈاکٹر فیروزہ اسے ہسپتال کے ایک کمرے میں لے آئی تھیں۔ سسٹر زرینہ تو ہر وقت اس کے پاس ہوتیں۔ اس کی ساتھی ڈاکٹرز بھی آ آ کر دیکھ جاتیں۔

ڈاکٹر فرحان الگ پریشان تھے۔ ایک تو اس کی بیماری نے انہیں پریشان کر دیا تھا دوسرے کئی بار انہوں نے بیہوشی میں اس کے لبوں پر اپنا نام سنا تھا جس طرح وہ مٹھیاں بھینچتی اور سر پٹکتی تھی معلوم ہوتا تھا کوئی دکھ اس کے اندر ہلچل مچائے دیتا ہے۔ سسٹر زرینہ کے ادھر ادھر ہوتے ہی انہوں نے کئی بار اس پہ جھک کر اس کا نام پکارا تھا۔ اس کے بال سنوار دیئے تھے۔ اس کے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں بدلتے رہتے تھے لیکن جب وہ سرخ سرخ آنکھیں کھولتیں تو انہیں پہچان بھی نہیں پاتی۔ نہ جانے اس کے دل میں کیا تھا، وہ بار بار کیوں ان کا نام لیتی تھی۔ وہ ان ہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں ہو کر رہ گئے تھے۔

اس کے خلوص نے، اس کے بلند خیالات نے اس کی سچی ہمدردی نے اس کے ساتھ گہرا لگاؤ پیدا کر دیا تھا۔ وہ اسے نہیں دیکھتے تھے، اس کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ اس سے بات نہیں کر لیتے تھے تو سب کچھ ادھورا معلوم ہوتا تھا۔ انہوں نے محبت کی تھی، کئی دلکش لڑکیوں سے لگاؤ رہا تھا لیکن کبھی ایسی شدت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس کی ہر ادا اس کی ہر بات اس کا رکا رکا سا دھیما انداز، اس کا سہما سہما چہرہ، اس کی ملاحت لئے ہوئے سانولی رنگت، انہیں سب کچھ کتنا اپنا معلوم ہوتا تھا۔ نہ جانے اسے کیا دکھ ہے، کہیں وہ مجھ سے محبت تو نہیں کرنے لگی۔ وہ سوچ سوچ کر جھجک جاتے لیکن اس کی سادگی، اس کا پرخلوص انداز، اس کی بے ضرر باتیں کسی بات سے بھی تو کوئی خوش فہمی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ ان کا جی چاہتا کہ دن بھر اس کے سرہانے بیٹھے رہیں۔ اس کی بند آنکھوں کی مندھی پلکوں کو ہولے ہولے چھیڑتے رہیں۔ وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دے اور سہمی سہمی نگاہوں سے ان کی جانب دیکھے تو وہ اس پر جھک کر اک میٹھی سی سرگوشی کر دیں۔ ''تمت تم نے مجھے پکارا تھا لو دیکھ لو میں آ گیا ہوں لیکن وہ تو آنکھیں

نہیں کھولتی تھی۔ کبھی کبھی ان کا نام لیتی تھی۔ پھر نہ جانے کیا کہتی جو انہیں کوشش کے باوجود سمجھ نہیں آتا تھا۔

تیسرے دن اس کے وہی کزن آئے تھے جن سے ایک بار وہ بھرے ہسپتال میں بغل گیر ہوگئی تھی۔ اس کی بیماری کا سن کر وہ کس قدر پریشان ہوئے تھے۔ اس کے کمرے کا پوچھ کر وہ بھاگم بھاگ وہاں پہنچے۔ ڈاکٹر فرحان بھی ان کے پیچھے لپکے۔ وہ تیزی سے دروازہ کھول کر اس کے بستر پر جھک گئے۔

''تمو' چندا! تمہیں کیا ہوا؟'' نہوں نے اس کے بکھرے بال سمیٹے اور بے قرار سے باربار اس کی پیشانی اور رخساروں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ ڈاکٹر فرحان دروازے کے قریب کھڑے بڑے غور سے ان کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ تمت جو صبح سے ہوش میں آنے لگی تھی انہیں بھی پہچانتی ہے کہ نہیں۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ تمت نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔ ایک لحظہ غور سے انہیں خود پر جھکے دیکھا۔

''تمو! کیا بات ہے؟'' انہوں نے بڑے پیار سے پوچھا۔

ڈاکٹر فرحان کو یقین کرنا محال ہوگیا جب تمت نے اپنے کمزور بازو ان کے گلے میں حائل کر دیئے اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ اس کے بازوؤں کی گرفت سے وہ اور بھی اس پر جھک گئے۔ انہوں نے بے ساختہ اس کی پیشانی چوم لی۔ آہستگی سے اس کے بازو علیحدہ کیے اور اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اسے تسلیاں دینے لگے۔ وہ کتنی ہی دیر روتی رہی۔ وہ اسے دلاسا دیتے رہے۔ پھر اچانک ان سے مخاطب ہوئی۔

''محسن بھائی! خدا کی قسم میری ڈاکٹر فرحان کے ساتھ کوئی بات نہیں۔''

ڈاکٹر فرحان اپنا نام سن کر چونکے اور پھر اوٹ میں ہوگئے۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''میں اتنی بری ہوں' اتنی کالی ہوں بھلا ڈاکٹر فرحان مجھ سے کیوں شادی کرنے لگے۔''

ڈاکٹر فرحان نے دکھ سے سوچا کہ کون کہتا ہے کہ تم بری ہو' تمہاری سانولی رنگت میں تو دنیا بھر کی ملاحتیں سمٹ آئی ہیں' تمہارے جیسا خوبصورت دل ڈاکٹر فرحان کو کہاں ملے گا۔

وہ رو رہی تھی۔ ''محسن بھائی! خدا کی قسم میرا ان کے ساتھ کوئی افیئر نہیں' سچ سچ بالکل نہیں۔'' اس کی حالت قابل رحم تھی۔ وہ بے قراری میں اپنی انگلیاں چبا رہی تھی۔ انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور پوری سچائی سے بولے۔

''تمو! مجھے تمہاری باتوں پر یقین ہے۔ مجھے تو معلوم ہے کہ تم ایسی لڑکی نہیں ہو' تم تو بالکل بھی ایسی لڑکی نہیں ہو۔'' انہوں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

''تو پھر وہ سب یہ کیوں کہتے ہیں۔''

''کون کہتے ہیں؟''

''سب کہتے ہیں۔ سب ہی کہتے ہیں۔ جواد بھائی بھی کہتے تھے' اب عمران بھائی بھی کہتے ہیں۔ محسن بھائی میں انہیں کیسے بتاؤں کہ یہ بات نہیں۔ جواد بھائی کی امی نے کہا تھا کہ انہیں انگوٹھا چوسنے والی دلہن پسند نہیں اور عمران بھائی کو تو کہنے کیلئے مجھے اماں بی نے کہا تھا۔ ابامیاں کو بھی تو ہارٹ اٹیک ہوگیا تھا۔''

محسن بھائی بڑے غور سے اس کی الجھی ہوئی باتیں سن رہے تھے اور ڈاکٹر فرحان کے پلے تو خاک بھی نہیں پڑ رہا تھا لیکن وہ خود کو مجرم سمجھنے لگے تھے کہ ان کا نام اس کی تباہی کیلئے استعمال ہوتا رہا تھا۔

''کیا کہا تھا تم سے اماں بی نے۔'' محسن بھائی سب کچھ معلوم کرنا چاہتے تھے۔

''انہوں نے کہا تھا کہ میں عمران بھائی سے کہوں کہ وہ انجم آپا سے شادی کر لیں۔''

☆......☆......☆

''پھر تم نے کیا کہا؟'' انہوں نے عجلت میں پوچھا۔

''جی کہا تھا۔'' وہ سہمی سہمی سی بولی۔

''پھر......؟'' وہ اس سے تمام بات اگلوانا چاہتے تھے۔

''پھر...... پھر انہوں نے مجھے ڈانٹا' بہت ناراض ہوئے' میرے بال کھینچے۔ کہتے تھے میرا گلا گھونٹ دیں گے۔'' وہ ہانپ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے

حواس میں نہ ہو۔

"کیوں؟؟؟" محسن بھائی بھونچکے سے رہ گئے اور بار بار پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگے۔ ڈاکٹر فرحان کو اس کی دگرگوں حالت پر رحم آنے لگا۔

"محسن بھائی! سب مجھے برا سمجھتے ہیں' سب ہی۔" وہ پھر ایک بار رو پڑی۔

"لیکن عمران تم سے کیوں ناراض ہوا۔" محسن بھائی پوری بات سننا چاہتے تھے اس لئے اس کی بات نظرانداز کر کے انہوں نے عجلت میں پوچھا۔ تمت نے سادگی سے کہا۔

"وہ مجھ سے شادی جو کرنا چاہتے تھے۔"

"اچھا؟" محسن بھائی کیلئے شاید یہ غیر متوقع تھا۔

"تمہیں بھی وہ اچھے لگتے تھے؟"

"میں' میں۔ ہاں وہ تو ہیں ہی اچھے' اتنے خوبصورت' سمارٹ۔" اس نے بچوں کے سے بھولپن میں کہا۔

"محسن بھائی! میں بھی انہیں اچھی لگتی تھی۔ آپ نے کہا تھا نا کہ میں ان کی بات مان لوں۔"

"تو پھر تم نے ان سے شادی کیوں نہیں کی؟"

"میں نے؟؟؟ میں بھلا کس طرح شادی کر لیتی۔"

"کیوں؟"

"اماں بی جی کہتی تھیں خاندان کی عزت کا سوال ہے۔ انجم آپا کو طلاق جو مل گئی تھی۔ ابا میاں بیمار ہو گئے تھے تو میں اکیلی بھلا کس طرح کر لیتی ان سے شادی۔"

"تو وہ مان گئے۔"

"بس مان ہی گئے۔ سب نے ان سے کہہ جو دیا تھا کہ میں ڈاکٹر فرحان سے شادی کر رہی ہوں۔ جواد کو بھی انہوں نے یہی کہا تھا۔ عمران بھائی ہسپتال بھی آئے تھے۔ پتہ نہیں سب نے ان سے کیا کہا کہ وہ سچ مان گئے۔ محسن بھائی! میں یہاں سے چلی جاؤں گی' بس میں یہاں سے استعفیٰ دے دوں گی۔ کتنی بری بات ہے اور سب سمجھتے ہیں کہ میرا ڈاکٹر فرحان کے ساتھ افیئر چل رہا ہے۔ قسم سے محسن بھائی وہ

بڑے پریشان تھے' ان کی بہن کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ میں صرف انہیں دیکھنے جاتی تھی۔" اس نے بے بسی سے کہا۔ "محسن بھائی میں کوئی بری لڑکی تو نہیں نا۔"

محسن بھائی دکھی سے ہو رہے تھے اور ڈاکٹر فرحان کا جی چاہتا تھا کہ اس معصوم سی لڑکی کی جھولی خوشیوں سے بھر دے جو ان کے نام سے بدنام ہو رہی تھی جو اپنے خلوص کی قیمت چکاتے چکاتے لٹ گئی تھی۔

محسن بھائی بہت دیر تک اسے سمجھاتے رہے۔ اس کے بال سہلاتے رہے۔ جب تک وہ سو نہیں گئی۔ اس کے دل کا بوجھ شاید ہلکا ہو گیا تھا اسی لئے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ شاید محسن بھائی کو اپنے قریب دیکھ کر اسے ڈھارس سی ہو گئی۔ ان کی توجہ' ان کا پیار' اسے سنبھال رہا تھا۔

ڈاکٹر فرحان کچھ دیر کیلئے اس کے کمرے سے نکل گئے تھے تاکہ محسن بھائی اٹھ نہ جائیں۔ دوبارہ جب کمرے میں آئے تو محسن بھائی اب تک اس کی پٹی سے لگے بیٹھے تھے۔ ان کی طرف دیکھ کر انہوں نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ آہستگی سے چھڑایا اور اٹھنے لگے لیکن تمت نے یکایک ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور سہم کر بولی۔

"محسن بھائی! مجھے چھوڑ کر نہ جائیں۔"

"نہیں تو تمت' میں تمہارے پاس ہوں۔" انہوں نے اس کا ہاتھ پیار سے تھپتھپایا۔

"چلو سو جاؤ' شاباش۔" انہوں نے بچوں کی طرح اسے چمکارا۔ وہ چند لمحے ان کی طرف دیکھتی رہی لیکن معلوم ہوتا تھا نیند میں ہے۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر سو گئی۔

محسن بھائی چپکے سے اٹھ کر ڈاکٹر فرحان کے پاس چلے آئے۔ تنقیدی نظروں سے ان کا جائزہ لیتے ہوئے بظاہر لاپرواہی سے پوچھنے لگے۔

"آپ ہی ڈاکٹر فرحان احمد ہیں؟"

"جی!" ڈاکٹر فرحان یونہی چور سے بن گئے۔

"میرے لائق کوئی خدمت۔" ان کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر وہ یونہی کہہ گئے۔ ندامت کی ایک عجیب کیفیت ان پر طاری تھی۔

"مجھے آپ سے کچھ نہایت ضروری باتیں کرنا ہیں۔ آپ کچھ وقت دے سکیں گے؟"

ڈاکٹر فرحان گڑبڑا سے گئے لیکن تجاہل عارفانہ سے گویا ہوئے۔

"بڑی خوشی سے میں ہر وقت حاضر ہوں۔"

"آپ مجھے کوئی وقت دے سکیں گے۔" انہوں نے نہایت بردباری سے کہا۔

"آپ ابھی ٹھہر سکیں تو کچھ دیر میں میری ڈیوٹی ختم ہونے والی ہے۔ آپ چاہیں تو کچھ دیر میرے کمرے میں انتظار کی زحمت گوارا کیجئے۔"

"جی نہیں شکریہ۔ میں کچھ دیر لان میں ٹہلوں گا۔"

"او کے!" انہوں نے کہا اور محسن بھائی برآمدے کی طرف بڑھ گئے۔

انہوں نے نہ التجا کی تھی نہ حکم دیا تھا۔ بڑی ذمہ داری سے ایک دوستانہ مشورہ دیا تھا۔

"ڈاکٹر فرحان! اگر ہو سکے تو ایک دوست کی طرح تمت کو اپنا لیجئے۔ اس نے اتنی سی عمر میں بہت دکھ جھیلے ہیں۔ اگر آپ اس کا دامن خوشیوں سے بھر سکیں تو اس کا ہاتھ تھام لیجئے لیکن ایک مجبوری سمجھ کر نہیں اس کا حق سمجھ کر اسے پرپوز کیجئے۔"

وہ رات بھر ایک انجانی سرمدی سی لذت میں ڈوبے رہے۔ شب بھر انہیں تمت کے رنگین تصور نے سونے نہ دیا۔ اس کی ایک ایک بات کی یاد نے ان کی نیند چرا لی تھی۔ یہ تصور کتنا دلفریب تھا کہ اگلی صبح وہ اچانک اسے بتائیں گے کہ وہ ان کے دل میں بستی رہی ہے، وہ اسے بنا بتائے چپکے چپکے چاہتے رہے ہیں تو اس کا زرد سانولا چہرہ گلابی ہوتا ہوا کتنا معصوم نظر آئے گا۔ وہ شرما کر آنچل ہونٹوں میں دبا لے گی۔ وہ نگاہیں چراتی ہوئی کتنی پیاری لگے گی۔ انہی دلکش تصورات نے رات کتنی سہانی بنا دی تھی جیسے دلہن کا گھونگھٹ اٹھانے سے پہلے دولہا کے مسکاتے تصورات اس لاج کی ماری دلہن کے تصور سے رنگین ہوں۔

صبح انہوں نے ٹھیک سے ناشتہ بھی نہیں کیا۔ عجلت میں تیار ہو کر ہسپتال روانہ ہو گئے۔ آتے ہی ڈاکٹر آفریدی نے کام میں ایسا الجھایا کہ ساری رنگین سوچیں خبط ہو

کر رہ گئیں۔ سسٹر زرینہ سے بس وہ اتنا ہی پوچھ سکے کہ تمت کا کیا حال ہے؟

فارغ ہوتے ہی وہ تمت کے کمرے کی طرف لپکے۔ اس کے کمرے سے سسٹر لیلیٰ باہر آ رہی تھیں۔ ڈاکٹر فرحان ایک لمحے کو ٹھٹھک گئے۔ سسٹر لیلیٰ کے چہرے پر طنز نہیں آنکھوں میں ایک گہرا دکھ جھانکتا تھا۔ انہوں نے بیزار ہو کر دروازہ کھولا۔ تمت کے پاس ڈاکٹر طلعت بیٹھی تھیں۔ سسٹر زرینہ شاید کوئی انجکشن تیار کر رہی تھیں۔ سارا موڈ ہی غارت ہو گیا۔ جی چاہا لوٹ جائیں لیکن طلعت اور زرینہ دونوں دیکھ چکی تھیں۔ وہ اس کے بیڈ کے پاس آ رکے۔

"ہیلو! ڈاکٹر تمت کیسی ہیں؟" انہوں نے خوش اخلاقی سے پوچھا۔

"جی ٹھیک ہوں۔" لہجے سے خشکی ٹپکتی تھی۔ انہوں نے حسب عادت نبض دیکھنا چاہی لیکن اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"کہا نا آپ سے میں ٹھیک ہوں۔" ڈاکٹر فرحان خفیف سے ہو گئے۔

"بھئی تمت تو اپنا علاج خود کرنا چاہتی ہے۔ اسے ہم پر اعتبار نہیں۔ کیوں تمت یہی بات ہے۔" ڈاکٹر طلعت ہنسی۔ تمت نے کچھ کہے بغیر کروٹ بدل لی۔ سسٹر نے اسے انجکشن لگایا وہ کچھ دیر اپنا بازو ملتی رہی۔

ڈاکٹر فرحان نے کہا۔ "آپ نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا۔ ایسی سنجیدگی سے بیمار ہوئیں آپ۔"

"یہ تو ایسی بیمار ہوئیں جیسے بہت عرصہ اس کی ریہرسل کرتی رہی ہوں۔"

ڈاکٹر طلعت ہنسی لیکن وہ خاموشی سے چھت کو گھورتی رہی۔

"اتنا عرصہ مریضوں کو دیکھتی رہیں، پریکٹس تو ہو ہی گئی ہے۔" سسٹر زرینہ نے سامان سمیٹتے ہوئے کہا اور پھر دروازہ کھولتی ہوئی بولی۔

"بائے بائے ڈاکٹر تمت پھر آؤں گی۔"

"ارے میں یہاں بیٹھی گپیں ہانک رہی ہوں۔ وہاں مریض میری جان کو رو رہے ہوں گے۔" ڈاکٹر طلعت بھی گھڑی دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"فرحان صاحب! آپ کچھ دیر تمت کے پاس بیٹھیں ہم تو چلے۔" وہ تمت کا گال چھوتے ہوئے بولیں۔

وہ چلی گئیں تو تمت پھر بھی نہیں بولی۔ اس کی غیر معمولی بے توجہی اور خشکی انہیں کھٹک رہی تھی۔ وہ ابھی بات چھیڑنے کیلئے مناسب الفاظ کی تلاش میں تھے کہ تمت نے تکیے سے سر اٹھایا اور سپاٹ لہجے میں گویا ہوئی۔

''ڈاکٹر فرحان! میں اب ٹھیک ہوں' آپ بھی جانا چاہیں تو چلے جائیے۔''

ڈاکٹر فرحان کو اس سے ہرگز یہ امید نہیں تھی۔ وہ تذبذب سے کھڑے رہ گئے۔ تمت خاموش رہی لیکن اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی رو دے گی۔ انہوں نے نرمی سے کہا۔

''آپ کو میری موجودگی ایسی ہی ناگوار ہے کیا؟''

''نہیں' مجھے کیوں ناگوار ہوتی لیکن میں مزید اسکینڈلز کا موضوع نہیں بننا چاہتی۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''آپ دوسروں کی باتوں سے اتنا کیوں گھبراتی ہیں؟''

''گھبرانا ہی چاہیے۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں نا خصوصاً لڑکیوں کیلئے۔''

''جب ہمارے دل صاف ہیں تو ہم لوگوں کی پروا کیوں کریں۔'' ڈاکٹر فرحان نے کہا۔

''آپ پروا نہ کریں۔ آپ کو تو فرق نہیں پڑے گا۔'' اس نے کچھ تلخی سے کہا۔ ''جی جہاں' میں واقعی دوسروں کی باتوں سے بے نیاز ہوں۔''

''آپ اور سارے مرد ایسی باتوں سے بے نیاز ہو سکتے ہیں لیکن ہم لڑکیاں ایسا نہیں کر سکتیں۔ آپ کو علم نہیں کہ لڑکیوں کیلئے ایسی باتیں کتنی بری ہوتی ہیں۔''

''ڈاکٹر تمت! میں آپ کی کیفیت سمجھتا ہوں لیکن لوگوں کے جرم کی سزا آپ مجھے تو نہ دیں۔'' انہوں نے ایک دلفریب اپنائیت سے کہا تو تمت ان کی طرف دیکھ کر بھولپن سے بولی۔

''میں نے آپ سے کچھ نہیں کہا۔''

ڈاکٹر فرحان ہنس پڑے۔ ''مجھ سے سارے تعلقات توڑے دیتی ہیں اور ابھی کہتی ہیں میں نے کچھ نہیں کہا۔ آپ جیسی پرخلوص دوست مجھ سے کس جرم میں چھینی جا رہی ہے جو مجھے سیدھے راستے پر لانے والی بھی ہے۔''

تمت حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی جیسے اس کی بات کو تول رہی ہو پھر بے بسی سے بولی۔

''تو پھر میں کیا کروں؟''

ڈاکٹر فرحان کو اس الجھی الجھی سی لڑکی پر بے ساختہ پیار آیا۔ ایک دلکش مسکراہٹ سے بولے۔ ''آپ کچھ مت کریں' بس میری بات مانیں۔''

''کیا؟'' وہ مجسم سوال بن گئی۔

وہ اس کے قریب جھک آئے اور اس کا ہاتھ تھام کر سرگوشی میں بولے۔

''اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں اور میرے ساتھ ساتھ چلیں۔''

''کدھر؟'' وہ سراسیمہ سی ہو گئی۔ ڈاکٹر فرحان کو اس پر کتنا پیار آیا۔ وہ کتنی صاف دل ہے محبت کی انجانی راہوں سے ناآشنا' چاہت کے تقاضوں سے بے خبر۔ وہ ان کی آنکھوں میں امنڈتے پیار کو بھی محسوس نہیں کر پائی تھی۔ ان کے ہاتھ میں دبا اس کا چھوٹا سا کمزور ہاتھ لرز رہا تھا جیسے یکدم خوفزدہ ہو گئی ہو۔ ڈاکٹر فرحان نے ہولے سے اس کا ہاتھ دبایا۔

''جہاں میں لے چلوں۔'' انداز میں شہد کی ملاوٹ تھی۔ تمت سہم کر ٹکر ٹکر ان کی طرف دیکھتی گئی جیسے کچھ سمجھ نہ پائی ہو۔ ڈاکٹر فرحان کو کبھی ایسی بیوقوفی کی حد تک سادہ لوح لڑکی سے واسطہ نہیں رہا تھا۔ خدا جانے وہ کس چیز کی بنی تھی جو نگاہوں کی تپش' لہجے کی محبت اور الفاظ میں چھلکتا پیار۔ کچھ بھی تو اس پر اثرانداز نہیں ہوتا تھا نہ جانے کس نے اسے اتنا سہا دیا تھا کہ وہ دوسروں کے دل میں جھانکتے ہوئے بھی ڈرتی تھی۔ ڈاکٹر فرحان اس کے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئے اور صاف صاف مطلب کی بات پر آ گئے۔ چھپے چھپے سے مبہم سے اشارے اس کے لئے ناقابل فہم تھے۔ انہوں نے ہولے سے کہا۔

''میں آپ کو پرپوز کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی؟'' تمت کی آنکھیں حیرت سے پھٹ سی گئیں۔

''ہوں!'' وہ دلکشی سے مسکرائے۔

وہ اب بھی سہمی ہوئی تھی۔ ''مجھے؟''

''بالکل۔'' انہوں نے تائید کی۔

''میں' میں آپ کو اچھی لگتی ہوں؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''آپ کو کس طرح سے یقین آئے گا۔'' ان کا لہجہ شرارت آمیز تھا۔

''سب کیا کہیں گے۔'' وہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔ ''میں اتنی بری ہوں۔

''کیوں آپ میں کیا برائی ہے؟''

''میں بدصورت بھی تو اتنی ہوں اور میں...... میں۔'' اس نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا۔ ''انگوٹھا چوستی ہوں۔''

''تمت!'' انہوں نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔ ''آپ کو علم نہیں کہ آپ کے پاس کتنا خوبصورت دل ہے۔ آپ کا خلوص' آپ کے عظیم خیالات اور مجھے کیا چاہیے۔ آپ نے مجھے سیدھا راستہ دکھایا ہے اور اب ساتھ چھوڑتی ہیں۔''

تمت مبہوت سی ہو گئی تھی۔ وہ عجیب سے ذہنی خلجان میں مبتلا تھی۔ جواد نے بھی کہا تھا' عمران بھائی نے بھی اور اب ڈاکٹر فرحان بھی یہی کہتے ہیں۔ اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آتا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی جھلک آئی تھی۔

ڈاکٹر فرحان کو اس پر رحم آ گیا نہ جانے کن دکھوں نے اسے دہلایا تھا۔ وہ کسی پر اعتماد نہیں کرتی تھی۔ انہوں نے پھر اس کا ہاتھ سہلایا اور ایک ایک لفظ تول کر بولے۔

''تمت! میری بات پر یقین کیجئے۔ میں پورے خلوص سے آپ کو اپنانا چاہتا ہوں۔ آپ جیسی بھی ہیں میں نے آپ سے وہ پیار نہیں کیا جو صورت کو دیکھ کر ایک نگاہ میں ہو جاتا ہے لیکن پائیدار نہیں ہوتا۔ میں نے آپ کو پرکھا ہے۔ آپ کی شخصیت میں وہ سب کچھ پایا ہے جو ایک آئیڈیل میں ہوتا ہے۔ آپ مجھے مایوس نہ کیجئے۔''

تمت کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ بے ہوشی کے عالم میں بولی۔

''مجھے نہیں پتہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔''

ڈاکٹر فرحان نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا وہ بیہوش ہو رہی تھی۔ انہوں نے محبت سے تکیے پر اس کا سر سیدھا کیا اور اس کے رخساروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے۔ ''تمت' تمت!!'' پکارا تو اس نے ایک لمحے کو آنکھیں کھول کر ان کی طرف اجنبی نگاہوں سے دیکھا اور بے سدھ ہو گئی۔

ڈاکٹر فرحان نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا اور کمرے میں آتی ہوئی سسٹر لیلیٰ سے عجلت میں بولے۔ ''ڈاکٹر تمت بیہوش ہو گئی ہیں۔''

''وہ بے حد کمزور ہیں۔ ابھی ان سے زیادہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔'' سسٹر لیلیٰ نے بردباری سے کہا اور اس پر جھک گئیں۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر فرحان اتنے پریشان ہو گئے تھے کہ اسے ہوش میں لانے کی بھی کوئی تدبیر نہیں کر رہے تھے۔ سسٹر لیلیٰ اسے ہوش میں لے آئیں اور مڑ کر ڈاکٹر پر ایک معنی خیز نگاہ ڈالی۔

"لیجئے وہ ہوش میں آ گئیں لیکن اب احتیاط کیجئے گا۔" ڈاکٹر فرحان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور دبے دبے لہجے میں بولے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

اس نے ایک طنزیہ سی ہنسی ہنس کر کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

ابا میاں اچانک نہ جانے کیسے آ گئے تھے۔ اس کی بیماری کا سنا تو بھاگم بھاگ اس کے کمرے میں آئے۔ وہ اب بیٹھنے کے قابل ہو گئی تھی لیکن کمزوری اترتے ہوئے زرد چہرے سے عیاں تھی۔

"بیٹا! یہ کیا حالت بنا لی تم نے۔" انہوں نے پریشان ہو کر کہا۔

"نہیں تو ابا میاں!" وہ پاگلوں کی طرح ہنس پڑی لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس نے ان کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور کتنی ہی دیر ان کی طرف پیاسی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

"بیٹی کتنی کمزور ہو گئی ہے تو۔" وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ "تم نے اطلاع بھی نہیں دی۔"

"میں نے کہا آپ پریشان ہوں گے۔"

"کمال ہے۔ تمہیں بتانا چاہیے تھا۔ اب ہسپتال سے چھٹی لو اور کچھ دن گھر چلو میرے ساتھ۔ تم تو آدھی بھی نہیں رہیں۔"

وہ بڑے اشتیاق سے ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ ان کی طرف یوں دیکھتی تھی جیسے ان کی مورت اپنی آنکھوں میں بھر لینا چاہتی ہو۔

"اب کام میں اپنی صحت تو برباد نہ کرو۔" انہوں نے پیار بھری تشویش سے کہا۔ اسے کتنا اچھا لگ رہا تھا جیسے پھر سے جی اٹھی ہو۔ ابا میاں کی ایک ایک بات امرت کی بوند بن کر اس کی تپتی روح کو سیراب کر رہی تھی اور کوئی نہیں تو ابا میاں تو اس کے اپنے تھے۔ اسے دیکھ کر کتنے پریشان ہو گئے ہیں۔ وہ اسے چاہتے ہیں تبھی تو اس کیلئے پریشان ہیں۔ اس نے طمانیت کے ایک احساس سے سوچا۔

"بس اب میں تمہیں ساتھ لے کر ہی جاؤں گا۔ تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔"

"نہیں تو ابا میاں! اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے چہکتے ہوئے کہا۔

اس کے بیمار اور زرد چہرے پر ہلکا گلابی سا رنگ پھوٹ رہا تھا۔

"آپ آ گئے ہیں نا تو میں بالکل ٹھیک ہو گئی ہوں۔" وہ بار بار ایک ہی فقرہ دہرا رہی تھی جیسے ان کو یقین دلانا چاہتی ہو کہ وہ ان کے آنے سے ہی صحت یاب ہوئی ہے۔

وہ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ وہ مسرت سے سرشار بلامقصد ہنستی رہی، یونہی مسکراتی رہی۔ وہ گھر جس سے اسے کتنی محبت تھی وہاں کے ہر فرد کو وہ چاہتی تھی، پیار کرتی تھی۔ یہ سب اس کیلئے کتنا طرب انگیز تھا۔ وہ اپنی ہی نگاہوں میں بڑی اہم ہو گئی تھی۔

"ابا میاں! آپ ابھی یہاں رہیں گے نا۔" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"اگر کل ہی کام ہو جائے تو اچھا ہے ورنہ کچھ دن رکنا پڑے گا۔" انہوں نے حساب لگاتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔" وہ خوش ہو گئی۔ وہ بڑی رازداری سے بولی۔ "ابا میاں آپ کو ایک بات بتاؤں۔"

"ہاں ہاں ضرور۔" وہ ہنس پڑے۔ کتنی معصوم ہے میری یہ بیٹی بالکل بچوں کی سی عادات کی مالک۔ اس کی ماں اس کے متعلق جو کچھ کہتی ہے کیا وہ صحیح ہے۔ انہوں نے ٹھٹا کر سوچا۔ انہیں خاموش دیکھ کر وہ بھی چپ سی ہوگئی۔ انہوں نے پھر پوچھا تو وہ جھجک کر بولی۔

"ابامیاں! ابامیاں یہاں محسن بھائی بھی رہتے ہیں۔"

"کیا؟" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا تو وہ گھبرا گئی۔ رحم طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھ کر ڈرتے ڈرتے بولی۔

"ابامیاں! آپ ان سے ناراض ہیں۔"

"تمہیں وہ کہاں ملا۔" انہوں نے اس کی بات، ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"یہاں ہسپتال میں آئے تھے نا ایک دن تو میں نے پہچان لیا۔ ابامیاں میں نے انہیں ایک منٹ میں پہچان لیا۔" اس نے خوشی سے چٹکی بجا کر کہا۔

"تو بیٹی مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"

"میں نے کہا آپ ناراض نہ ہوں۔"

"میں ناراض کیوں ہوتا تم نے تو میرے ضمیر سے ایک بوجھ ہٹا دیا ہے۔ میں سوچتا تھا نہ جانے وہ کہاں بھٹکتا پھر رہا ہے۔" وہ بڑے اشتیاق سے محسن بھائی کے بارے میں بات کرتے رہے۔ پھر ان کا پتہ پوچھ کر اٹھ گئے۔ اتنے برسوں کے بچھڑے بھانجے سے ملنے کیلئے بےقرار ہو رہے تھے۔

تمت نے پوچھا۔ "ابامیاں، اماں بی کو بتا دیں گے؟"

وہ ایک لمحے کو سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے "ابھی نہیں۔ تمہیں پتہ ہی ہے کہ اس کی عادتیں کیسی ہیں۔" انہوں نے بیزاری سے کہا لیکن چہرے پر ایسی خفت جھلکتی تھی جیسے اپنی بےبسی پر خود بھی کڑھ رہے ہوں۔

ابامیاں کی توجہ اور پیار نے اسے بستر سے اٹھا دیا تھا۔ وہ پہلے سے بہت بہتر تھی۔ دوسرے دن وہ ان کا بےقراری سے انتظار کرتی رہی لیکن کام کی زیادتی تھی یا کوئی اور وجہ وہ تمام دن نہیں آئے۔ جب رات زیادہ ہوئی تو وہ مایوس ہوگئی۔ "ابامیاں کو میرا ذرا خیال نہیں۔" وہ مغموم ہوگئی۔ محسن بھائی بھی تو ایسے نہیں تھے۔ وہ تو ایک بار

بھی نہیں آئے تھے۔ اس دن بخار کی غفلت میں جو باتیں ان سے کرتی رہی تھی۔ وہ بالکل بھول گئی تھی۔ اسی لئے تو سوچ سوچ کر اور بھی اداس ہو رہی تھی کہ وہ اتنے دنوں ان سے نہیں ملی تھی تو انہوں نے بھی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ کس حال میں ہے۔

وہ کتنی غیر اہم ہے فالتو چیز کی طرح کہ اسے سب ہی بھول جاتے ہیں نہ جانے کیوں وہ اس دنیا میں چلی آئی تھی ہمیشہ نظرانداز کیے جانے کیلئے۔ محسن بھائی اسے بے طرح یاد آ رہے تھے۔ ان کی ذات میں اس نے توجہ پائی تھی، پیار پایا تھا لیکن وہ بھی اس سے بے پروا ہو گئے تھے۔ دل میں ایک ٹیس سی اٹھتی تھی۔ آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔ اتنے بڑے خاندان کے ہوتے ہوئے وہ ہسپتال میں اکیلی پڑی تھی۔ ابامیاں اس شہر میں تھے لیکن انہیں بھی اس کا خیال نہیں اور محسن بھائی تھے تو انہوں نے اتنے دنوں سے جھانکا تک نہیں تھا۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے دیکھا بھی نہیں۔ صبح سے ہر آہٹ پر چونکتے چونکتے وہ نڈھال سی ہوگئی تھی۔ جی چاہتا تھا چیخ چیخ کر روئے۔ اتنا شور مچائے کہ محسن بھائی، ابامیاں، اماں بی سب کو پتہ چل جائے کہ وہ ہسپتال کے اس کمرے میں اکیلی بیمار پڑی ہے۔

"کاش! میں مر ہی جاؤں۔" اس نے دل کی گہرائیوں سے تمنا کی۔

"ڈاکٹر تمت!" کسی نے پکارا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا ڈاکٹر فرحان کھڑے تھے۔ ان کی صورت دیکھتے ہی اسے یاد آ گیا کہ انہوں نے اس سے کیا کہا تھا اور کچھ حیران سی ہو کر ان کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ معلوم نہیں سچ کیا۔ ڈاکٹر فرحان کو میں بھلا کیوں اچھی لگنے لگی۔ وہ الجھ سی گئی۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" ڈاکٹر فرحان نے اپنائیت سے پوچھا۔

"جی ٹھیک ہوں۔" اس نے کمبل ٹھیک سے اوڑھتے ہوئے کہا۔

"آپ نے کھانا نہیں کھایا۔"

"موڈ نہیں" وہ لاپروائی سے بولی۔

"آپ کو سوپ تو لے لینا چاہیے۔ اس طرح کمزوری بڑھ نہ جائے۔"

وہ خاموش رہی بس یوں پاس کی دیوار پر انگلیوں سے لکیریں کھینچتی رہی۔
ڈاکٹر فرحان نے کہا۔ ''آپ کے کزن ہیں نا محسن صاحب۔''
''جی آئے ہیں۔ کدھر ہیں؟'' اس نے چونک کر بے صبری سے پوچھا۔
''بہت انتظار ہے ان کا آپ کو۔''
''اور نہیں وہ اتنے دن ہو گئے' آئے ہی نہیں۔''
''ایک روز آئے تو تھے۔''
''کب؟ مجھے تو نہیں پتہ۔''
ڈاکٹر فرحان حیران تو ہوئے لیکن پھر بے نیازی سے بولے۔ ''آپ کا بخار تیز تھا نا اس لئے یاد نہیں رہا۔ وہ تو بہت دیر بیٹھے رہے آپ کے پاس۔'' تمت ایک دم خوش ہوگئی۔

''آج کل بھی تقریباً روز ہی فون کرتے رہے ہیں۔ دراصل وہ کسی ٹرپ کے ساتھ شہر سے باہر گئے ہیں اسی لئے تو آپ کو دیکھنے آ نہیں سکے۔ ویسے بہت فکرمند رہتے ہیں۔ میں نے انہیں اطمینان دلا دیا تھا کہ اب آپ ٹھیک ہیں۔''
تمت کا چہرہ مسرت سے دمک رہا تھا۔ وہ بار بار ایسی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھے جاتی تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ محسن بھائی کے بارے میں باتیں کیے جاؤ۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ان کے بارے میں سنتی رہے کہ وہ اس کیلئے کتنے پریشان ہیں۔
''کچھ دنوں میں آ جائیں گے۔'' ڈاکٹر فرحان نے کہا تو اس کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا۔ وہ اس کے قریب چلے آئے۔ تھوڑا سا خم ہو کر سرگوشی میں بولے۔
''تمت! میں نے آپ کیلئے ایک انگوٹھی خریدی ہے۔'' وہ سمٹ سی گئی اور سہمی سہمی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں جکڑ لئے۔ اس کی پیشانی پر اپنے پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔ ڈاکٹر فرحان کو وہ بڑی ہی پیاری لگی۔ سہمی ہوئی' سکڑی سمٹی ہوئی۔ بار بار چور نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتی ہوئی۔
''کیسے پہنا دوں؟'' انہوں نے اس کے قریب جھک کر کہا۔
وہ خوفزدہ سی ہو کر پلنگ کی پٹی سے لگ گئی۔

''نہیں' نہیں۔ میں نہیں۔''
''کیوں......؟'' انہوں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے پلکیں جھپکتی رہی اور بے کلی سے ہونٹ کاٹتی رہی۔ انہوں نے اصرار کیا۔ ''جواب دیجئے نا۔''
''یہ اچھی بات نہیں۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''سب کیا کہیں گے۔''
''یہی کہیں گے نا کہ ان کی منگنی ہوگئی۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''نہیں' نہیں۔'' وہ سہم گئی۔ ''یہ بری بات ہے۔''
''کیوں؟ میں ایسا ہی برا ہوں کیا؟'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''نہیں' میرا مطلب یہ تو نہیں۔''
''تو پھر کیا مطلب ہے؟'' انہوں نے بظاہر ڈپٹ کر کہا لیکن آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ تمت نے رحم طلب نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کیا جواب دے۔ اگر اماں بی کو معلوم ہو جائے تو پھر کیا ہو اور ڈاکٹر فرحان کے گھر والوں نے بھی تو اسے نہیں دیکھا تھا۔ نہ جانے دیکھ کر کیا کہیں۔ بے بسی سے بولی۔
''آپ اپنے گھر والوں سے تو پوچھ لیں۔''
''واہ بھئی ...... شادی گھر والوں کو کرنی ہے یا مجھے۔''
''اچھا؟'' وہ حیران ہوئی۔ ''وہ کچھ نہیں کہیں گے۔''
''بالکل نہیں۔'' انہوں نے دبنگ لہجے میں کہا۔ ''اگر کہیں گے بھی تو پروا کسے ہے۔''
''بس اب تو سارے اندیشے ختم۔'' وہ خوش دلی سے ہنسے۔ ''تو پھر لائیے پہنا دوں۔'' انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
''نہیں' نہیں۔'' اس نے تیزی سے ہاتھ چھڑا لیا۔ ''بس اماں بی سے پوچھے بغیر نہیں پہن سکتی۔'' وہ ہانپ گئی۔
ڈاکٹر فرحان کو اس کی سادگی پر بے تحاشا پیار آیا۔ کتنی سادہ لوح ہے یہ۔ دنیا کے نشیب و فراز سے ناآشنا۔ ریاکاری اور چالاکی سے مبرا' چھوٹی سی معصوم لڑکی۔
''آپ ہر بات اماں بی سے پوچھتی ہیں؟''

''کیوں نہ پوچھا کروں؟''

''نہیں شوق سے پوچھیے لیکن فیصلہ میرے حق میں ہونا چاہیے۔'' وہ ذرا بھی شرمائی نہیں۔ اس کے رخساروں پر کوئی شفق نہیں لہرائی۔ سہمی سہمی سی بیٹھی ہونٹ کاٹتی رہی۔ ڈاکٹر فرحان نے ہولے سے اس کے رخسار کو چھوا اور شب بخیر کہہ کر کمرے سے باہر نکل آئے۔

ابا میاں دو تین دن کے بعد آئے تھے۔ اس دن وہ پہلے دن ڈیوٹی پر آئی تھی۔ انہوں نے دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ اسے آرام کی تلقین کرنے لگے۔ وہ ہنس ہنس کر ٹالتی رہی۔ اسے اپنے کام سے کتنی محبت تھی۔ وہ اپنے مریضوں میں کتنا خوش رہتی تھی۔ اس کی اتنے دنوں کی غیرحاضری میں اس کے مریضوں نے دوسرے ڈاکٹروں کا دماغ چاٹ لیا تھا۔ ڈاکٹر فیروزہ نے تو اکتا کر کہہ دیا تھا۔

''لو جی تمت! سنبھالو اپنے لاڈلوں کو' دماغ خراب کر دیا۔ یوں مریضوں میں بھی کوئی اتنا پاپولر نہ ہو۔''

''آپ جل گئیں فیروزہ۔'' وہ زور سے ہنس پڑی تو فیروز نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

ابا میاں نے بتایا تھا کہ محسن بھائی کسی ٹرپ کے ساتھ باہر گئے ہوئے ہیں۔ اتنا تو اسے ڈاکٹر فرحان سے بھی معلوم ہو گیا تھا۔ ''وہ آئیں گے نا تو میں انہیں بتا دوں گی کہ آپ کو میں نے بتا دیا ہے۔''

''ہاں اس سے کہنا کہ مجھ سے آ کر مل جائے یا فون کر لے۔ میں اتنے دن رک نہیں سکتا۔''

''ابا میاں! آئیں نا میرے کمرے میں بیٹھیں۔''

''ہاں بیٹا! بس تمہیں سے تو ملنے آیا ہوں۔ یہاں سے سیدھا سٹیشن جاؤں گا۔''

''بس آج چلے جائیں گے۔'' وہ مغموم ہو گئی۔

☆......☆......☆

''ہاں بیٹے! جانا تو ہے نا۔''

''ابا میاں! میں آپ کو بہت یاد کرتی ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے جنہیں وہ پلکیں جھپک جھپک کر پی جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

ہمدانی صاحب کو وہ اتنی پیاری لگی۔ کتنی تو معصوم ہے کہ انہوں نے شپٹا کر سوچا اور سب لوگ اس کے متعلق نہ جانے کیا کہتے ہیں۔ اس میں چالاکی نام کو نہیں۔ وہ تو ناسمجھ بچوں کی سی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی ہے۔ اس کے متعلق خود ایسی بات سوچنا بھی گناہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ بار بار ان کی طرف دیکھتی تھی اس کے ہونٹوں کے گوشے نامعلوم مسرت سے پھڑک رہے تھے۔

انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بظاہر بے نیازی سے پوچھا۔

''تمہارے یہاں کوئی ڈاکٹر فرحان احمد ہیں۔''

وہ گھبرا سی گئی۔ ابا میاں ان کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں۔ عجلت میں بولی۔

''جی ہیں تو۔''

''کیسے آدمی ہیں؟'' انہوں نے اس کے چہرے سے مترشح گھبراہٹ محسوس کر لی تھی۔ اب انہیں بھی شک ہونے لگا۔

''جی اچھے قابل ڈاکٹر ہیں۔'' وہ اٹکتی ہوئی بولی۔

''انہوں نے تمہارے لئے پیام دیا ہے۔'' ان کا لہجہ ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ اپنی بات کا ردعمل اس کے چہرے پر دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔

''ابا میاں! خدا کی قسم میں نے انہیں کہا تھا۔''

''خیر کوئی بھی بات تھی لیکن تمہاری اماں بی کو یہ بات پسند نہیں۔ پہلے ہی جواد کے گھر والے اور دوسرے لوگ الٹی سیدھی باتیں کرتے رہے ہیں۔ اب فرحان کا پیام قبول کر لیا جائے تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ وہ ساری باتیں سچ تھیں اور بیٹا تمہیں پتہ ہی ہے خاندان میں ایسی باتیں معیوب سمجھی جاتی ہیں۔'' انہوں نے بڑے محتاط انداز میں اسے معاملے کی اونچ نیچ سمجھائی۔

حیرت و افسوس سے تمت گنگ سی ہو گئی تھی۔ شدت کرب سے انگلیاں چباتی ہوئی وہ ساکت سی بیٹھی تھی۔ اس کا سانولا چہرہ اور بھی سانولا ہو گیا تھا۔ یکا یک وہ کرسی

سے اٹھی اور ان کے گھٹنوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گئی اور ہانپتی ہوئی پوچھنے لگی۔

''ابا میاں! آپ بھی سب کچھ سچ سمجھتے ہیں۔ آپ بھی سمجھتے ہیں۔ یہ سچ ہے۔ آپ بھی مجھے ایسا ہی سمجھتے ہیں۔'' اس کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں نے ایک تار سا باندھ دیا تھا۔

صمدانی صاحب گھبرا گئے۔ اس کے ایک ایک آنسو میں وہ ڈوبتے جاتے تھے۔ اس کا منت بھرا لہجہ انہیں ندامت و پشیمانی میں مبتلا کیے دیتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی معصومیت اس کی سچائی کی گواہی دیتی تھیں۔

وہ بے قراری سے مسلسل کہے جاتی تھی۔ ''ابا میاں! آپ بھی مجھے ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ آپ بھی سمجھتے ہیں کہ میں بری لڑکی ہوں۔'' صمدانی صاحب کا دل کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ میری یہ مظلوم بیٹی کب تک دکھوں سے نباہ کرتی رہے گی۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا اور اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے بولے۔

''تمت! میری بیٹی روتی کیوں ہو' خاموش ہو جاؤ نا۔ میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔''

تمت جیسے ہوش میں آ گئی۔ پریشان ہو کر ان کی نبض پر ہاتھ رکھتی ہوئی بولی۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

صمدانی صاحب کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ انہوں نے بے اختیار اسے گلے لگا لیا۔ وہ سسکنے لگی۔

''ابا میاں! قسم خدا میں بری لڑکی نہیں ہوں۔ آپ یقین کریں۔ میری ڈاکٹر فرحان کے ساتھ کوئی بات نہیں۔ سچ مچ کوئی نہیں۔ مجھے تو پتہ بھی نہیں کہ انہوں نے پرپوز کیا ہے۔''

''ہاں ہاں تمت بیٹی مجھے یقین ہے۔ تم تو بہت اچھی لڑکی ہو اسی لئے تو میں نے خود تم سے بات کرنا مناسب سمجھا۔ تمہاری اماں بی بات بگاڑ دیتی ہیں۔ میں صرف تم سے یہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس میں تمہاری رضامندی تو شامل نہیں۔''

اس نے تڑپ کر سر اٹھایا اور بے بسی سے بولی۔ ''ابا میاں! میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں۔''

''مجھے یقین ہے۔'' انہوں نے عجلت سے جواب دیا۔

''تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔ میرا تو خیال تھا کہ اگر تمہیں بھی یہ بات پسند ہو تو پھر مجھے کسی کی پروا نہیں۔ نہ تمہاری اماں بی ہی کچھ کر سکیں گی۔ میں خود فرحان کا پیام منظور کروں گا۔''

تمت نے جھینپ کر سر جھکا دیا۔ بھلا ایسی باتیں کوئی باپ سے کیا کرتا ہے لیکن اس کا تو کوئی ہمراز بھی نہیں تھا۔ ماں نے کبھی اسے ایسی نظروں سے دیکھا ہی نہیں تھا جو بیٹیوں کے دلوں میں چھپے ہوئے راز تک پہنچ جاتی ہیں لیکن وہ ابا میاں سے کس طرح کہہ دے۔ ڈاکٹر فرحان میں برائی ہی کیا ہے جو یہ بات مجھے ناپسند ہوتی۔ کبھی نہ کبھی تو اماں بی نے مجھے بیاہ کر اپنا بوجھ ہلکا کرنا ہی ہے تو کسی دوسرے کے بجائے ڈاکٹر فرحان ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ اس کے من میں چپکے سے کسی نے سرگوشی کی۔

ڈاکٹر فرحان کی باتیں اس کی روح میں نغمہ سا بن کر گونجنے لگیں لیکن اماں بی جب جلال میں آئیں گی تو ابا میاں بھی کچھ نہ کر سکیں گے اور خاندان والے سب ہی کہیں گے کہ وہ باتیں سچ تھیں۔

''بیٹی بولو نا' ڈرنے یا شرمانے کی ضرورت نہیں جو بات تمہارے دل میں ہے مجھے صاف صاف بتا دو۔''

اس نے بڑی طمانیت سے سر اٹھایا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ابا میاں! مجھے اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ جس طرح بھی کریں میں اسی طرح خوش ہوں۔'' اس کے لہجے میں ایک عجیب سا وقار جھلکتا تھا۔ اس کا سانولا چہرہ سچائی کے نکھار سے چمک رہا تھا۔ بولی۔

''اب تو میں خود ہی من گئی ہوں۔ آپ سے ناراض ہو کر میں کیا کروں گی؟''

''کرو گی کیا' منہ پھلا لینا اس طرح۔'' انہوں نے مضحکہ خیز شکل بنائی۔

تمت بے ساختہ ہنس پڑی اور چاہت بھرے لہجے میں اپنائیت سے بولی۔
''محسن بھائی! آپ کتنے اچھے ہیں۔''
''بس ٹھیک ہے تمہیں اچھا لگتا ہوں تو پھر میں اچھا ہی ہوں گا۔'' انہوں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔
پھر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے ہوئے بولے۔ ''لاؤ ذرا چائے تو بنا کر پلاؤ۔ آج تو بہت تھک گئے۔''
تمت جلد ہی چائے بنا لائی تو محسن بھائی سیدھے ہو بیٹھے اور بچوں کے سے چکارنے کے انداز میں بولے۔
''ارے بھئی تمو! تم تو بڑے کام کی بچی ہو گئی ہو۔''
''ہیں؟'' وہ ایک دم خوش ہو گئی اور پوری سچائی سے بولی۔
''بس محسن بھائی ایک آپ ہیں کہ مجھے اچھا سمجھتے ہیں اور بس اس کا لہجہ ٹوٹ رہا تھا۔''
''نہیں تو چندا! تمہیں اور بھی بہت سے لوگ اچھا سمجھتے ہیں' تم سے پیار کرتے ہیں۔''
''کون' بھلا کون؟'' اس نے دکھی ہو کر پوچھا۔
''پہلے تو تمہارے ڈھیر سارے مریض ہی ہو گئے جو یوں تو مریں نہ مریں بس ڈاکٹر تمت کے پیچھے مرے جاتے ہیں۔'' انہوں نے مزاحیہ انداز میں کہا تو تمت بھی ہنس پڑی اور پھر تمہارے ابا میاں ہو گئے جو صرف تمہارے ابا میاں پھر ایک اور بھی ہیں جو تمہیں بہت چاہتے ہیں۔
''کون؟'' محسن بھائی نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔
''وہی جو تمہیں پرپوز بھی کرنا چاہتے ہیں۔''
''کوئی نہیں' محسن بھائی سب جھوٹ بولتے ہیں۔ سب غلط کہتے ہیں' سب جھوٹ بولتے ہیں۔'' اس نے چائے کی بھری پیالی ہاتھ سے رکھ دی اور یکا یک دیوانوں کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا جیسے وہ پتھر کی ہو۔ اپنا پرس اٹھا کر وہ بغیر کچھ کہے دروازے کی طرف بڑھی۔

محسن بھائی نے پریشان ہو کر پیالی ہاتھ سے رکھی اور عجلت میں اٹھ کر اسے دروازے پر جا لیا۔
''تمو' تمو! سنو تو بھئی کدھر جا رہی ہو۔''
''ہوسٹل۔'' وہ اجنبی سی آواز میں بولی۔
''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' انہیں اس کا چہرہ برسوں پرانے مریض کا نظر آتا تھا۔
''ٹھیک ہوں بالکل۔'' وہ ضبط کی نہ جانے کن منزلوں سے گزر رہی تھی۔ اس کی آواز شکستہ اور لہجہ ٹوٹا ہوا تھا جیسے کوئی آخری ہچکیاں لے رہا ہو۔
''تھوڑی دیر بیٹھو نا میرے پاس۔ ابھی مت جاؤ۔'' وہ اس کے شانوں کے گرد بازو لپیٹ کر اسے کمرے میں لانے لگے۔ وہ ایک معمول کی طرح ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی جیسے اپنے حواسوں میں نہ ہو۔ پھر ایک دم ان کی طرف پلٹ کر بولی۔
''محسن بھائی! شبو آپا بہت بری ہیں' بہت بری ہیں۔''
''وہ کیوں؟؟؟'' محسن بھائی حیران ہوئے۔ تمت نے ان کی بات سنی ان سنی کر دی۔
''وہ آپ کو یاد آتی ہیں۔''
''ظاہر ہے سبھی کا خیال آتا ہے۔ اسی گھر میں تو پلا بڑھا ہوں۔'' وہ الجھ سے گئے۔
''پر ان کا بھی قصور نہیں۔'' اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ ''ساری بات تو اماں بی ہے۔ انہیں کسی کا خیال نہیں۔''
''تمو! کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔ تھوڑی دیر خاموش بیٹھو' تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔'' انہوں نے اسے صوفے پر بٹھا دینا چاہا لیکن وہ کھڑی رہی اور ان کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔
''محسن بھائی! آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے کچھ نہیں پتہ۔ مجھے تو سب کچھ پتہ ہے۔ ساری بات میں تو آپ کی ڈائری پڑھ کر اتنا روئی تھی۔ مجھے سب پر بہت غصہ

آیا۔"

ایک لمحے کو ان کا چہرہ دھندلا سا گیا پھر جلدی سے سر جھٹک کر بولے۔

"وہ تو یونہی بچپن کی حماقت تھی۔"

"تو پھر آپ انہیں بھول گئے۔"

"یاد رکھنے سے کیا حاصل۔"

"اچھا!" وہ کسی سوچ میں پڑ گئی تو جواد بھی اسے بھول گیا ہے۔ عمران بھائی بھی یونہی کر دیں گے اور ڈاکٹر فرحان بھی۔ وہ تڑپ اٹھی۔ "پھر مجھے کون چاہے گا۔" اس کی روح میں سناٹا چھا گیا۔

اس کی پیاسی روح تڑپ گئی۔ اس کے خشک ہونٹ لرز گئے۔ وہ اچانک محسن بھائی کی طرف پلٹ گئی۔ ان کے کوٹ کے کالر مضبوطی سے پکڑتی ہوئی بولی۔

"محسن بھائی! آپ بھی مجھے چاہتے ہیں کہ نہیں۔ بتائیں نا۔ مجھے سچ سچ بتائیں۔" اس کی دیوانگی پر محسن بھائی گھبرا سے گئے۔

"محسن بھائی آپ بتاتے کیوں نہیں۔ کیوں نہیں بتاتے۔ آپ بھی مجھے چاہتے ہیں کہ نہیں۔" وہ پاگلوں کی طرح بار بار اپنی بات دہرائے جاتی تھی۔ محسن بھائی نے بچوں کی طرح اس کا پریشان چہرہ دونوں ہاتھ میں لے لیا اور تسلی دینے کے انداز میں بولے۔

"ارے تمو پگلی! یہ بھی کوئی بتانے کی بات ہے۔ میں تیرے محسن بھائی تجھے نہیں چاہیں گے تو کسے چاہیں گے۔ ہیں' پگلی نہ ہو تو کہیں کی۔"

اس نے ہانپ کر سر ان کے شانے پر ٹکا دیا جیسے میلوں پیدل چلتی ہوئی آئی ہو۔ دھیرے دھیرے ہونٹوں میں بدبدائی۔

"محسن بھائی! مجھے آپ کی بات کا یقین ہے۔ آپ تو غلط نہیں کہتے' ہیں نا۔ نہیں کہتے۔"

وہ تھکی تھکی سی ہوسٹل کی طرف آ رہی تھی جی چاہتا تھا کچھ دیر آنکھیں بند کر کے اپنے کمرے میں سکون سے بیٹھی رہے کہ روش سے گزرتے ہوئے اس نے ڈاکٹر فرحان کے کمرے کے باہر برآمدے میں سسٹر لیلیٰ کو دیکھا۔ وہ یونیفارم میں نہیں تھی۔

ساڑھی کے پلو سے آنکھیں خشک کر رہی تھی۔ تمت نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ بس ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر آگے بڑھ گئی۔

کمرے میں آ کر وہ اطمینان سے بیٹھی بھی نہیں تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ اس نے کسل مندی سے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھلا اور سسٹر لیلیٰ جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوئی جو سخت گھبرائی ہوئی لگتی تھی۔ اس کی دھلی دھلی آنکھیں پتہ دیتی تھیں کہ وہ روتی رہی تھی۔ اسے متذبذب دیکھا تو تمت نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"آ جاؤ لیلیٰ! کچھ پریشان لگتی ہو کیا بات ہے۔"

وہ بیٹھی نہیں۔ کرسی کی پشت پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی' ہچکچائی سی وہ ساڑھی میں یونیفارم سے کہیں زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ اس کا دلکش چہرہ سوگوار تھا۔ تمت نے ملائمت سے کہا۔

"لیلیٰ اطمینان سے بیٹھ جاؤ' گھبراؤ مت' مجھے اپنی دوست سمجھو۔"

اسے نہ جانے کیا ہوا کہ ایک دم کرسی پر گر پڑی اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ تمت کو بہت دکھ ہوا۔ اس نے خود دکھوں کے گھاؤ سہے تھے۔ اسی لئے تو لیلیٰ کے آنسو اسے اپنی آنکھوں سے بہتے معلوم ہوتے تھے۔ اس نے ہولے ہولے اسے تسلی دی۔ بار بار اس سے رونے کا سبب پوچھتی رہی۔ اس کی مدد کرنے کا وعدہ بھی کر لیا لیکن سسٹر لیلیٰ بے دردی سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

☆......☆......☆

"ڈاکٹر تمت! مجھے معاف کر دیجئے۔ میں نے آپ کو ناحق پریشان کیا۔" وہ اٹھنے لگی تو تمت نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بڑے دوستانہ انداز میں بولی۔

"لیلیٰ میں تمہیں اس طرح نہیں جانے دوں گی۔ ابھی میں نے تمہیں ڈاکٹر فرحان کے ہوسٹل کے باہر روتے دیکھا تھا۔ شاید ڈاکٹر فرحان احمد کے کمرے کے باہر۔ مجھے بتاؤ تو سہی پرابلم کیا ہے۔"

سسٹر لیلیٰ جس کے آنسو کچھ دیر ہوئی تھم گئے تھے۔ ایک بار پھر رونے لگی۔

تمت پریشان سی ہو گئی۔

"دیکھو لیلیٰ! پلیز چھپاؤ نہیں۔ میں تمہیں رازداری کا یقین دلاتی ہوں۔"

"نہیں ڈاکٹر تمت! میں تو دکھ سہنے کی عادی ہوں۔ میں آپ کی خوشیاں نہیں چھیننا چاہتی۔"

"لیلیٰ میں سمجھی نہیں۔" تمت حیران سی ہو گئی۔ بھلا میرا اس سے کیا تعلق۔

اس نے سر جھکایا اور اٹکتی ہوئی بولی۔

"ڈاکٹر فرحان نے کبھی مجھ سے بھی بہت سے وعدے کیے تھے۔ میں سچ کہتی ہوں۔ انہوں نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔ پھر پتہ نہیں انہیں کس نے بہکا دیا۔ انہیں یونہی غلط فہمی ہو گئی اور پھر ان کی زندگی میں آپ آ گئیں۔ میں ایک معمولی نرس ہوں اور آپ ڈاکٹر میری تو کوئی حیثیت ہی نہیں۔"

تمت کو اپنا آپ بڑا سبک محسوس ہوا۔ اس کی ذات ایک معصوم لڑکی کیلئے آزار بن گئی تھی۔ کسی اور کی محبت فرحان اس کی جھولی میں ڈال رہے تھے۔ وہ کانپ اٹھی۔ سسٹر لیلیٰ کہہ رہی تھیں۔

"میں ایک غریب لڑکی ہوں' بے سہارا ہوں۔ شاید اسی لئے مجھے ڈاکٹر فرحان نے ٹھکرا دیا ہے۔ میں تو اب بھی ان کا نام لے کر جیتی ہوں۔ میں تو......" اس کے لہجے میں ٹوٹے ہوئے دل کی محرومیاں بسی تھی۔ تمت نے اس کی بات کاٹی اور بردبار لہجے میں بولی۔

"اگر انہوں نے ایسے وعدے کر رکھے ہیں تو انہیں نبھانے ہوں گے اور میرے متعلق تم یہی سمجھو کہ میں نے نہ ان میں کبھی دلچسپی لی اور لیتی ہوں۔ انہیں شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"مگر میں نے تو۔" وہ جھجکی۔ "میں نے تو سنا ہے کہ انہوں نے آپ کیلئے پیام دیا ہے۔"

"جو بھی تم نے سنا ہے غلط سنا ہے۔ بس تم اسی سے غرض رکھو کہ میں ایک اچھی دوست کی طرح تمہاری مدد کروں گی۔ مجھے اس سے بہت خوشی ہو گی۔"

"میں......میں ان سے بھیک مانگنا چاہتی ہوں۔ میں نے آپ کو صرف اس لئے بتایا ہے کہ آئندہ ان کا خیال رکھیں۔ وہ زود رنج ہیں اور بہت جلد دوسروں کی باتوں میں آ جاتے ہیں۔ خدانخواستہ آپ۔" اس نے ہونٹ بھینچ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"یہ بھیک نہیں ہو گی لیلیٰ! یہ تو تمہارا حق ہے جو ڈاکٹر فرحان کو بہر صورت ادا کرنا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں ان کی غلط فہمیاں اچھی طرح سے دور کر دوں گی۔"

لیلیٰ کے خوبصورت چہرے پر شفق سی پھولنے لگی۔ اس کی آنسوؤں سے دھلی آنکھوں میں مسکراہٹ کاجل کی دھاری بن کر چمک اٹھی۔ کچھ جھینپی جھینپی سی بولی۔

"ڈاکٹر تمت! میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ اس طرح میرے زخموں پر مرہم رکھیں گی۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ شاید دھتکار دی جاؤں گی۔"

تمت کا دل ڈوبنے لگا۔ اس نے تو دل پر اتنے وار سہے تھے کہ درد کی شدت دوا ہو گئی تھی۔ اس نے خود میں ملکیت کا احساس جاگنے ہی کب دیا تھا جو کچھ چھن جانے پر تڑپتی۔ اس نے کبھی کچھ پایا ہی کب تھا جو کچھ دینے کا ملال کرتی۔ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولی۔

''لیلیٰ! بڑا افسوس ہے کہ تم مجھے انسان نہیں سمجھتی تھیں۔''

لیلیٰ لاجواب سی ہو کر بولی۔ ''ڈاکٹر تمت! انسان تو سب ہی کہلاتے ہیں لیکن آپ انسان سے بھی بڑھ کر ہیں۔ میں آپ کو کیا کہوں۔''

تمت محجوب سی ہوگئی۔ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''اچھا اب تم خوشامد تو کرو نہیں۔ مجھے تم دونوں کو اکٹھا دیکھ کر جتنی خوشی ہوگی یہی میرے لئے سب کچھ ہے۔''

لیلیٰ بڑی عقیدت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی جاتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ تمت خفیف سی ہوگئی۔ اٹھ کر اپنے کپڑے تہہ کرنے لگی۔ پھر لیلیٰ سے بولی۔

''اب تم مجھے اپنی سٹوری ذرا تفصیل سے ٹھیک ٹھیک سنا دو۔ پھر آگے میں جانوں اور میرا کام۔''

وہ شرما کر رہ گئی۔ دونوں ہاتھ ملتی ہوئی یونہی ہونٹ کاٹنے لگی۔ تمت نے اس کی ہمت بندھائی۔

''ہاں ہاں لیلیٰ! ارے بتاؤ نا۔ اب مجھ سے بھی شرماؤ گی۔'' اس نے بے تکلف دوستوں کے سے انداز میں کہا تو لیلیٰ نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے یقین کر رہی ہو کہ وہ اس کا مذاق تو نہیں اڑا رہی۔ تمت نے پھر پوچھا تو وہ محبت کی وہ ناتمام داستان بیان کرنے لگی جس کا حسین آغاز انجام کو ترس رہا تھا۔

''محسن بھائی! کتنا گند مچا رکھا ہے آپ نے۔'' اس نے بے ترتیب سامان دیکھ کر کہا۔

''صفائی کرنے والی بیمار پڑ جائے تو میں کیا کروں۔ ڈاکٹر تو تم ہو۔ میں تو نہیں نا۔ بچارا سیدھا سادھا پروفیسر ہوں۔''

''آپ بھی تھوڑا بہت ہاتھ ہلا لیا کریں تو کیا حرج ہے۔''

''بہت سارا حرج ہے۔'' انہوں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ''مجھ سے دو ڈیوٹیاں بیک وقت نہیں ہوتیں۔''

''اتنا سا کام آپ کیلئے ڈیوٹی ہو جائے گا۔''

''چلو جانے دو ان باتوں کو۔ بتاؤ تمہارے کیا حال چال ہیں۔''

''ٹھیک ہوں۔'' وہ سادگی سے مسکرائی۔

''ڈاکٹر فرحان کیسے ہیں۔'' انہوں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''وہ بھی خیریت سے ہیں۔'' تمت نے روانی سے جواب دیا لیکن دل بجھ سا گیا۔ ڈاکٹر فرحان نے اسے کتنا گھٹیا سمجھا تھا۔ عام مردوں کی طرح کھلونا۔

''اچھی طبیعت کے ہیں دلچسپ آدمی۔''

''جی ہاں۔'' وہ بے دلی سے بولی۔

محسن بھائی بڑے غور سے اس کے سپاٹ چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے کسی راز کا سراغ پانا چاہتے ہوں۔ پھر بڑے محتاط انداز میں گویا ہوئے۔

''تمو! ایک بات بتائے گی۔''

''ضرور۔'' اسے معلوم تھا کہ وہ اب کیا پوچھنے والے ہیں۔ کرب کی ایک لہر سی اس کے چہرے پر تڑپ گئی۔ محسن بھائی بولے۔

''ڈاکٹر فرحان نے تمہیں پرپوز کیا۔ انہوں نے مجھ سے تمہارا ایڈریس لیا تھا۔''

وہ بے دلی سے مسکرائی۔

''جی۔''

''پھر؟'' انہوں نے بے صبری سے پوچھا۔

''پھر کیا؟'' وہ جان بوجھ کر خاموش ہوگئی تو محسن بھائی جھنجھلائے۔

''پوچھ رہا ہوں ان کو کیا جواب ملا۔''

''نو لفٹ۔'' وہ زہریلی سی ہلکی ہنس دی۔ محسن بھائی کا چہرہ اتر گیا۔

''کیوں تمو! انہیں انکار کیوں ہوا۔ تمہاری طرف سے یا گھر والوں نے کیا۔''

''محسن بھائی!'' اس کی آواز رندھ گئی۔ آنسوؤں کا ایک بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔

''سب یہی سمجھتے ہیں کہ میرا ان کے ساتھ کوئی تعلق رہا ہے۔ میں سب کو کیسے یقین دلاؤں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ محسن بھائی آپ ...... آپ بھی مجھے ایسا ہی سمجھتے ہیں۔'' وہ ضبط کے باوجود رو دی۔ پھر ہونٹ دبا کر سسکیاں روکتی ہوئی بیدردی

سے آنسو پونچھنے لگی۔ محسن بھائی دکھی ہو گئے۔ جلدی سے بولے۔

''لو بھلا میں ایسا کیوں سمجھنے لگا۔ مجھے تمہاری طبیعت کا نہیں پتہ۔ ایسی اچھی لڑکی ہو تم تو۔''

اس نے بھیگی پلکیں اٹھائیں۔

''محسن بھائی! سب ہی ایسا سمجھتے ہیں۔ ابا میاں بھی' کتنی بری بات ہے۔'' وہ سمجھانے لگے۔

''تمو! تم کیوں دل چھوٹا کرتی ہو۔ اس دنیا میں سب کو مطمئن کرنا بہت مشکل ہے۔ برے لوگ اچھے لوگوں سے بہت بڑھ کر ہیں۔ بس ہمیں اپنے ضمیر کو دیکھنا ہے۔ کوئی کچھ بھی کہتا رہے بس تم مجھے یہ بتاؤ ان کے پیغام کا کیا ہوا؟''

''اماں بی نے کہہ دیا ہے کہ اگر ہم یہاں منظوری دے دیں تو سب یہی سمجھیں گے کہ وہ والی باتیں صحیح تھیں۔''

''کون سی باتیں؟''

''وہی والی باتیں۔'' اس نے بظاہر بے نیازی سے کہا لیکن لہجہ ٹوٹ رہا تھا۔

''کمال ہے ویسے لڑکا اچھا تھا' تمو! بھئی دیکھو شرمانا بالکل نہیں۔ مجھے سچ سچ بتاؤ کہ فرحان تمہیں پسند ہیں۔'' انہوں نے اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے چمکار کر کہا۔

وہ خلاف توقع زور سے ہنس پڑی۔ محسن بھائی نے یوں اس کی طرف دیکھا جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔ وہ ہنستی چلی گئی لیکن ایسی ہنسی جس میں کرب کے لپکے سے اٹھتے تھے جو ہمیشہ شکست کھانے والوں کے لبوں پر ایک خفت سی بن کر ابھرتی ہے۔ محسن بھائی حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے گئے جس کی آنکھوں میں ہنستے ہنستے نمی جھلکنے لگی تھی۔ وہ ہنستے ہنستے یکلخت خاموش ہو گئی اور ان کے متفکر چہرے کی طرف دیکھ کر سراسیمہ ہو گئی جیسے ان کی متوقع ڈانٹ کا خطرہ ہو۔ اسے خاموش دیکھا تو انہوں نے اپنا سوال دہرایا۔

''تمو! میں نے ڈاکٹر فرحان کے بارے میں پوچھا ہے۔''

''کیا بتاؤں ان کے بارے میں آپ کو۔'' وہ اکتائی۔

''یہی کہ تمہیں پسند ہیں کہ نہیں۔''

''مجھے پسند بھی ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ مجھ سے پہلے مسز لیلیٰ کو سبز باغ دکھلاتے رہے ہیں۔''

''اوہ نو' وہ اس طرح نہیں کر سکتے۔''

''آپ چاہے نو کہیں یا یس۔ وہ ایسا کر چکے ہیں۔ اب انہیں مسز لیلیٰ سے شادی کرنا ہی پڑے گی یونہی اس بے چاری لڑکی سے وعدے کرتے رہے اور پھر مکر گئے۔ وہ تو اتنی خوبصورت بھی ہے۔'' اس نے عجیب سی حسرت سے کہا۔

محسن بھائی بہت دیر خاموش بیٹھے کچھ سوچتے رہے پھر ہولے ہولے کہنے لگے۔

''تمو! میں چاہتا ہوں کہ تمہارا زندگی کا ساتھی تمہاری قدر کرے' تمہیں اتنی خوشیاں دے کہ تم ساری محرومیاں سارے دکھ بھول جاؤ۔ تم ہمیشہ خوش رہو' بہت خوش۔ فرحان تمہارے ساتھ بڑی عقیدت' بڑے لگاؤ کا اظہار کر رہے تھے اسی لئے تو میں نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ نیک نیت ہیں تو تمہیں پرپوز کریں۔''

☆......☆......☆

وہ معصومیت سے چہرہ اٹھائے ان کی طرف خاموشی سے دیکھتی رہی جیسے کوئی عقیدت مند شاگرد اپنے استاد کو دیکھتا ہے۔ محسن بھائی نے متفکر سا ہو کر کہا۔

''تمو! اب تمہاری شادی ہو جانا چاہیے۔ تمہیں ایک ساتھی کی ضرورت ہے جو ہر کام پر تمہارا ساتھ دے۔ تمہاری دلجوئی کرے' جتنی محرومیاں تم نے سہی ہیں ان کی تلافی کر دے۔'' اور تمت سوچ رہی تھی کہ مجھ سے کون شادی کرے گا۔ کون ہے جو میرا ساتھ ہر کام پر دے گا۔

''تمو! میں ڈرتا ہوں کہیں ممانی کوئی غلط فیصلہ نہ کر دیں۔ مجھے ان کے مزاج کا علم ہے۔ وہ بیٹیوں کے بوجھ سے خوفزدہ ہیں۔ ان کی جلد بازی کی سزا دوسروں کو بھگتنا پڑتی ہے۔'' تمت کچھ کہنے ہی والی تھی کہ باہر سے کسی نے پکارا۔

''پروفیسر صاحب!''

''شائستہ اندر آ جاؤ۔'' محسن بھائی نے آواز پہچان لی تھی۔

ایک کامنی سی لڑکی پردہ اٹھا کر اندر آئی اور ہاتھ ماتھے تک لے جا کر اس

نے آداب کیا۔ محسن بھائی نے تعارف کرایا۔ وہ ان کی شاگرد تھی۔ ان کی کتابیں واپس کر کے وہ جلد ہی رخصت ہو گئی۔ تمت کو وہ پیاری سی لڑکی بہت اچھی لگی۔ بچوں کی سی بے صبری سے بولی۔

''محسن بھائی! آپ اس سے شادی کر لیں۔''

محسن بھائی پہلے تو حیران ہوئے پھر محظوظ ہو کر انہوں نے قہقہہ لگایا۔

''اب میں اس عمر میں شادی کروں گا۔ تمت! ویسے اطلاعاً عرض ہے اس کی منگنی ہو چکی ہے۔''

وہ افسردہ ہو گئی۔ محسن بھائی نے مذاق اڑایا۔ ''بہت افسوس ہوا تمہیں۔''

''محسن بھائی! اب آپ شادی کر لیں نا' کسی اچھی سی لڑکی سے۔'' اس نے بڑے ارمان سے کہا۔ وہ اس کے بچگانہ انداز پر مسکرائے۔

''تمو! اب میری عمر شادی کرنے کی ہے۔''

تمت نے ایک والہانہ پن سے ان کی طرف دیکھا' کتنے خوبرو اور باوقار تھے وہ' دراز قد اور خوش لباس' بھرپور سچائی سے بولی۔

''اتنے تو اچھے ہیں آپ محسن بھائی۔''

''تمہیں اچھا لگتا ہوں نا' لڑکیاں تو کہتی ہیں ہم اس بوڑھے سے شادی نہیں کریں گی۔'' انہوں نے چڑایا۔

''واہ کون کہتا ہے۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔ محسن بھائی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''ارے رے پگلی! تم رونے کیوں لگیں۔ ہر بات اپنے وقت پر اچھی لگتی ہے اور اب میں ان بکھیڑوں میں پڑنا بھی نہیں چاہتا۔ زندگی کے مقاصد ان باتوں سے بہت بلند ہیں۔ انسان کو دوسروں کیلئے کچھ کرنا چاہیے' ہر وقت اپنی طرف تو نہیں دیکھنا چاہیے' ہیں نا۔''

تمت افسردگی سے ان کی باتیں سنتی رہی۔ اسے سب پر کتنا غصہ آ رہا تھا۔ وہ سب ہی تو اس کے ذمہ دار تھے۔ محسن بھائی کو ایک پرسکون گھر کی خوشبوؤں سے محروم کرنے والے وہ سب ہی تو تھے۔ سب سے محبت کرنے والے محسن بھائی سے ان کی محبت چھیننے والے کتنے ظالم تھے لیکن وہ تو نفرت کے وار سہتے سہتے مجسم محبت میں ڈھل

گئے تھے۔ اس نے اپنے صوفے کے ہتھے پر ٹکا ہوا ان کا ہاتھ تھاما اور بڑی عقیدت سے چوم لیا۔

''محسن بھائی! آپ عظیم ہیں۔'' اس نے بھیگی پلکوں سے کہا۔

''ہیلو ڈاکٹر!'' وہ گیلری کا موڑ مڑی تو سامنے سے کسی آنے والے نے کہا۔

وہ ٹھٹھک کر تھم گئی اور غور سے دیکھا۔ ''عمران بھائی آپ۔'' وہ مسکرا دی۔

''جی ہاں ہم' آپ کو ناگوار ہوا۔'' ذرا خشک لہجے میں پوچھا گیا۔ اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا تو وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

''کیا حال ہیں تمہارے؟''

''خیریت ہے۔'' اس نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ان سے سامنا جیسے ایک بیتے ہوئے خوشگوار لمحے کا سامنا تھا جو دل میں پھانس سی بن کر ہمیشہ یاد رہے گا جیسے روتی آنکھوں کے ساتھ کوئی ہنس دے۔ وہ سمجھ نہیں پاتی تھی کہ اس نے کسے چاہا تھا۔ زندگی کے سفر میں وہ سب خود ہی چند لمحوں کیلئے اس کے ساتھ ساتھ چلے تھے۔ اس کے تنہا جیون میں چاہتوں کے چراغ سے جلنے لگے تھے لیکن پھر ایک پھونک مار کر انہیں بجھا دیا گیا اور دھوئیں کے زہر آلود مرغولوں میں اس کا دم گھٹ کر رہ گیا تھا۔

عمران بھائی جو اس کے ساتھ ساتھ چلے آئے تھے تلخی سے بولے۔

''تمت! تمہیں علم ہے کہ تمہارے گھر سے ڈاکٹر فرحان کو انکار کر دیا گیا ہے۔''

وہ لرز کر رہ گئی۔ عمران بھائی سے اسے خوف آنے لگا تھا۔ ان کا سنجیدہ چہرہ اور تلخ لہجہ اسے یوں معلوم ہوتا جیسے اس کے بال اب بھی ان کی گرفت میں ہوں جیسے وہ ابھی اس کا گلا دبانے کو ہوں۔ وہ چپ چاپ چلتی گئی۔

''تمت! میں نے کیا کہا ہے۔'' وہ جھنجلائے۔

''جی مجھے پتہ ہے۔'' اس نے مجرموں کے انداز میں سر جھکا کر کہا۔

''تمہیں کوئی اعتراض نہیں۔'' انداز درشت تھا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔

''نہیں' تم تو کبھی بھی کچھ نہیں کہہ سکتیں۔ خود کو زیادہ مظلوم بنانے کی کوشش

نہ کرو۔"

وہ صرف ایک بار ان کی جانب دیکھ کر رہ گئی۔ انہوں نے دانت پیسے۔

"اب تم کیا کرو گی؟؟"

تمت نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا جیسے ان کی بات سمجھ نہ پائی ہو۔

"میرا مطلب ہے اسی مردود فرحان کیلئے تم نے مجھے انکار کیا تھا تو اب کیوں نہیں کرتی ہو اس سے شادی۔"

"کس طرح کرلوں۔" اس نے سراسیمہ ہو کر کہا۔

"کیوں اب کیا قباحت ہے۔" وہ وہیں رک گئے۔ اسے بھی رک جانا پڑا۔

وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ "اماں بی جانیں اور ان کا کام۔ میں کیا کر سکتی ہوں؟"

عمران بھائی نے قہر آلود نگاہ اس پر ڈالی۔ جی چاہا کہ اسے اتنے تھپڑ ماریں کہ دماغ درست ہو جائے۔ انجم کے ساتھ انہیں اب تک وہ لگاؤ محسوس نہیں ہوا تھا جیسی کشش وہ اپنے دل میں اس کیلئے محسوس کرتے تھے۔ کتنی معصوم' سادہ اور انوکھی تھی وہ ہمدرد اور مشفق جیسے ساری محبتیں' سارے رشتے' ساری چاہتیں اس کے انداز میں گھل مل گئی ہوں لیکن اس کی ہمدردیاں' اس کی چاہت حاصل ہوتے ہوئے بھی ناقابل حصول تھی۔ اسے بہت قریب کر لینے کو جی چاہتا تھا جیسے کوئی متبرک چیز ہو جس کے حاصل کر لینے کی خواہش اک نئی ڈھارس بندھاتی ہو لیکن وہ ایک معمہ سے بڑھ کر تھی۔ اس کی تو کسی بات کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ وہ کچھ کہتی بھی تو نہیں تھی۔ سہمی ہوئی سی پلکیں جھپکے جاتی تھیں۔ انہیں ایک بار پھر اس پر غصہ آ گیا۔

"مجھے بھی انکار' تم نے اماں بی سے پوچھ کر ہی کیا تھا' ہیں نا۔"

تمت کا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر انہیں سب کچھ بتا دے کہ وہ تو اماں بی کی کہی ہوئی بات دہرانے پر مجبور ہے لیکن اب سب لاحاصل تھا۔ انجم آپا کی زندگی میں کانٹے بکھیر کر اسے کیا ملتا۔

ضبط کرتی ہوئی سپاٹ لہجے میں بولی۔ "عمران بھائی! پرانی باتوں کو دہرانے

سے کیا فائدہ' خوامخواہ تلخی بڑھتی ہے۔"

وہ نہ جانے کیوں نرم پڑ گئے۔ "تمو! میرا مطلب ہے اگر وہ تمہیں پسند ہیں تو تمہاری اماں بی کو انکار کا حق نہیں۔ میں تو تمہیں ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہاری چاہت نہیں ملنی چاہیے۔"

تمت سوچتی رہی۔ میری خوشیاں' میری چاہتیں کہاں ہیں۔ میں انہیں کہاں ڈھونڈوں۔ میں تو ابھی اپنی خوشیوں کی شناخت بھی نہیں کر پاتی کہ دوسرے انہیں لوٹ کر اپنی راہ لیتے ہیں۔

بے دلی سے مسکرا کر بولی۔ "عمران بھائی! میں آپ کے جذبات کی قدر کرتی ہوں۔ میں...... میں صرف اتنا چاہتی ہوں آپ میری طرف سے اپنا دل صاف کر لیں۔ مجھے برا نہ سمجھیں۔" اس کے کانپتے لبوں پر مسکراہٹ تھی لیکن آنسوؤں سے بھری ہوئی تھی۔

عمران کو وہ ایک بھٹکی ہوئی مظلوم روح معلوم ہوئی۔ انہوں نے سر جھکایا اور آہستہ سے بولے۔

"تمت! تم اب بھی مجھے اسی طرح عزیز ہو اور ہمیشہ رہو گی۔ ہمیشہ رہو گی۔"

ڈاکٹر فرحان کا مزاج بہت برہم ہو رہا تھا۔ صبح سے نرسیں ان سے چھپتی پھرتی تھیں۔ مریضوں کی شامت الگ آئی ہوئی تھی۔ تمت سے بھی رسمی علیک سلیک ہوئی۔ اس نے بھی چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ کچھ دنوں کی چھٹیاں لے کر گھر گئے ہوئے تھے اب آئے تھے تو سب کو کاٹنے کو دوڑ رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا گھر والوں نے کہیں پوچھے بغیر بات پکی کر دی ہے۔ اس نے یونہی اندازہ لگایا اور دل ہی دل میں ہنس پڑی۔

ڈیوٹی سے فارغ ہو کر وہ ہوسٹل کی طرف روانہ ہوئی تو ڈاکٹر فرحان بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتے اس کے پیچھے پیچھے لپکے۔ اس نے گھوم کر دیکھا اور مسکرا دی۔

"آج تو کسی کی بھی خیر نظر نہیں آتی۔"

ڈاکٹر فرحان مسکرائے تک نہیں سنجیدگی سے بولے۔

"مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

تمت بھی موقع کی تلاش میں تھی۔

''ضرور ضرور۔''

اس نے کمرہ کھولتے ہوئے بڑی فراخدلی سے کہا۔ ''آ جائیے۔''

وہ اندر چلے آئے اور تمت کے کہنے سے پہلے ہی ایک کرسی پر گر سے پڑے۔ ان کا چہرہ اترا اترا سا تھا اور پریشانی سے کرسی پر پہلو بدل رہے تھے۔ تمت نے تھرماس سے پانی انڈیلا اور گلاس ان کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔

''آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔''

انہوں نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر ایک طرف رکھ دیا اور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولے۔

''تمت! آپ میری بات تو سنیے۔ آپ کو علم ہے کہ آپ کے گھر والوں نے ہمارا پیام مسترد کر دیا ہے۔''

☆ ☆ ☆

تمت کو ان کی غیر معمولی فکرمندی پر ہنسی آ گئی۔ کبھی یہ لیلیٰ کیلئے بھی اسی طرح پریشان رہے ہوں گے اور آج میرے لیے تڑپ رہے ہیں۔ بے نیازی سے بولی۔

''تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔''

''آپ کے خیال میں کچھ نہیں ہوا۔'' انہیں حیرت کے ساتھ جھنجھلاہٹ ہوئی۔

''جی ہاں' خوامخواہ پریشان ہونے سے حاصل۔''

''ڈاکٹر تمت!'' وہ دھاڑے۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' وہ سہم گئی۔

''ڈاکٹر فرحان! پلیز آپ آرام سے بات کریں نا۔''

''آرام سے کرنے کی بات بھی ہو۔'' وہ درشتی سے بولے۔

''آپ آرام سے میری بات سنیں گے تو کہوں گی۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''فرمائیے۔'' انہوں نے بظاہر پرسکون ہو کر کہا لیکن انداز میں بے صبری صاف جھلکتی تھی۔ پھر یکبارگی عجیب سی بے تابی سے بولے۔

''تمت! آپ میرا ساتھ نہیں چھوڑ سکتیں۔''

تمت پہلے تو جھجک سی گئی پھر لہجے میں ایک اعتماد پیدا کرتے ہوئے متانت سے گویا ہوئی۔

''آپ کو لیلیٰ کی طرف لوٹ جانا چاہیے۔''

ڈاکٹر فرحان کو اس کی توقع نہیں تھی۔ بھونچکے سے ہو کر دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے پھر تیزی سے بولے۔

''اچھا تو آپ کو بھی اس چالاک لڑکی نے ورغلایا ہے۔''

''نہیں اس نے ورغلایا نہیں صرف اپنا حق مانگا ہے۔ وہ صرف ان وعدوں کے سہارے جی رہی ہے جو شاید کبھی پورے نہیں ہوں گے۔''

ڈاکٹر فرحان جھلائے۔ ''ہاں میں نے اس سے وعدے کیے تھے لیکن مجھے علم نہیں تھا کہ وہ سب کو خوش رکھنے والی نرس ہے۔''

''آپ کو کسی کے کردار پر شک کرنے کا حق نہیں۔ اس کی شرافت اور بلند کردار کی ضمانت میں دیتی ہوں۔ اگر لوگ اس سے خوش ہیں تو اس کی خوش اخلاقی اور پیشہ ورانہ مہارت سے اور یہ تو اس کا فرض ہے۔ آپ اس سے کوئی غلط مطلب مت نکالیں۔''

''لیکن آپ اس کی اتنی حمایت کیوں کر رہی ہیں؟''

''ہر اچھے انسان کو اس کی حمایت کرنی ہی چاہیے۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''لیکن ڈاکٹر تمت!'' وہ جھنجھلائے۔

''آپ نے سسٹر پامیلا اور اس کی پارٹی کے کہنے پر یقین کیا ہے نا۔'' تمت نے اس کی بات کاٹی اور سسٹر پامیلا کی حقیقت یہ ہے کہ وہ آپ کے عشق میں گرفتار ہیں اور ان کے بھائی لیلیٰ پر فریفتہ ہیں۔ دونوں جھوٹی سچی باتیں اسی شوق میں گڑھتے رہتے ہیں۔

بہت دیر وہ ڈاکٹر فرحان کو سمجھاتی رہی لیلیٰ کی صفائیاں پیش کرتی رہی۔ انہیں اس کی طرف سے اطمینان دلاتی رہی۔ لیلیٰ کے لئے ان کے سوئے جذبات بیدار کرتی رہی۔ وہ خود جو چاہتوں کو ترسی ہوئی تھی دوسروں کیلئے محبت مانگتی پھر رہی تھی۔

ڈاکٹر فرحان اور سسٹر لیلیٰ کی شادی میں محسن بھائی بھی شریک ہوئے تھے۔ دلہن بنی ہوئی لیلیٰ کے چہرے پر مسرت و طمانیت شفق بن کر پھول رہی تھی۔ اس کا خوبصورت چہرہ مسکراہٹوں کے نور میں نہا رہا تھا۔ تمت اسے ہال میں لے جانے کو اٹھنے لگی تو سرخ زرتار غرارہ سنبھالے ہوئے اٹھتی ہوئی لیلیٰ ایک بار اس کے قدموں میں جھک گئی۔ تمت نے عجلت میں اسے سیدھا کیا۔

''یہ کیا فضول حرکت ہے۔''

''نہیں ڈاکٹر تمت! میری ساری خوشیاں آپ کے دم قدم سے ہیں۔''

''بری بات۔ اس طرح نہیں کہتے۔'' تمت نے خفگی سے کہا اور اس کے ہمراہ چلتی ہوئی ہال میں بنے سٹیج تک آ گئی جہاں فرحان دلہا بنے بیٹھے تھے۔ لیلیٰ کو اس کے برابر بٹھا کر اس نے گھونگھٹ کی اوٹ میں چمکتے ہوئے اس کے خوبصورت چہرے کو دیکھا اور نہ جانے کیوں اس کے دل میں یک دم یہ خیال کیوں آیا کہ وہ دلہن بنے تو کیسی لگے؟ ایک جھرجھری سی لے کر اس نے یہ خیال جھٹک دیا۔ میری بدصورتی کس کو گوارا ہو گی۔

شادی کے ہنگامے ختم ہوئے تو وہ محسن بھائی کے ساتھ ہوٹل سے باہر نکلی۔ لفٹ میں ان کے ساتھ کھڑے ہوئے اس نے نہ جانے اپنائیت کے کس جذبے سے ان کے بازو میں ہاتھ ڈال دیا اور ان کے شانے کا سہارا لے کر کھڑی رہی۔ محسن بھائی نے ایک نگاہ اس پر ڈالی اور ہنس کر بولے۔ ''ڈر لگ رہا ہے تمہیں۔''

''نہیں..... نہیں تو۔'' وہ بوکھلا گئی لیکن محسن بھائی نے محسوس کیا کہ وہ ہولے ہولے کانپ رہی ہے۔ اپنے بازو پر ٹکے اس کے ہاتھ کو تھاما تو وہ بالکل سرد ہو رہا تھا۔ وہ متفکر سے ہو گئے۔

''تمو! تمہیں سردی لگ رہی ہے۔''

تمت جس کی پیشانی پسینے میں بھیگ رہی تھی ہڑبڑا کر بولی۔ ''نہیں کوئی بھی نہیں۔''

''تمہاری طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگتی۔'' انہوں نے اس کے اترے اترے چہرے کی طرف دیکھا۔

''نہیں تو محسن بھائی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

تنہائی کتنی وحشت ناک ہے۔ کسی خوفناک بیماری کی طرح جو آناً فاناً ہنستے کھیلتے آدمی کو چاٹ کر رکھ دے۔ انجانے دل میں ایک خلش سی کیوں تھی۔ تنہائی کا احساس' محرومی کا داغ' دوچند کیوں ہو گیا تھا۔ ناتمام آرزوؤں میں ایک شدت کیوں پیدا ہو گئی تھی۔ نا آسودہ تمناؤں کی ٹیس سوا کیوں تھی۔ اسے کیا چاہیے تھا' اس کی سمجھ

میں نہیں آ تا تھا۔ اسے کس کی تمنا تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔

محسن بھائی کی آواز پر وہ اوپرے سے قدموں سے چلتی ہوئی ان کے قریب آئی۔ دروازہ زور سے بند ہوا تو اس نے چونک کر اپنے برابر بیٹھے ہوئے محسن بھائی کو دیکھا' بے اختیار جی چاہا کہ ان کے سینے سے لگ کر اتنا روئے کہ دل کے سارے داغ آنسوؤں سے دھل جائیں۔ دل پر ایک غبار سا چھایا تھا جیسے رونا چاہتی ہو لیکن آنسو نہ نکلتے ہوں۔

''اب تو تمہاری سسٹر لیلیٰ خوش ہے نا۔'' محسن بھائی نے یوں ہی بات چھیڑنے کو کہا۔

تمت گم سم بیٹھی رہی۔ کوشش کے باوجود وہ کچھ نہیں کہہ پائی۔ اس کے پاس سارے لفظ ختم ہو گئے تھے۔ گویائی کی قوت جیسے کوئی چھین کر لے گیا تھا۔ محسن بھائی نے سمجھا کہ کھٹارا سی ٹیکسی کے شور میں اس نے سنا نہیں ذرا سا سر جھکا کر انہوں نے اپنا فقرہ دہرایا تو تمت نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ اب پھر سامنے سڑک کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تمت بے بس سی ہو گئی۔ اسے معلوم ہوتا تھا۔ وہ آنسوؤں میں گلے گلے ڈوبی ہے' کچھ دیر ضبط کی کوشش میں ہاتھ ملتی رہی۔ ہونٹ کاٹتی رہی پھر نڈھال سی ہو کر اس نے ان کے شانے سے سر ٹکا دیا اور ہانپتی ہوئی بولی۔

''محسن بھائی! میری طبیعت ٹھیک نہیں۔''

محسن بھائی نے متفکر ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ہلکی ہلکی روشنی میں اس کا زرد چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ اس کا سر جھول رہا تھا جیسے بیہوش ہو رہی ہو۔ انہوں نے اس کے شانوں کے گرد بازو لپیٹ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کے دونوں ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا دبا کر رگڑنے لگے۔ تمت کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سکون وطمانیت کی ایک گہری کیفیت میں ڈوبتی جاتی تھی۔ وہ اس سے بے خبر تھی کہ وہ کہاں ہے۔ محسن بھائی بار بار ڈرائیور سے تیز چلنے کو کہہ رہے تھے۔ نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ وہ سخت پریشان ہے۔ یہ چھوٹی سی لڑکی سکون کی تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتی پھرے گی۔ معلوم نہیں وہ کیا دکھ ہے جو اسے اندر ہی اندر کھوکھلا کیے دیتا ہے۔

ہوسٹل کے قریب ٹیکسی رکی تو ٹیکسی والے کے پیسے چکا کر انہوں نے اسے سہارا دے کر باہر نکالا۔ وہ شاید کچھ ہوش میں آتی جاتی تھی۔ انہوں نے اسے ہوشیار کیا۔

''تمت! چابی دو نا' تمہارا کمرہ کھولوں۔''

تمت نے سرخ آنکھیں کھول دیں اور حیران حیران نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

''محسن بھائی! مجھے کیا ہوا ہے۔''

''کچھ نہیں' بس یونہی تمہاری طبیعت ذرا خراب ہو گئی تھی۔''

وہ کچھ حیران سی ہو گئی۔ پھر خاموشی سے اپنے شانے پر لٹکتے ہوئے پرس میں سے چابی نکال کر کمرہ کھولنے لگی۔ محسن بھائی نے کچھ نہیں کہا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتے رہے۔ وہ اب یوں کھڑی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

اماں بی کا بلاوا ہمیشہ بڑا ذومعنی اور دھماکہ خیز ہوتا تھا۔ آج ہی خرم بھائی نے فون پر اطلاع دی تھی۔ وہ متفکر سی ہو گئی۔ اک متوقع اندیشے سے وہ اندر ہی اندر ہول رہی تھی۔ اماں بی کا اچانک بلاوا خالی از علت نہیں ہوتا۔

وہی ہوا جس سے وہ خوفزدہ تھی۔ سکتے کے سے عالم میں اماں بی کی باتیں سنتی رہی۔ انہوں نے اسے خوب ہی لتاڑا تھا کہ سر پر کوئی بڑا نہیں تو وہ ہسپتال میں معاشقے لڑاتی پھرتی ہے اور خوب باپ دادا کا نام روشن کر رہی ہے اور جب جی بھر کر بدنام ہو چکی تو صاحبزادی کو رشتہ بھجوانے کا خیال آیا۔

تمت کو اپنی سماعت پر اعتبار نہیں آتا تھا۔ اس میں تردید کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑے وہ ان کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اماں بی نے تو اس کی چٹ منگنی پٹ بیاہ کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ انہوں نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ تمہارے جیسی پچھل پائی کیلئے ایسا رشتہ بھی غنیمت ہے' عمر بھر عیش کرو گی کوئی سیٹھ ہارون تھے جو دل و جان سے اس سے شادی کرنے پر آمادہ تھا۔

سیٹھ ہارون کے نام سے اسے وہ ادھیڑ عمر سیٹھ یاد آئے جو ہسپتال میں اپنی پھوہڑ اور گنوار بیوی کے دکھڑے روتے نہیں تھکتے تھے اور اسی پر ضرورت سے زیادہ

مہربان ہو گئے تھے لیکن تمت نے بالکل حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ وہ کانپ کر رہ گئی۔ اماں بی نے تو اسے اچھی طرح سے سمجھا دیا تھا کہ یہیں سے عرضی بھیج کی چھٹی بڑھوالو بعد میں ملازمت کرنے دیں یا نہ دیں ان کی مرضی وہ تو نکاح کیلئے مجبور کر رہے ہیں۔

تمت مفلوج ہو گئی تھی اس کی زبان شل تھی۔ ان بے بنیاد الزامات کے جواب میں اسے ایک لفظ کہنے کا بھی یارا نہیں تھا۔ اماں بی نے الفاظ اس کے منہ پر کھینچ مارے۔

''مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی۔''

لرزتی ہوئی ٹانگوں پر وہ بمشکل اپنا بوجھ سنبھالے نہ جانے کس طرح اپنے کمرے میں پہنچی۔ جیسے صحرا میں بھٹکتا ہوا کوئی بے نوا مسافر ہو جیسے ظلمتوں میں گھری ہوئی کوئی مظلوم روح اس کا انگ انگ فریاد کر رہا تھا۔ اس کا رواں رواں احتجاج کر رہا تھا لیکن اس کی زبان گنگ تھی۔ الفاظ اس کا ساتھ نہیں دیتے تھے۔ اس کی خاموشی' اس کی مظلومیت کی سزا کتنی سنگین تھی۔ اسے معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا' اس کی ہڈی ہڈی پگھل جائے گی۔ وہ ریزہ ریزہ ہو جائے' وہ تنہا تھی وہ بے یار و مددگار تھی کسے پکارے' کسے آواز دے' کسے مدد کیلئے بلائے۔

دوسرے دن ابا میاں کو برآمدے سے گزرتے ہوئے دیکھ کر وہ اک امید لئے' اک آس لگائے ان کے پیچھے لپکی تھی۔ ابا میاں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا لیکن اس میں وہ شفقت اور وہ بھاری پن نہیں تھا جو اسے لاانتہا مسرتوں سے ہمکنار کراتا تھا جو اسے تحفظ کا احساس دلاتا تھا۔ وہ سہم سی گئی۔ گلے میں پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

''ابا میاں!'' آنسو رخساروں پر بہہ جانے کو بے تاب تھے۔ ابا میاں شاید اس کی کیفیت سمجھ رہے تھے۔ بردبار لہجے میں بولے۔

''تمت! بیٹا فکر نہ کرو۔ ماں باپ کے فیصلے اولاد کیلئے ہمیشہ بہتر ہوتے ہیں۔''

☆......☆......☆

وہ وہیں کھڑی رہی اور ابا میاں آگے بڑھ گئے۔ اس کا جی چاہا چیخ چیخ کر روئے۔ سارے جہان کو بتائے کہ وہ ان الزامات کی سنگینی میں ان فیصلوں کی سختی میں پس کر رہ گئی تھی۔ اس کو سیٹھ نہیں چاہیے تھا۔ اسے دولت سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ پیار کو ترستی رہی ہے۔ وہ پیار مانگتی ہے۔ صرف پیار کی نرمی سے' محبت کے سلیقے سے' چاہت کے قرینے' کوئی زہر بھی دے دے تو وہ سوچے بغیر پی جائے لیکن الزامات کا یہ نشتر وہ کس طرح برداشت کرے۔

وہ چھلنی چھلنی ہو رہی تھی۔ وہ لخت لخت ہو گئی تھی۔ وہ گھائل تھی لیکن اماں بی کے سامنے اس کی زبان نہیں ہلتی تھی۔ سہم کر وہ بدحواس سی ہو جاتی تھی۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہی اس کی ماں ہے۔ ماں جیسے محبت سے چھلکتے لفظ سے اسے ہی مخاطب کیا جاتا ہے۔ ان کے پاس تو سگی بیٹی کیلئے بھی ممتا نہیں تو انہیں ماں کیوں کہا جاتا ہے۔ دو راتوں سے وہ مسلسل جاگ رہی تھی۔ اس کا ذہن ماؤف تھا۔ جی چاہتا تھا کہ بہت سی خواب آور گولیاں کھا کر ہمیشہ کیلئے سو رہے تو شاید ممتا کی سوئی وادیوں میں کوئی پیار کی ہوک جاگ اٹھے۔ جان کا نذرانہ دے کر ہی وہ ماں کا پیار جیت لے۔ کاش!!!

نہ جانے کیا سوچ کر وہ غیر ارادی طور پر ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ بلاجھجک وہ اماں بی کے کمرے میں گھس گئی۔ اسے خود پر اعتبار نہیں تا تھا کہ اس میں اتنی جرأت کہاں سے آ گئی تھی۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

''اماں بی! میری ایک بات سنیے۔''

انہوں نے عینک ناک پر جما کر اسے دیکھا اور حیران ہوئیں۔

''کیا بات ہے؟'' انہوں نے بے نیازی سے استفسار کیا لیکن وہ جھجکی نہیں۔

بڑے مضبوط لہجے میں اعتماد سے بولی۔

''اماں بی! ڈاکٹر فرحان کے بارے میں جو باتیں مشہور کی گئی ہیں وہ سب غلط ہیں۔ آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں۔ آپ کو دوسروں کی باتوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ اگر انہوں نے رشتہ بھجوایا ہے تو ان کی مرضی میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔''

اماں بی نے کھا جانے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''زیادہ بڑھ بڑھ کے باتیں نہ بناؤ' سمجھیں۔ پہلے ہی خاندان کا نام بہت روشن کیا ہے تم نے۔''

ان کے سخت لہجے پر وہ گھبرائی نہیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی نہیں آئے۔ بے بسی کی انتہا نے اسے جرأت بخش دی تھی۔ اس تذلیل نے اسے دفاع پر مجبور کر دیا تھا۔ بڑے سکون سے گویا ہوئی۔

''آپ یا دوسرے لوگ کچھ بھی کہیں۔ میں نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس پر مجھے ندامت ہو۔'' اماں بی نے غور سے اس کی طرف دیکھا کہ یہ تمت ہی ہے جو جھکی ہوئی نگاہیں بھی نہیں اٹھاتی تھی۔ اس کے انداز سے بغاوت جھلکتی تھی۔ وہ کہتی گئی۔

''یہ سب باتیں جواد بھائی کے گھر والوں کی گھڑی ہوئی ہیں۔ انہوں نے کیوں گھڑی تھیں' یہ تو سب جانتے ہیں۔ میں نے کبھی کچھ نہیں کہا' کسی بات پر اعتراض نہیں کیا لیکن آج میں آپ کو اتنا بتانے آئی ہوں کہ میں سیٹھ ہارون سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔''

اماں بی آپے سے باہر ہو گئیں۔ ان کا حکم ماننے سے انکار بھی کیا تھا تو کس نے چھوٹی موٹی سی تمت نے جسے بات بھی کرنا نہیں آتی تھی۔ ڈپٹ کر بولیں۔

''دور ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔ ہارون سے تمہاری بات پکی ہو چکی ہے۔ آج کل میں وہ تاریخ لینے کیلئے آنے والے ہیں۔''

تمت اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ وہ پہلی سی تمت رہی ہی نہیں تھی۔ جان پر بنی تھی تو وہ مدافعت پر مجبور ہو گئی تھی۔ مجبوری کی انتہا نے اسے مزاحمت کا حوصلہ دیا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور فیصلہ کن انداز میں بولی۔

''مجھے افسوس ہے کہ سیٹھ ہارون کو مایوسی ہو گی۔'' کوئی بعید نہیں تھا کہ اماں

بی ہاتھ میں پکڑا سروتا اسے کھینچ مارتیں کہ وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ وہ ذرا سا کمرے سے باہر نکلتی تو سب کی نگاہیں اس پر مرتکز ہو جائیں۔ اماں بی اپنی انا کی شکست یوں آسانی سے کس طرح برداشت کر لیں۔ انہوں نے ہار کا لفظ سنا ہی نہیں تھا۔ انہیں ''نہیں'' کسی نے بھی نہیں کہا تھا لیکن تمت بھی اک عمر کی خاموشی کا حق آج ہی وصول کرنا چاہتی تھی۔ اماں بی کے سنگین الزامات اور توہین آمیز لہجے نے اس کی انا کو جگا دیا تھا۔ وہ جو چپکے چپکے رونے والی تھی۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں نکلا تھا۔ حالات کی بے رحم گردش نے اسے بات کرنا سکھا دیا تھا۔ سیٹھ ہارون اسے خوفناک عفریت کی طرح اپنی جانب بڑھتا نظر آتا تھا۔ وہ پناہ کی تلاش میں تھی۔ اس انجانے خوف نے اس کے اندر ایک آگ سی لگا دی تھی۔ وہ اس کی حدت سے بچنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی پرسکون زندگی کو روگ نہیں لگانا چاہتی تھی۔ ایک ایک پل وہ سولی پر گزار رہی تھی۔ سزائے موت کے قیدی کی طرح جس کے گزرے لمحے خوف وکرب کی ایک دگرگوں کیفیت لئے ہوئے ہوتے ہیں۔

رات گہری ہوئی تو اس نے اماں بی کو اپنے کمرے کے باہر بار بار چکر لگاتے دیکھا۔ وہ اکتا کر پلنگ پر جا لیٹی۔ دل ہی دل میں وہ گھر سے نکل جانے کے منصوبے بناتی رہی۔ کبھی چمن کی طرف سے نکل جانے کا سوچتی کبھی ساتھ کی کوٹھی کی باڑ کی اونچائی کا اندازہ لگاتی کہ وہ پھلانگی جا سکتی ہے کہ نہیں۔ پچھلی دو راتوں سے اس کی نیند اڑی ہوئی تھی لیکن آج پلکیں بوجھل ہوئی جاتی تھیں۔ ذہن پر ایک بوجھ سا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دل و دماغ پر ایک غنودگی سی چھا رہی ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی نیند کی ایک گہری کیفیت میں ڈوبتی چلی جاتی تھی۔ وہ کوشش کے باوجود اپنی مندی پلکیں کھول نہیں پاتی تھی۔ مجھے کیا ہو رہا ہے' یہ سب کیا ہے۔ اس نے نیند میں ڈوبتے ابھرتے سوچا اور ہولے ہولے بے خبر ہوتی گئی۔

اماں بی نے دبے پاؤں کمرے میں جھانکا۔ وہ کسی معصوم بچے کی طرح بے خبر سو رہی تھی۔ سوتے میں وہ بار بار سر پٹکتی تھی اور ناقابل فہم باتیں کر رہی تھی۔ ایک عجیب سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر ابھری۔ ''تمت بیٹی تو میری ہی ہے اور میرے ہی

مقابل آئی ہے۔"

کل سیٹھ ہارون نکاح کیلئے آ جائیں گے۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور دروازہ بختی سے بند کرتی ہوئی دبے پاؤں باہر نکل آئیں۔

گھٹن سے گھبرا کر اس نے آنکھیں کھولیں۔ یونہی کسلمندی سے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ گردوپیش پر ڈالی' کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس نے پریشانی سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور سکتے میں رہ گئی۔ وہ تو کسی کار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ باہر اندھیرا اور سناٹا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی بھاری بھرکم سا آدمی بیٹھا تھا۔ وہ مخبوط الحواس سی ہو رہی تھی۔ اس کے ہونٹ خشک تھے اور گلے میں پھندے سے پڑ رہے تھے۔ وہ یہاں کس طرح سے پہنچی تھی۔ اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ اس کار میں کس طرح آئی تھی اسے کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔

خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ کچھ دیر سر پکڑ کر بیٹھی لیکن ناقابل فہم حالات نے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب کر لی تھیں۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ تو رات کو اپنے کمرے میں شاید سو گئی تھی لیکن اس وقت تو رات کے خوفناک سناٹے میں وہ ایک انجانے شخص کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تھی۔ وہ نہ جانے اسے کہاں لئے جاتا تھا۔ یہ سب کیا ہے۔

گاڑی چلانے والے نے رفتار دھیمی کر کے ایک بار پلٹ کر دیکھا تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئی لیکن کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑی۔ اس کی زبان گنگ سی ہو گی تھی۔ گاڑی چلانے والے نے گاڑی سڑک کے ایک جانب ٹھہرائی اور اپنی سیٹ پر پلٹ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ سہم کر سمٹ گئی۔

"ڈاکٹر تمت! کیسی طبیعت ہے آپ کی۔"

تمت نے غور سے دیکھا اور سیٹھ ہارون کو پہچان گئی لیکن اس کیلئے یہ سمجھنا بہت مشکل تھا کہ وہ اس کے ساتھ کس طرح ہے۔ اس نے ایک بار پھر اسے مخاطب کیا تو وہ حواس مجتمع کرتی ہوئی ڈرتے ڈرتے بولی۔

"میں —— میں آپ کے ساتھ کس طرح ہوں؟"

"بس ایک حسین اتفاق سمجھ لیجئے۔" زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ تمت کی جان نکل

گئی۔ بے قراری سے ہاتھ مسلتی ہوئی بولی۔

"مہربانی فرما کر مجھے گھر پہنچا دیجئے۔" انہوں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف یوں بڑھایا جیسے اس کا ہاتھ تھامنا چاہتے ہوں۔ تمت سمٹ کر دروازے سے جا لگی۔ وہ ہنس دیئے۔

"آپ ہم سے جتنا دور بھاگتی ہیں قسمت آپ کو اتنا ہی ہمارے قریب لے آتی ہے۔"

"مجھے کچھ نہیں سننا' آپ مجھے گھر پہنچا دیں۔" اس نے لرز کر کہا۔

"آپ کو سوتے میں چلنے کی عادت ہے۔" اس نے تمت کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "مین روڈ پر آپ بیچ میں چلتی آ رہی تھیں۔ ہم نے ہارن دیئے لیکن ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ ہم نے اتر کر دیکھا تو آپ تھیں لیکن نیند میں چل رہی تھیں۔ یہ بھی شکر کیجئے کہ ہم نے اتفاق سے آپ کو دیکھ لیا ورنہ کسی ایکسیڈنٹ کے علاوہ بھی یہ خطرہ تھا کہ آپ غلط لوگوں کے ہاتھ نہ پڑ جائیں۔"

تمت کو جھرجھری آ گئی۔ سونے سے پہلے وہ گھر سے نکل بھاگنے کے متعلق سوچ رہی تھی اسی لئے نیند میں نہ جانے وہ گھر سے کس طرح نکل پڑی تھی اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلا تھا۔

سہمی سہمی سی بولی۔ "مجھے تو عادت نہیں' یہ پہلا اتفاق ہے۔"

"حیرت ہے لیکن خوشگوار حیرت ہے۔ میں شاید اس سے بڑھ کر کوئی اور تمنا نہیں کر سکتا تھا۔"

تمت نے عجلت سے کہا۔ "آپ پلیز مجھے گھر پہنچا دیں' سب پریشان ہوں گے۔"

سیٹھ ہارون نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "پریشان کیوں ہونے لگیں' سب یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ آپ اپنے کمرے میں سو رہی ہیں۔"

تمت کانپ سی گئی۔ "یہ اچھی بات نہیں' آپ مجھے گھر پہنچا دیں۔"

"ضرور ضرور۔" وہ دروازہ کھول کر باہر نکلے اور پچھلا دروازہ کھول کر اس کے قریب آ بیٹھے۔ وہ سمٹ کر دروازے سے چپک گئی۔ خوف سے اس کی آنکھیں تارہ

بن گئیں۔ اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر وہ بے حد محظوظ ہوئے۔ پرشوق نگاہوں سے اس کی طرف تکتے ہوئے بولے۔

''ہمارے لئے اس سے بڑھ کر مسرت کے لمحے اور کیا ہو سکتے ہیں کہ ہم اپنی ہونے والی دلہن کے ساتھ چند خوشگوار لمحے گزار لیں۔ تمت! ہم سچ کہتے ہیں کہ ہم نے بہت سی لڑکیاں دیکھی ہیں لیکن آپ پہلی لڑکی ہیں جن کو ہم نے چاہا بھی ہے اور پوری سنجیدگی سے۔'' انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے قریب کر لینا چاہا۔ تمت نے کانپ کر ان کے ہاتھ جھٹکے اور دروازہ کھولنے لگی۔ اس بدمست سیٹھ ہارون کی کار میں بیٹھنے سے تو بہتر ہے کہ وہ اندھیری سنسان سڑک پر اتر جاتی۔

سیٹھ ہارون اس کا ارادہ بھانپ گئے۔ انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور اس پر جھکنے لگے۔ ان کا سانس شراب سے مسموم تھا۔ تمت کی گھگھی بندھ گئی۔ دیوانہ وار پیچھے ہٹتی ہوئی بولی۔

''ہارون صاحب! پلیز پلیز' مجھے پریشان مت کریں' آپ ..... آپ اپنے ہوش میں نہیں' ہٹ جائیے پیچھے۔''

وہ اس کی مزاحمت سے بے حد لطف اندوز ہو رہے تھے جیسے یہ سب ان کیلئے ایک بے حد انوکھی اور محظوظ کر دینے والی ادائیں تھیں۔ ان کی سرخ آنکھوں سے وحشت سی برس رہی تھی۔ بہکے ہوئے انداز میں بولے۔ ''کل کی تو بات ہے' کل آپ تمت ہارون ہو جائیں گی تو آج اتنا دور کیوں ہوتی ہیں؟''

تمت کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اس کے حواس جواب دیتے جاتے تھے لیکن ان کی گرفت آہنی تھی۔ وہ ہانپ کر رہ گئی۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر ہنس کر خود ہی اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔

''آپ کو' ہم سے اتنا خوفزدہ تو نہیں ہونا چاہیے۔''

''آپ مجھے جانے دیں۔'' وہ بے بسی سے رو پڑی۔ خوف سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اس کی حالت قابل رحم تھی۔ سیٹھ ہارون کو یہ سہمی ہوئی سی کانپتی ہوئی تمت بڑی انوکھی معلوم ہوئی۔ دوشیزاؤں کا یہ شرمیلا روپ' یہ سہمی ہوئی مدافعت کتنی نئی

نئی تھی۔ انہیں ضبط کرنا محال ہو گیا۔ ایک بار میں ہی انہوں نے اسے بازوؤں میں لینا چاہا لیکن وہ تڑپ کر الگ ہو گئی اور دونوں ہاتھوں سے انہیں پرے دھکیلتی ہوئے چلائی۔

''آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔''

دوسرے ہی لمحے اس نے بجلی کی سی تیزی سے دروازہ کھولا۔ بوکھلاہٹ میں باہر نکلتے ہوئے وہ گری بھی لیکن جلدی سے اٹھ کر سڑک پر بھاگتی چلی گئی۔ سیٹھ ہارون بھونچکے سے رہ گئے۔ اندھیری رات میں سڑک پر وہ تنہا لڑکی بھاگی چلی جاتی تھی۔ خوف کی شدت میں وہ معمول سے بھی تیز بھاگ رہی تھی۔ سیٹھ ہارون کو بھاری بھرکم جسم کے ساتھ اس کا پیچھا کرنا بہت مشکل تھا۔ لشم پشتم انہوں نے کار کی اگلی سیٹ پر آ کر گاڑی سٹارٹ کی۔

اپنے پیچھے گاڑی کی روشنیاں دیکھ کر وہ ساتھ کی پگڈنڈی پر اتر گئی۔ سیٹھ ہارون بھی گاڑی روک کر اس کے پیچھے لپکے' وہ تو دیوانے ہو گئے تھے۔ دو چار قدموں میں ہی اسے جا لیا۔ خوف سے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

سیٹھ ہارون کو اس کی معصومیت پر ترس آ گیا۔ اندھیرے اجالے میں لرزتی ہوئی وہ کمزور سہمی ہوئی لڑکی اس ڈاکٹر سے کتنی مختلف تھی جس کے ہمدرد چہرے نے ان کے دل میں اس احساس محبت کو جگایا تھا جو ان کے دل میں کبھی بیدار نہیں ہوا تھا۔ انہیں اپنے رویئے پر بھی ندامت ہوئی کہ اس بے ضرر سی ہستی کو انہوں نے کتنا خوفزدہ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر تمت وہ پہلی لڑکی تھی جس کی عزت کرنے پر وہ خود کو مجبور پاتے تھے۔

انہوں نے اس کے جڑے ہاتھ محبت سے تھام لئے اور ملائمت سے بولے۔

''تمت! ہمیں اپنے رویئے پر ندامت ہے' کیا ہم امید رکھیں کہ آپ درگزر کر دیں گی۔''

تمت نے بدک کر ہاتھ چھڑا لیے۔ کچھ حیرت و نفرت کے جذبات لئے ان کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ اور بھی شرمندہ ہوئے۔ سہج سہج کر بولے۔

''تمت! ہم واقعی سخت شرمندہ ہیں۔ پلیز آپ اس تلخ واقعہ کو بھول

جائیں۔"

تمت اب بھی خاموش تھی۔ اس کا دماغ ماؤف تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سیٹھ ہارون کیا کہہ رہے ہیں اور کیوں کہہ رہے ہیں۔ اس کے ذہن میں صرف اور صرف سیٹھ ہارون کے چنگل سے خود کو چھڑانا تھا۔

"چلئے میں آپ کو گھر پہنچا دوں' مجھ پر اعتماد کیجئے۔" انہوں نے اس کے شانے کو چھو کر اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ تمت نے تڑپ کر ان کا ہاتھ جھٹکا اور سہم کر الٹے قدموں پیچھے ہٹتی ہوئی بولی۔

"مجھے آپ سے ڈر لگتا ہے۔"

سیٹھ ہارون کیلئے اس سہمی ہوئی سی ننھی لڑکی کی ہر ادا انوکھی تھی۔ انہیں خود سے نفرت ہونے لگی۔ وہ اپنی حرکتوں پر خجل سے ہو گئے۔ وہ ایک معصوم اور شریف لڑکی تھی۔ انہیں اس کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا۔

شرم سے عرق عرق ہو کر بولے۔ "تمت! ہم آپ کو کس طرح یقین دلائیں کہ ہم اپنے رویے پر کس قدر نادم ہیں۔ اب آپ آنکھ بند کر کے ہم پر اعتماد کر سکتی ہیں۔ آدھی رات کو اس سنسان سڑک پر آپ کا تنہا رہنا ٹھیک نہیں۔"

تمت نے اب بھی کچھ نہیں کہا اور سر جھکا کر چپ چاپ چلتی گئی۔ سیٹھ ہارون نے کچھ کہنا چاہا لیکن مصلحتاً خاموش رہے۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ کس طرف جاتی ہے۔ تمت نے ان کی کار کے قریب جا کر اس کا دروازہ کھولا اور پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ سیٹھ ہارون کے دل کا بوجھ ایک دم کم ہو گیا۔ وہ بھی خاموشی سے ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھے اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔

"تمت! بہتر ہے کہ آپ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی جائیے۔ کسی کو اس بات کی خبر نہ ہو تو اچھا ہے۔ اس رات کے بارے میں آپ سب کچھ بھول جائیے۔" ان کے گھر کے قریب پہنچ کر انہوں نے پیچھے مڑ کر کہا۔

تمت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دروازہ کھولا اور اتر گئی۔ سیٹھ ہارون دیکھتے رہے۔ وہ گھر کے پچھلے گیٹ کی طرف چلی گئی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوئی تو انہوں نے کار اسٹارٹ کر دی۔

دوسری صبح سب کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ تمت غائب ہے۔ سارے گھر میں دیکھ ڈالا لیکن وہ کہیں موجود نہیں تھی۔

صمدانی صاحب کو جیسے سکتہ ہو گیا اور اماں بی کے دل میں ہول اٹھ رہے تھے۔ کوئی کلیجہ نوچے دیتا تھا۔ پہلی مرتبہ انہیں دل کے کسی گوشے میں محبت کی ایک ٹیس سی جاگتی معلوم ہوتی تھی جو انجانی تھی لیکن کتنی اذیت ناک تھی۔

یہ بات تو انہوں نے بھی تک کسی کو نہیں بتائی تھی کہ رات انہوں نے اسے نیند کی دوائی کھلائی تھی۔ اسے اپنے کمرے میں گہری نیند سوتے انہوں نے خود دیکھا تھا۔ پھر نہ جانے وہ رات کو اٹھ کر کہاں چلی گئی تھی۔ لڑکی کی ذات سو طرح کے اندیشے انہیں چکرائے دیتے تھے۔ نجانے کیوں انہیں تمت اس قدر اچھی لگنے لگی تھی۔ وہ بار بار یاد آتی تھی۔ دوسری طرف سیٹھ ہارون کی پریشانی تھی۔ انہیں آج شام کو آنا تھا' انہیں کیا جواب دیا جاتا۔

صمدانی صاحب سے کہا تو وہ اور بھی برہم ہوئے۔ "تم نے خود ہی رشتہ طے کیا تھا' اب خود ہی بھگتو۔ مجھے تو لڑکی کی فکر کھائے جاتی ہے۔ ہم نے اسے اتنا مجبور کیا کہ وہ گھر چھوڑنے پر آمادہ ہو گئی۔ اس پر کیا کیا الزامات نہیں لگائے گئے۔ اس نے بہت اچھا کیا جو ہمیں سبق سکھا گئی۔ ہم جو اس کی زندگی کو داؤ پر لگانے پر تل گئے تھے۔ تم خود ہی سوچو سیٹھ ہارون کے ساتھ اس کا کوئی جوڑ تھا۔ خدا کرے وہ اپنے ہوسٹل پہنچ گئی ہو۔ پتہ نہیں وہ کس وقت گھر سے نکلی ہے۔ اتنی پریشان ہے۔"

"خدایا! میری بچی کو حفظ و امان میں رکھنا۔" اماں بی نے یوں دکھے دل کے ساتھ دعا مانگی کہ صمدانی صاحب کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ انہوں نے حیرت سے اماں بی کی طرف دیکھا۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی عورت ہے جس کے دل میں تمت کیلئے محبت کی کوئی رمق نہیں پھوٹتی تھی۔

سیٹھ ہارون کو تمت کی بیماری کا بہانہ بنا کر بڑی مشکل سے ٹالا گیا تھا۔ وہ بھی خلاف توقع مان گئے تھے۔ مجرم جو تھے رات کو تمت کی حالت انہوں نے دیکھ رکھی تھی وہ اس کی غیر معمولی علالت کا ذمہ دار بھی خود کو ہی سمجھ رہے تھے اور جی ہی جی میں

پشیمان تھے اسی لئے انہوں نے زیادہ تعرض نہیں کیا۔

ایک ایک پل بھاری تھا۔ اس کا معصوم چہرہ آنسو بھری آنکھیں بار بار نگاہوں میں پھرتا تھا۔ اماں بی کو بھی کسی کل چین نہیں تھا لیکن دل کو یہ اطمینان تو تھا کہ وہ اپنے ہوسٹل چلی گئی ہوگی۔ صمدانی صاحب اس کے ہوسٹل جانے کیلئے تیار ہو گئے۔ وہ پچھتاوؤں کے گرداب میں چکرا رہے تھے۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ ایک پل میں اس کے ہوسٹل پہنچ جائیں۔ اسے گلے سے لگا لیں۔ اسے اتنا پیار کریں کہ اسے یقین ہو جائے کہ اسے سب چاہتے ہیں۔ اس کے دل کی بات پوچھیں۔ اسے بتائیں کہ اماں بی اس کیلئے کتنی بیقرار ہیں۔ اسی نے پتھر کو پگھلا دیا تھا۔ ممتا کی اک شدید ٹیس نے انہیں پچھاڑ دیا تھا۔

اسی لئے انہوں نے صمدانی صاحب سے کہا تھا کہ وہ جانے سے پہلے اس کے ہسپتال فون کر کے معلوم کر لیں کہ وہ وہاں ہے بھی کہ نہیں۔

صمدانی صاحب بھی نامعلوم اندیشے سے لرز گئے لیکن انہیں پورا اعتماد تھا کہ وہ اپنے ہسپتال کے علاوہ کبھی کہیں اور نہیں جائے گی اسی لئے انہوں نے بڑے اطمینان سے فون کیا لیکن یہ سن کر ان کا دل بیٹھ گیا کہ وہ ہسپتال نہیں پہنچی تھی۔ جتنی بار فون کیا وہاں سے یہی اطلاع ملی تھی کہ ڈاکٹر تمت ایک ہفتے کی چھٹی پر گھر گئی ہوئی ہیں۔

صمدانی صاحب ہوسٹل سے بھی ہو آئے تھے لیکن تمت کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ وہاں سب کو یہی علم تھا کہ اس نے ایک ہفتے کی چھٹی اور بھی بڑھوالی ہے لیکن وہ کہاں ہے کسی کو معلوم نہیں تھا۔

صمدانی صاحب حواس باختہ ہو گئے۔ سو طرح کے اندیشوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ دنیا کا چپہ چپہ چھان ماریں۔ تمت کا چہرہ کہیں تو دکھائی دے لیکن انہیں ایک قدم اٹھانا بھی محال تھا۔ کس کو بتائیں۔ کس سے پوچھیں۔ کس سے کہیں۔ بیٹی جیسی نازک چیز ان کی غفلت سے کھو گئی تھی۔

اماں بی اپنے کیے پر پشیمان تھیں اس کیلئے رو رہی تھیں۔ اسے یاد کر رہی تھیں۔ اب اس کی چاہت امنڈ امنڈ کر انہیں بے قرار کیے دیتی تھی۔ ممتا کی اس پکار کو

نارسائی کا گلہ تھا۔ انہیں کسی پل قرار نہیں تھا۔ صمدانی صاحب کی ایک ایک بات ان کے دل پر گہرے گھاؤ ڈال رہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

''اپنے کیے پر پشیمانی سے حاصل تم ہی نے اسے گھر چھوڑنے پر مجبور کیا ہے۔''

گھر بھر سولی پر لٹکا تھا۔ کسی دوسرے سے کہہ بھی نہیں سکتے تھے کہ بدنامی کا خطرہ تھا۔ لڑکی کا گھر سے نکلنا سو افسانوں کا عنوان بنتا۔ سیٹھ ہارون نے الگ ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ان کے ہر روز کے تقاضوں سے جان مصیبت میں تھی۔ یہ بھی اتفاق ہوا صمدانی صاحب نے انہیں کسی کلب میں نشے میں دھت دیکھ لیا۔ انہوں نے وہیں آڑے ہاتھوں لیا اور ان سے سارے تعلقات توڑ دیئے۔ وہ گھر بھی معذرت کیلئے آئے لیکن اماں بی نے خوب لتاڑا کہ میں اپنی شریف لڑکی کا ہاتھ ایک شرابی' جواری کے ہاتھ میں کیسے دے دوں۔ شریفوں سے تعلق جوڑنا تھا تو شریف بن کر آتے۔

اماں بی کو احساس جرم رہ رہ کر ستاتا تھا۔ اسے تو انہوں نے خواب آور گولیاں کھلائی تھیں۔ انہوں نے خود دیکھا تھا کہ وہ سوگئی تھی لیکن پھر کس وقت اٹھ کر وہ گھر سے نکل گئی۔ کس حالت میں ہوگی۔ یہی فکر انہیں کھائے جاتی تھی۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ اسے کہیں سے بھی ڈھونڈ لائیں اور کبھی خود سے جدا نہ کریں۔ ممتا کی پیاس ہر آن بڑھتی جاتی تھی لیکن سراب کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

گھر والوں نے کبھی اس سے اتنا تعلق ہی نہیں رکھا تھا کہ اس کی دوستوں کے پتے انہیں معلوم ہوتے۔ اس کی ملنے والیوں کی انہیں خبر ہوتی وہ گھر کی سب سے فالتو چیز تھی' کتنی غیر مطلوبہ جس کی کسی کو خواہش نہیں ہوتی لیکن اب وہ سب سے ضروری تھی۔ سب کی طلب تھی۔ سب کی آرزو تھی۔

گلاں کی آنکھیں خشک نہیں ہوتی تھیں۔ ابا میاں ان چند دنوں میں کتنے بوڑھے ہو گئے تھے۔ اماں بی کا چہرہ بھی کتنا اتر گیا تھا۔ نازی کو اب بھی اس سے کچھ خاص لگاؤ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اسے اماں بی پر حیرت ہوتی تھی کہ یکلخت انہیں تمت سے اتنی محبت کیوں ہوگئی تھی۔ اچانک وہ انہیں اتنی اچھی کیوں لگنے لگی تھی۔ رقابت کی

ایک لہر سی اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی وہ کتنی آزاد تھی۔ کوئی روک ٹوک نہیں وہ تو اماں بی کے فیصلے کی پابند بھی نہیں تھی وہ جو اتنی مسکین سی بنی رہتی تھی۔ کس طرح بغیر بتائے گھر سے نکل گئی اور اماں بی اس پر ناراض ہونے کے بجائے اس کیلئے تڑپتی تھیں۔ چھپ چھپ کر روتی تھیں ایک ہم ہیں کہ گھر کی چاردیواری میں قید۔ اماں بی کی ڈانٹ پھٹکار سنتے ہیں اور دم مارنے کی مجال نہیں۔

کال بیل بجانے کے بجائے کوئی دروازہ پیٹے دیتا تھا۔ ایک لمحے کو سانس بھی نہیں لیتا تھا۔ ٹائی کی گرہ لگاتے ہوئے وہ بڑبڑائے۔ ''یہ صبح ہی صبح کیا افتاد آ پڑی ہے۔ آتا ہوں بھئی آتا ہوں۔ ذرا دم تو لو۔'' انہوں نے جھنجھلا کر دروازہ کھول دیا اور بھونچکے سے رہ گئے۔

پشیمان چہرے کے ساتھ باہر تمت کھڑی تھی جس کے کپڑے میلے اور رنگت اڑی اڑی سی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ جیسے لڑھکتی ہوئی آگے بڑھی۔ دہلیز پھلانگ کر اس نے تیزی سے دروازہ بند کر دیا۔ ایک بار پھر پلٹ کر اس نے دروازے کی طرف دیکھا جیسے کسی کے آنے کا خطرہ ہو۔

وہ پریشان ہو گئے۔ ''تمو! کیا بات ہے۔''

اس نے پھر ایک بار دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔ انہوں نے اس کا بازو پکڑا۔

''تمت! کیا بات ہے بتاؤ تو سہی۔''

تمت نے ایک لمحے کو اجنبی سی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے ان سے لپٹ گئی۔ ''محسن بھائی! ہائے محسن بھائی۔'' اس کی ہچکیاں لحہ بہ لحہ بلند ہوتی جاتی تھیں۔ اس کی سسکیاں دلدوز تھیں۔ وہ بلند رو رہی تھی۔

محسن بھائی گھبرا کر اسے کمرے میں لے گئے۔ اس نے انہیں مضبوطی سے تھام رکھا تھا' وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ محسن بھائی کیلئے اس کی یہ دیوانگی حیرت ناک تھی۔ اس کے دکھ ان کیلئے ناقابل فہم تھے لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ہر ہچکی سے ان کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ وہ روتی جاتی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے شکستہ

الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ وہ کبھی کوئی نام پکارتی۔ خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھتی پھر اور بھی مضبوطی سے تھام لیتی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ڈر گئی ہے۔ خوف سے اس کی گھگھی بندھی جاتی تھی۔ محسن بھائی کیلئے اس کی دگرگوں حالت ناقابل فہم تھی۔ وہ ان کی بانہوں میں لرز رہی تھی۔ انہوں نے زور سے اسے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔ اس کی حالت اس ننھی سی بچی کی تھی جس نے خوفناک خواب دیکھ لیا ہو۔

وہ زور زور سے ہچکیاں لیتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہے جاتے تھے۔ محسن بھائی اسے تسلیاں دے رہے تھے۔ اس کے ہر آنسو سے ان کا دل پگھل جاتا تھا۔ اس کی ہر ہچکی پر ان کا دل ڈوب جاتا تھا۔ نجانے کب تک دکھوں کی زد میں رہے گی۔ یہ دکھی لڑکی اب تک غموں سے چھٹکارا نہیں پا سکی تھی۔ انہوں نے دکھ سے سوچا لیکن اس کی حالت غیر تو کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے چہرہ اوپر اٹھایا اور سہم کر بولی۔ ''محسن بھائی وہ۔ وہ سیٹھ ہارون ...... سیٹھ ہارون۔''

محسن بھائی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس کی سرخ آنکھیں' الجھے بال' میلے میلے سے کپڑے اور صبح ہی صبح ان کا دروازہ کھٹکھٹانا نہ جانے اس پر کیا بیت گئی ہے۔

انہوں نے عجلت میں پوچھا۔ ''کیا کہہ رہی ہو تم کون ہیں یہ سیٹھ ہارون؟''

''اماں بی کہتی ہیں ان سے شادی کر لو۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔

محسن بھائی نے اسے آرام سے صوفے پر بٹھا دیا۔ خود اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولے۔ ''تم تم گھبراؤ نہیں بالکل فکر مت کرو۔ میرے ہوتے ہوئے تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کی جا سکتی۔ جو تم کہو گی وہی ہو گا تم فکر نہ کرو۔ وہ اسے تسلی دینے لگے۔

وہ اب بھی ان کے بازو سے چپکی ہوئی ہانپ رہی تھی اور ان کی طرف یوں دیکھتی تھی جیسے پناہ کی طلب گار ہو۔ انہوں نے بار بار اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے۔ ''تمو مجھے ساری بات سناؤ مجھے حالات کا صحیح علم تو ہو۔''

تمت کچھ جھجکی' اٹکی' رکی پھر اس نے اپنا دکھوں سے بھرا دل کھول کر ان کے

سامنے رکھ دیا۔ وہ اک ذرا ذرا سی بات انہیں سناتی چلی گئی۔ خود پر بیتے اذیت ناک لمحوں کی ہر اذیت اس نے گنوادی۔

محسن بھائی حیرانی سے اس کی اک اک بات سنتے چلے گئے۔ دکھ اور اذیت سے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ انہوں نے مغموم ہو کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور اسے بچوں کی طرح تھپکتے ہوئے بولے۔ ''تمت اب تم میری ذمہ داری ہو۔ میں جب تک تمہیں تمہارے اپنے گھر میں خوش نہیں دیکھ لیتا' مجھ پر جینا حرام ہے۔ تم فکر مت کرو جب تک میں موجود ہوں کوئی تم سے تمہاری خوشیاں نہیں چھین سکتا۔''

تمت کو یوں محسوس ہوا جیسے ان کے اک اک لفظ سے طمانیت و سکون کی پھوار سی پڑ رہی ہے جس میں بھیگتی وہ پھر جی اٹھی ہے ان کے پہلو میں بیٹھے ہوئے اسے تحفظ کا ایسا احساس ہوتا تھا جیسے ساری دنیا کی نگاہوں سے محفوظ ہو گئی ہو۔ دکھوں کے سارے گھاؤ بھرتے جاتے تھے۔ غم کے زخم مندمل ہو رہے تھے۔

محسن بھائی نے گھڑی دیکھی۔ ''ارے تمو میں تو ایک گھنٹہ پورا لیٹ ہوگیا۔

وہ اٹھنے لگے۔ تمت نے سہم کر ان کا بازو تھام لیا۔ ''محسن بھائی آپ مجھے چھوڑ کر نہ جائیں۔ میں مر جاؤں گی۔''

''خیر تم اتنی سستی نہیں ہو کہ محسن بھائی کے ہوتے ہوئے مر جاؤ۔'' انہوں نے مزاحیہ انداز میں اس کی ناک مروڑی۔ تمت بچوں کی طرح خوش ہوئی اور اپنائیت سے اس کا ہاتھ سہلانے لگی۔ انہوں نے ہولے سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا تمو مجھے جانے دو۔''

اس نے ان کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ ''اب ہسپتال سے تو تم نے چھٹی ایک ہفتے کی اور بھی لے لی اور ذرا سب کو خوب ڈانٹنے دو۔ ان سب کو اس ڈکٹیٹرشپ کی سزا ملنی چاہیے۔ انسان نہ ہوئے ان کے ہاتھ میں کھلونا ہو گئے۔''

وہ معصومیت سے ان کی طرف دیکھتی ہوئی بڑے غور سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

''چلو اٹھو۔ منہ ہاتھ دھو لو ناشتہ کرو' کپڑے تبدیل کرو۔ کیسی گندی بنی ہوئی

ہو۔''

''کپڑے تو میں لائی نہیں۔'' وہ گھبرا گئی۔ ''پھر؟''

''پھر میں ہوسٹل سے لے آؤں گی جا کر۔''

''ہوسٹل سے لے آؤں گی۔'' انہوں نے اس کی نقل اتاری۔ ''اور جوابا میاں تمہیں وہاں سے دبوچ لے گئے تب۔''

وہ سچ مچ خوفزدہ ہو گئی۔ تو وہ ہنسے۔ ''تم گھبرانا مت میں کوشش کروں گا کہ عذرا بھابی تمہارے پاس آ جائیں اچھا۔ فی الحال تو تم انہی کپڑوں سے ہی کام چلاؤ۔ آ کر تمہارے لئے کپڑوں کا انتظام کریں گے۔''

☆……☆……☆

''عذرا بھابی تو کوئی نہیں آئیں۔'' اس نے گلہ کیا۔

محسن بھائی اس کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے۔ ان کے سلیپنگ سوٹ اور فرغل نما ڈریسنگ گاؤن میں وہ کتنی مضحکہ خیز نظر آتی تھی لیکن اس کے چہرے پر رونق لوٹ آئی تھی۔ اب وہ پہلے جیسی تمت نظر آتی تھی۔

انہوں نے گاؤن کی ڈوری کھینچی۔ ''یہ تم کیا جوکر بنی ہوئی ہو۔''

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر شرماتی ہوئی ہنس پڑی۔ ''محسن بھائی میرے کپڑے سوکھے ہی نہیں۔ میں نے کہا تھا آپ کے آنے سے پہلے پہن لوں گی۔''

''چلو یہ پہن لو۔'' انہوں نے اس کی طرف بنڈل اچھالا۔ ''اور ہاں عذرا بھابی میکے گئی ہوئی ہیں فون تو یہاں ہے نہیں ورنہ تمہیں پہلے ہی بتا دیتا تم انتظار نہ کرتیں۔''

''ہائے محسن بھائی کپڑے پر آپ نے خواہ مخواہ پیسے ضائع کیے۔'' اس نے بنڈل کھول کر سلا سلایا کرتا شلوار دیکھا۔

''زیادہ بک بک نہ کرو پسند نہیں تو ویسے ہی بتا دو اب مجھے عورتوں کے کپڑے خریدنے کا تجربہ تو نہیں تمہیں آ تو جائے گا نا۔ میں نے سیلز گرل کو سمجھایا تو بہت تھا کہ میرے کندھے سے بھی چھوٹی۔ اتنی سی ذرا بچی ہے اس کیلئے کوئی کپڑے دے دو۔''

تمت خوشی سے مسکائی۔ میں نے کب کہا کہ مجھے پسند نہیں اتنے اچھے کپڑے ہیں۔ رنگ بھی بہت پیارا ہے مجھے آ جائے گا بالکل ٹھیک۔''

''تو پھر اٹھو جلدی سے اپنا حلیہ درست کر کے آؤ کوئی ملنے والا آ جائے تو کیا کہے۔''

وہ پیروں سے گھسٹتا گاؤن سنبھالتی چلنے لگی۔ پھر رک کر بولی۔ محسن بھائی پہلے میں آپ کیلئے کھانا تو نکال دوں۔''

محسن بھائی کو اس کے متفکر چہرے پر مامتا نکھرتی معلوم ہوئی۔ وہ جو ہوٹلوں میں کھانا زہر مار کرنے کے عادی تھے ان کیلئے یہ گھریلو انداز کیسا انجانا اور انوکھا تھا۔ وہ پیار سے اس کی طرف دیکھ کر ہنس دیئے۔ ''میں کپڑے تو تبدیل کر لوں۔ پھر کھاتے ہیں۔''

وہ جب تک منہ ہاتھ دھو کر گھر کے کپڑے پہن کر باہر نکلے اس وقت تک وہ میز بھی لگا چکی تھی اور جلدی جلدی پانی کا جگ لئے ہوئے بھاگی آتی تھی۔ محسن بھائی کو گلابی شلوار کرتے میں وہ معمول سے زیادہ دلکش نظر آئی۔ اپنے خریدے ہوئے کپڑے اس کے جسم پر دیکھ کر انہیں کتنی خوشی ہو رہی تھی۔ انہیں حیرت ہو رہی تھی کہ کپڑے اس کے اوپر کتنے سجے تھے۔

''واہ بھئی یہ اتنا کچھ سب تم نے پکایا ہے۔'' انہوں نے بھری ہوئی میز کی طرف دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔ وہ شرما کر مسکرائی۔ اس کی آنکھیں مسرت سے چمک رہی تھی۔ انہوں نے اک نگاہ میز پر ڈالی کتنی ہی ڈشیں تھیں یہاں تک کہ سویٹ ڈش بھی موجود تھی۔ پھر اس کے دمکتے ہوئے سانولے چہرے کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں متاسف سے ہو گئے۔ یہ کتنی اچھی کتنے کام کی لڑکی ہے۔ لیکن اس کی کوئی بھی قدر نہیں کرتا۔

وہ خود کم کھا رہی تھی اور پلیٹیں بڑھا کر انہیں بڑے اصرار سے ہر چیز لینے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ جو ڈبل روٹی کے دو ٹکڑوں کے درمیان کوئی بھی چیز رکھ کر کھا لینے کے عادی تھے ان کیلئے اتنے خوش ذائقہ کھانے اس کا کھلانے کا اپنائیت بھرا انداز اور سلیقے سے آراستہ میز یہ سب کتنا عجیب اور نیا نیا تھا۔ ایسی گھریلو فضا سے وہ کبھی آشنا نہیں ہوئے تھے۔ ان کا جی چاہتا تھا وہ اسی طرح میز کے گرد بیٹھے رہیں اور یہ چھوٹی سی تمت انہیں یوں ہی اصرار سے کھلاتی رہے۔ اس کے انداز میں کتنا والہانہ پن'

شفقت اور ممتا تھی۔

انہوں نے بڑی لگن سے اس کی طرف دیکھا اور مزاحیہ انداز میں بولے۔

''اچھی ڈاکٹر ہو بھئی تم کہ مجھ اچھے بھلے کو بیمار کر کے رہو گی۔''

''ہاں' کبھی نہیں محسن بھائی کیوں؟'' وہ رسان سے بولی۔

''اب تم مجھے اتنا بے تحاشہ کھلاتی چلی گئیں تو پھر بستر سے بھی تم ہی اٹھانا۔''

وہ یوں محظوظ ہو کر ہنسی جیسے بچوں کی بھولی بات پر بے ساختہ ہنسی آ جاتی ہے۔ اس کے انداز میں بچگانہ بھول پن کے بجائے بزرگانہ التفات جھلک رہا تھا جیسے اک بڑے کنبے کی سربراہ ہو۔ جیسے کوئی بڑی اہم ذمہ داری نبھا رہی ہو۔'' اس نے سلیقے سے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''محسن بھائی چائے پئیں گے کہ کافی۔'' انہوں نے سر کرسی کی پشت پر ٹیک دیا اور ٹانگیں پھیلاتے ہوئے آنکھیں بند کر کے بولے۔'' کافی!!!''

''تمت کی بچی تم میری ساری عادتیں خراب کر دو گی۔'' کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے بڑے سلیقے سے آراستہ میز پر نگاہ ڈالی جہاں نیپکن تک صفائی سے تہہ کئے ہوئے رکھے تھے۔

''کیوں محسن بھائی۔'' تمت پریشان ہو گئی۔

''مجھے ایسے باقاعدہ انداز میں اچھے اچھے کھانے کھانے کی عادت پڑ گئی تو پھر روکھے سوکھے سینڈوچ میرے حلق میں اٹکیں گے تم وہاں اپنے مریضوں کو نپٹاؤ گی کہ یہاں چولہا جھونکو گی۔''

تمت نے اطمینان کا سانس لیا۔ محسن بھائی کو خوش دیکھ کر وہ بھی خوش ہو گئی۔ نیپکن تہہ کرتی اور کھولتی ہوئی اک بچی لگن سے بولی۔ ''محسن بھائی قسم سے آپ کیلئے تو میں دونوں کام کر دوں۔''

محسن بھائی نے اس چھوٹی سی پرخلوص لڑکی کی طرف دیکھا جس کے انداز اک مدبر خاتون خانہ کے سے تھے اور ہنس پڑے۔ ''نہیں تمو بس اتنے ہی دن بہت ہیں تم نے مجھے اک گھر کے سکون سے آشنا کر دیا ہے' تم چلی جاؤ گی تو میں بیچارا تمہیں یاد کیا کروں گا کہ اتنی اچھی سی لڑکی تمت تھی۔ مجھے ایسے مزے مزے کے کھانے کھلاتی تھی۔''

تمت کے چہرے پر دھنک کے ساتوں رنگ کھل گئے۔ اس کی آنکھیں ستاروں سے چمک اٹھیں۔ اس کے ہونٹ یوں لرز کر رہ گئے جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن کہہ نہ پاتی ہو۔

محسن بھائی پلیٹ پر جھکے کھانے میں مصروف تھے وہ بہت کم کھاتی رہی اور بار بار ان کی طرف دیکھتی رہی۔ جیسے ان سے کوئی بات کہنا چاہتی ہو لیکن جھجک زبان پکڑ لیتی ہو۔ محسن بھائی کو شاید بہت بھوک لگ رہی تھی وہ رغبت سے کھاتے رہے۔ اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔

کافی کی پیالی لے کر وہ صوفے پر بیٹھے تو تمت صوفے سے ٹیک لگا کر قالین پہ بیٹھی کوئی کتاب دیکھنے لگی۔ وہ اخبار دیکھتے رہے۔

''کوئی آیا تو نہیں تھا۔'' انہوں نے چسکی لے کر کہا۔

''نہیں...... کوئی بھی نہیں۔'' وہ کھوئی کھوئی سی بولی۔

''تمہاری چھٹیاں کتنی رہ گئیں؟''

''بس تین چار۔'' اس نے عجیب سی حسرت سے کہا۔ خیر ان دنوں بہت لطف رہا ہے۔ اچھا ہے تمہاری آؤٹنگ بھی ہو گئی۔ سب لوگ تمہیں ڈھونڈتے تو ہوں گے۔''

اس نے سہم کر چہرہ اٹھایا۔ ''محسن بھائی اماں بی بہت ناراض ہوں گی۔''

''وہ یوں بھی تم سے کونسا خوش رہتی ہیں۔''

تمت دکھی سی ہو گئی۔ پھر فگار سے لہجے میں بولی۔ محسن بھائی مجھے بغیر بتائے نہیں آنا چاہئے تھا۔ ہیں نا سیٹھ ہارون جب مجھے چھوڑ کر گئے تھے تو مجھے گھر چلا جانا چاہئے تھا۔''

''اور دوسرے دن اسی مردود سے نکاح بھی پڑھوا لینا چاہئے تھا ہیں نا۔'' محسن بھائی نے تلخی سے کہا تو تمت نے گھٹنوں پر سر رکھ دیا اور کتنی ہی دیر یونہی بیٹھی رہی۔ انہوں نے چہرے سے اخبار ہٹایا۔ اسے اس طرح بیٹھے دیکھ کر انہیں تعجب ہوا۔ اس کا شانہ ہلا کر بولے۔ ''تمو...... تم کیوں مراقبے میں چلی گئیں۔''

وہ اسی طرح بیٹھی رہی تو انہوں نے اس کا سر اٹھانا چاہا اور پکارے۔

"تمت!"

اس نے چہرہ اٹھایا جو آنسوؤں سے بھیگا تھا۔

"تمت پھر تم نے رونا شروع کیا۔"

تمت نے جلدی سے آنسو خشک کیے اور بے بسی سے بولی۔ "محسن بھائی میں روؤں نہیں تو کیا کروں۔"

"چھی، چھی ...... چھی اور بھی بہت سے کام ہیں۔ اس رونے کے علاوہ۔" انہوں نے لاڈ سے اس کے بال کھینچے۔ "پلیز تم رویا نہ کرو مجھے دکھ دے کر تم بہت خوش ہوتی ہو ہیں۔"

"ہائے محسن بھائی کبھی نہیں۔" اس نے دونوں ہاتھوں میں ان کا ہاتھ تھام لیا۔ "صرف آپ نے ہی تو مجھے سمجھا ہے مجھے پناہ دی ہے مجھے محبت دی ہے۔ میرا اتنا خیال کرتے ہیں۔"

اس کی آنکھوں میں خلوص سیال بن گیا تھا۔ محسن بھائی کو اس دکھی سی لڑکی پر پیار سا آ گیا۔ وہ ہی تو ہے جس نے اس خشک اور بے آب و گیاہ زندگی میں بے لوث پیار کے شگفتہ پھول کھلائے ہیں۔ انہوں نے بڑے دلار سے اس کے گال میں انگلی دھنسائی۔

"تم اتنی ننھی منی سی بچی ہو۔ تمہارا تو خیال کرنا ہی پڑتا ہے۔"

وہ پھر خاموش ہو گئی۔ سر جھکا کر بیٹھی رہی۔ محسن بھائی پھر اخبار میں الجھ گئے۔ دفعتاً اس نے ان کی گود میں سر رکھ دیا۔ انہوں نے چونک کر اخبار ایک طرف ہٹایا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے اور چہرے کا رنگ ایسا عجیب ہو رہا تھا جیسے کسی اندرونی کرب سے سلگ رہی ہو۔

اس نے چہرہ گھما کر ان کی طرف دیکھا اور اٹکتی ہوئی جھجک جھجک کر بولی۔

"محسن بھائی آپ ...... آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔"

محسن بھائی جو پریشان ہو گئے تھے اس کی بات سن کر ہنس پڑے۔ "ارے پگلی یہ تو مجھے ...... بہت پہلے سے پتہ ہے۔"

"محسن بھائی آپ تو سمجھتے ہی نہیں۔" اس نے دونوں بازوؤں میں چہرہ چھپا

لیا۔

"ابھی تم کہہ رہی تھیں کہ صرف میں نے ہی تمہیں سمجھا ہے۔" وہ مزاحیہ انداز میں بولے۔ وہ اس کو ہنسانا چاہتے تھے۔ اس بیقراری اور مغموم سی کیفیت کو زائل کرنا چاہتے تھے جو اس پر چھائی تھی۔ تمت نے کچھ کہنے کیلئے سر اٹھایا۔ لیکن پھر ٹپٹا کر خاموش ہو گئی۔

"بھئی تمو آج تو خوب لطف رہا۔" محسن بھائی نے اطمینان سے ہنستے ہوئے کہا۔ تمت جو نہ جانے کس سوچ میں ڈوبی تھی سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ "کیا ہوا؟"

"یہ بھی خوب لطیفہ رہا میری کچھ سٹوڈنٹس نے تمہیں یہاں دیکھ لیا۔ انہوں نے کالج میں جا کر ہوائی اڑا دی کہ میں نے شادی کر لی ہے۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسے۔

"شادی؟ آپ نے کس کے ساتھ؟" تمت کچھ نہیں سمجھی۔

"کمال ہے بھئی تمہیں جو انہوں نے دیکھا تو میری مسز سمجھ لیا۔"

"پھر؟؟؟" وہ کھوئی کھوئی سی بولی۔

"پھر کیا۔" انہیں اس کی غیر معمولی خاموشی پر حیرت ہوئی۔ "مجھ سے پارٹی مانگ رہے تھے۔"

"آپ نے کیا کہا؟" وہ نہ جانے کیوں کرید رہی تھی۔

"کہنا کیا تھا۔ ان کی غلط فہمی دور کر دی۔ عجیب عادت ہے ہمارے یہاں لوگوں کی ذرا سا اشارہ مل جائے تو بات بناتے ہیں۔ سوچتے بھی نہیں۔"

"آپ کو برا لگا۔" اس نے پوچھا۔

"برا کیا لگنا تھا۔ ایسی اچھی بات بھی تو نہیں مجھے تو بلکہ ہنسی آ رہی تھی کہ اس عمر میں شادی کروں گا اور تمہارے جیسی ننھی منی لڑکی سے۔"

☆ ☆ ☆

تمت نے غور سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا لیکن وہ اخبار کی سرخیاں دیکھنے میں محو تھے۔ پھر عجیب سی حسرت سے بولی۔

''کیوں محسن بھائی۔ میں اتنی بری ہوں۔''

''کیا؟؟؟'' انہوں نے چونک کر کہا۔ نہ جانے انہیں غصہ کیوں آ گیا۔ قدرے تلخی سے بولے۔ ''پگلی ہوئی ہو' ہر بات کو منفی انداز میں نہ لیا کرو۔ دیکھو تم اپنی ذات کو اپنے لئے مسئلہ نہ بناؤ۔ اس طرح تو زندگی بہت دشوار ہو جاتی ہے۔ ہر بات کا مثبت پہلو دیکھنا چاہئے۔ یوں زندگی روشن ہو جاتی ہے۔''

تمت مغموم سی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر کچھ کھو دینے کا ملال تھا۔ اور آنکھوں سے محرومی جھانک رہی تھی۔ محسن بھائی کچھ دیر خاموش رہے۔ وہ اس چھوئی موئی سی بزدل لڑکی میں مدافعت کی قوت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر رو دینے والی اس لڑکی کو ہنسنے کا شعور سکھانا چاہتے تھے۔

وہ یوں روٹھی روٹھی سی بیٹھی تھی جیسے کسی بچے سے اس کا دل پسند کھلونا چھین لیا ہو۔ محسن بھائی کو اسے دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ ''چندا ناراض ہو۔''

وہ رو دینے کو تھی لیکن ہونٹ کاٹ کر ضبط کر گئی اور ہولے سے نفی میں سر ہلانے لگی۔ محسن بھائی نے دیکھا کہ وہ انگوٹھا چوس رہی ہے۔ وہ دکھی سے ہو کر سوچنے لگے اس ٹوٹی پھوٹی سی لڑکی کا کیا ہوگا جو ذرا ذرا سی بات کا کتنا اثر لیتی ہے۔ اچانک انہیں کچھ یاد آیا۔

''تمت ۔۔۔ مجھے اک بات تو بتاؤ۔''

''جی!!!'' اس نے سر اٹھایا۔

''تم پروفیسر نجیب علی کو جانتی ہو۔''

''نہیں تو۔''

بھئی اچھے خاصے خوش شکل ہیں۔ ایک بار کسی ایکسیڈنٹ کے سلسلے میں تمہارے زیر علاج بھی رہ چکے ہیں۔ انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ اب یاد آیا۔''

تمت کچھ دیر سوچتی رہی۔ ''مجھے یاد تو نہیں آ رہا۔ اتنے لوگ ہوسپٹل آتے ہیں۔ اب سب کے نام تو یاد نہیں رہتے۔ شاید دیکھوں تو یاد آ جائے۔''

''ہوں!!!'' محسن بھائی نے لمبی سی ہوں کی۔ ''ویسے اچھے معقول آدمی ہیں بہت قابل۔ بڑے ذمہ دار' بے حد اچھے دوست ہیں۔''

تمت نے غور سے ان کی طرف دیکھا کہ وہ پروفیسر نجیب کی تعریف پر کیوں تلے ہیں۔

''تم بھی انہیں دیکھو تو پسند کرو۔ بڑے پیارے انسان ہیں۔ تمت انہوں نے تمہیں پرپوز کیا ہے۔''

''جی؟؟؟'' تمت کیلئے یہ غیر متوقع تھا۔

''میرا خیال ہے کہ تم ایک بار ان سے مل لو اور اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لو تو میں ماموں جان سے خود بات کر لوں گا۔ مجھے ڈر ہے کہ ممانی بیگم سیٹھ ہارون کو ہاتھ سے جانے نہیں دیں گی۔''

تمت کے چہرے سے یوں ظاہر ہوتا تھا جیسے کوئی ناگوار بات سن رہی ہے۔ محسن بھائی مفاہمت کے انداز میں کہنے لگے۔ ''میری سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ تمہیں زندگی کا اچھا ساتھی مل جائے۔ پروفیسر نجیب میرے ساتھ پانچ سال سے کام کر رہے ہیں۔ میں انہیں ہر طرح سے تمہارے لئے مناسب سمجھتا ہوں۔'' لیکن فیصلہ تو تم ہی کو کرنا ہے۔''

تمت یوں سہمی ہوئی سی بیٹھی تھی جیسے اس کی موت کا فیصلہ سنایا جا رہا ہو۔ اس کے دل کا کرب چہرے سے عیاں تھا۔ جیسے کچھ ضبط کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ محسن بھائی نے ملائمت سے پوچھا۔

''ہاں تمت مجھے تم اپنا دوست سمجھو بتاؤ تمہارا کیا خیال ہے۔ اس بارے میں۔''

بہت سارے آنسو تمت کی آنکھوں میں چھلک آئے۔

''محسن بھائی ۔۔۔ محسن بھائی وہ سسکیاں روکتی ہوئی بولی۔ مجھے کسی کے ساتھ شادی نہیں کرنی۔ بالکل نہیں کرنی۔ بالکل نہیں کرنی۔'' اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپا اور دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔

محسن بھائی ششدر سے اسے پکارتے رہ گئے۔

☆ ..... ☆ ..... ☆

کتاب دیکھتے دیکھتے ان کی آنکھ جھپک گئی۔ یونہی آہستہ سے انہوں نے

غیر ارادی طور پر آنکھیں کھولیں تو تمت کو دروازے پر کھڑے تھا۔ وہ نیند میں تھے اس لئے صحیح صورتحال سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ وہ دبے پاؤں چلتی ان کے بستر تک آ گئی۔ وہ چپکے پڑے رہے۔

شام کو اس کے رویے نے انہیں پریشان کر دیا تھا۔ اس کی سوجی ہوئی آنکھیں اور اکھڑا اکھڑا لہجہ کچھ چھپانے کی کوشش۔ وہ کئی اندیشوں سے لرز کر رہ گئے۔ اسی لئے خاموشی سے اسے چوری آنکھ سے دیکھتے رہے کہ وہ کیا کرتی ہے۔ اس نے ہولے سے جھک کر ان کا چہرہ دیکھا وہ جھٹ سوتے بن گئے۔ تمت نے بڑی احتیاط سے ان کی پڑھنے کی عینک اتاری۔ ان کے سینے پر پڑی کتاب اٹھا کر میز پر رکھی۔ ان کا کمبل درست کیا۔ محسن بھائی کو یہ سب کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے انداز میں کتنی مامتا تھی۔ کتنی اپنائیت تھی۔

پھر انہیں اپنی پیشانی پر اس کے نرم نرم ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا پھر اس کی سانس ان کے چہرے سے ٹکرائی۔ وہ شاید جھک کر ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ یوں جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ وہ پریشان سے ہو گئے۔ نہ جانے اس کو کیا ہو گیا ہے۔ پہلے تو وہ ہر بات مجھ سے کہہ دیا کرتی تھی۔ لیکن اب کیا چھپانا چاہتی ہے۔ ان کا جی چاہا کہ آنکھ کھول کر اس کا چہرہ دیکھیں۔ شاید وہ اس کے چہرے سے کچھ پڑھ سکیں۔

کوئی گرم گرم نم چیز ان کی پیشانی پر گری۔ شاید اس کا آنسو وہ ابھی یہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ آنکھیں کھولیں یا نہیں کہ دوپٹے کے نرم آنچل سے اس نے ان کی پیشانی ہولے سے پونچھ دی۔ محسن بھائی ضبط نہیں کر پائے۔ انہوں نے عجلت میں آنکھیں کھول دیں۔ اس کی خوف سے چیخ نکل گئی۔ وہ پچھلے قدموں ہٹتی گئی۔ وہ جلدی سے اٹھ گئے۔

اس کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ وہ بار بار ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔

''تمت کیا بات ہے۔ یہاں آؤ میرے پاس۔ لیکن آنکھیں آنسوؤں سے خالی تھیں۔

''تمت کیا بات ہے؟'' انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ نہ معلوم اس لڑکی کو کیا

ہوتا جاتا ہے۔ وہ پریشان ہو گئے تھے۔

''کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔'' وہ سر جھٹکتی ہوئی بولی اور پردہ اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ محسن بھائی سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ یہ لڑکی تو الجھتی جا رہی ہے۔ معمہ بن گئی ہے۔

''تمو میرا خیال ہے کل پروفیسر نجیب کو چائے پر انوائٹ کر لوں۔''

تمت کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے۔ محسن بھائی نے جان بوجھ کر پھر کہا۔

وہ اس کا ردعمل دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے رات کا واقعہ بھی نہیں دوہرایا۔

''ویسے ان سے مل لینے میں کیا حرج ہے۔''

''محسن بھائی مجھے کسی سے نہیں ملنا بس۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''یہ بھی خوب رہی۔ ارے بابا تمہیں سیٹھ ہارون کچھ زیادہ پسند آ گئے ہیں۔ اتنا سن لو ایک دن تم ہوسٹل گئی نہیں اور دوسرے دن ابا میاں تمہیں لینے پہنچے نہیں۔ وہ تو اسی انتظار میں ہوں گے کہ تمہاری چھٹیاں کب ختم ہوتی ہیں اور سیٹھ ہارون ان سے بڑھ کر نگاہیں فرش راہ کیے ہوں گے۔''

تمت نے کچھ کہا نہیں بس ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

''تمو سچ کہتا ہوں میں تمہارے لئے بہت فکر مند رہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی ہو۔'' انہوں نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

وہ اک عجیب سی کسمپرسی سے ان کی جانب دیکھ کر رہ گئی۔ وہ پھر کچھ کہنے ہی والے تھے کہ تمت جلدی سے اٹھ کر باہر چل دی۔ ''میں آپ کیلئے چائے لے کر آؤں۔''

حالات نے اسے کتنا دلبرداشتہ بنا دیا ہے۔ محسن بھائی مغموم سے ہو گئے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بات اس کے ہونٹوں پر آ کر رک جاتی ہے۔ اک انجانی جھجک اس کی گویائی چھین لیتی ہے۔ کاش میں اس کے دل میں جھانک سکوں۔ انہوں نے فکر مند ہو کر سوچا۔

''محسن بھائی محسن بھائی۔'' تمت بدحواسی میں بھاگتی ہوئی آئی۔ اس کے

چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ محسن بھائی گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''تمت کیا ہوا...... ؟'' اس کا فق چہرہ دیکھ کر انہوں نے کہا۔ تمت نے ان کا بازو تھام لیا اور جیسے ان کے پیچھے چھپی ہوئی بولی۔ ''محسن بھائی وہ آئے ہیں۔ وہ۔''

محسن بھائی بوکھلائے۔ ''کون ؟''

''ابا میاں آئے ہیں۔ ابا میاں۔'' وہ ہکلائی۔ ''میں ---- ان کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ بس نہیں جاؤں گی۔''

''اچھا ---- اچھا مجھے دیکھنے تو دو۔'' انہوں نے اپنا بازو چھڑایا۔

وہ ان کے بازو سے چپک گئی۔ ''بس بس محسن بھائی میں آپ سے شادی کروں گی۔ صرف آپ سے اور کسی سے نہیں کروں گی۔ نہیں کروں گی۔ ہرگز نہیں کروں گی۔ آپ ان سے کہہ دیں میں' میں آپ کے بغیر مر جاؤں گی۔ آپ' آپ ابا میاں سے کہہ دیں بے شک کہہ دیں میں صرف آپ سے شادی کروں گی۔'' وہ ایک ہی سانس میں کہتی چلی گئی۔

محسن بھائی بھونچکے سے رہ گئے۔ تمت کی حالت، دیوانوں کی سی تھی۔ نامعلوم سے خوف سے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ ان کے شانے سے لگی وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ ''محسن بھائی خدا کی قسم میں صرف آپ سے پیار کرتی ہوں۔ صرف آپ سے۔'' اس نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔ اس کے اقرار کا یہ انداز کتنا عجیب تھا۔ خوف کی شدت نے اسے دل کی بات کہہ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔

محسن بھائی تو بدحواس ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے اس انداز میں کبھی بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اب بھی روتی جاتی تھی اور بیدردی سے آنسو پونچھتی ہوئی بتجی نگاہوں سے بار بار ان کی جانب دیکھتی تھی۔ جیسے زندگی کی بھیک مانگ رہی ہو۔

☆......☆......☆

گھنٹی کی بار بار کی تیز آواز سے وہ چونک گئے۔ اسے عجلت میں پرے ہٹاتے ہوئے بولے۔ ''یہ رونا دھونا ختم کرو اور ماموں جان سے کوئی ایسی ویسی بات نہ کر بیٹھنا۔ خدا کیلئے اب خاموش ہو جاؤ۔''

انہوں نے دروازہ کھولا تو دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے کے دیکھتے رہ

گئے۔ صمدانی صاحب، ڈھلتی عمر کے ساتھ خود بھی ڈھل گئے تھے۔ محسن بھائی اک سنجیدہ اور پروقار سراپے میں ان کے سامنے کھڑے تھے۔ اتنے عرصے کی مفارقت نے ضبط کے جو بندھ باندھ رکھے تھے یک دم ٹوٹ گئے۔ صمدانی صاحب انہیں گلے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔ محسن بھائی نے ضبط سے کام لیتے ہوئے انہیں اطمینان دلایا کہ تمت یہیں موجود ہے۔ وہ ایک بار پھر ان سے لپٹ گئے۔

''محسن بیٹے تو نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ کہاں ہے تمت میری بچی۔ اندر تشریف لے چلئے۔'' محسن بھائی بھی انہیں اک عرصے کے بعد دیکھ کر عجیب سی خوشی محسوس کر رہے تھے۔ اپنے والدین کی ان دیکھی تصویر ان کی آنکھوں میں جھلک آئی۔

صمدانی صاحب تیزی سے دروازہ کھولتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ تمت جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''تمت میری بٹیا۔'' انہوں نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔

تمت لڑکھڑاتی ہوئی بڑھی اور ان کے سینے سے لگ گئی۔ اس کے بالوں پر چہرہ رکھ کر وہ ایک بار پھر رو دیئے۔ تمت کی چیخیں نکل گئیں۔ ''ہائے ابا میاں میں بہت بری ہوں۔'' وہ ان کے سینے سے چہرہ رگڑ رہی تھی۔

''بٹیا ---- اپنا گھر چھوڑ کر بھی کوئی جاتا ہے۔'' انہوں نے اسے بار بار پیار کرتے ہوئے کہا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی کچھ کہا نہیں۔

''بٹیا تیار ہو جاؤ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ تمہاری اماں بی بہت پریشان ہیں۔'' وہ خوفزدہ سی ہو کر ان سے الگ ہو گئی اور سہم کر بولی۔ ''ابا میاں میں' نہیں۔'' وہ اٹکی۔ ''میں نہیں' وہ' وہ' سیٹھ ہارون۔''

''نہیں بٹیا لعنت بھیجو اس مردود پر' تمہاری اماں بی' تو اب پچھتا رہی ہیں کہ انہوں نے یوں ہی تمہارے ساتھ سختی کی۔''

تمت ہکا بکا ہو گئی۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اندھیری رات میں سورج طلوع ہو گیا ہے۔

''ہاں' ہاں تمو بٹیا۔'' میں سچ کہہ رہا ہوں' تمہاری اماں کی مامتا اب جاگی ہے۔''

وہ حیرت سے ان کی طرف دیکھتی گئی۔ ابا میاں اب بھی بار بار اسے پیار کر رہے تھے۔

''تموٗ، تم صبح ان کے ساتھ چلی جاؤ۔'' محسن بھائی نے متاثر ہو کر کہا۔

وہ ہچکچائی۔ ''میری تو صرف دو چھٹیاں باقی ہیں۔''

''تو بیٹے، دوسرے دن واپس آ جائیں گے۔ تمہاری اماں تمہیں دیکھنے کیلئے بے قرار ہیں۔ محسن بھائی ہمارے ساتھ چلے گا۔ سب لوگ اسے عرصے بعد دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔'' محسن بھائی کے چہرے پر دکھوں کا سایہ سا لہرا گیا۔ ''ماموں جان میں ان دنوں مصروف ہوں۔ آپ کے ساتھ تو نہیں جا سکوں گا، میں پھر کبھی آ جاؤں گا۔'' اس گھر سے وابستہ تلخ یادوں کو تازہ کرنے کا ان میں حوصلہ نہیں تھا۔

''ایسی بھی کیا مصروفیت کہ تمہیں ایک دن کی چھٹی بھی نہ ملے۔ بس دوسرے دن تم تمت کے ساتھ ہی آ جانا۔''

محسن بھائی پس و پیش کرنے لگے تو تمت نے کہا۔ ''محسن بھائی آپ بھی چلئے نا۔''

''میں وہاں جا کر کیا کروں گا؟'' انہوں نے عجیب سے حیرت ناک لہجے میں کہا۔

''اوں ہوں، بیٹے، تمہیں اس طرح تو نہیں کہنا چاہئے۔ وہ بھی تو تمہارا گھر ہے۔''

محسن بھائی چپ سے ہو کر تمت سے بولے۔ ''تم چائے تو بنا کر لاؤ ماموں جان تھکے ہوئے آئے ہیں۔''

''ہاں بیٹا، چائے تو پلاؤ۔'' صمدانی صاحب نے اطمینان سے بیٹھے ہوئے کہا۔

تمت عجیب سی سرخوشی سے سرشار تھی۔ جیسے کوئی معصوم بچہ صبح سو کر اٹھے تو اسے پتہ چلے کہ آج عید ہے۔ اماں بی بھی اس کیلئے بے قرار ہو سکتی ہیں۔ اسے یقین نہیں آتا تھا لیکن دل پھول سا کھلا جاتا تھا جیسے منہ بند کلیوں پر شبنم پڑ رہی ہو۔

وہ بار بار مسکرا رہی تھی۔ ابا میاں اسے لینے آئے تھے۔ اپنی ہی نگاہوں میں

وہ کتنی اہم ہو گئی تھی۔ اس کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ وہ سرشاری کی ایک نرالی کیفیت میں چائے بنانے چل دی۔

صمدانی صاحب نے محسن بھائی سے باتوں میں الجھ گئے۔

☆ ☆ ☆

رات گئے تک صمدانی صاحب سے باتیں ہوتی رہیں۔ وہ انہیں پا کر کس قدر مسرور تھے۔ جیسے دو جہان کی دولت مل گئی ہو۔ بار بار کہتے تھے کہ انہیں بڑھاپے میں بیٹے کی ضرورت تھی اور انہوں نے بیٹا پا لیا ہے۔

محسن بھائی کو بھی اک خوشی تو ہو رہی تھی لیکن ان کا ذہن اس قدر الجھا ہوا تھا کہ وہ ان باتوں کا جواب بھی ٹھیک طرح سے نہیں دے پاتے تھے۔ تمت نے ان سے کیا کہہ دیا وہ چکرا کر رہ گئے تھے۔ وہ ابھی تک انہیں چھوٹی سی بچی معلوم ہوتی تھی۔ وہی بچپن کی معصوم تمت لیکن اب وہ انہیں اک بھرپور عورت کے روپ میں نظر آنے لگی تھی۔ وہ کچھ الجھ سے گئے تھے۔

وہ انہیں اچھی لگتی تھی بچپن سے اب تک وہ اس سے بے انتہا پیار کرتے رہے تھے۔ اس کی معصومانہ محبت میں کھو کر وہ اپنے دکھ، اپنی محرومیاں بھول گئے تھے لیکن وہ تو اسے ایک بزرگ کی طرح چاہتے تھے۔ اک سرپرست کی طرح اس کا خیال رکھتے تھے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی رہنمائی کرتے رہے تھے۔

تمام رات وہ سگریٹ پھونکتے رہے۔ بہت کچھ سوچتے رہے۔ شاید وہ وقتی طور پر ان کی ذات میں پناہ چاہتی تھی۔ سیٹھ ہارون کے رشتے اور گھر والوں کے رویئے سے خوفزدہ ہو کر وہ ان کی جانب مائل ہو گئی ہے۔ خدایا میں اس نادان لڑکی کو کس طرح سمجھاؤں کوئی سنے تو کیا کہے۔ وہ پشیمان سے ہو رہے تھے۔ میں صبح ہی پروفیسر نجیب کی بات ماموں جان سے کر دوں گا۔ جتنی جلد یہ کام ہو جائے اچھا ہے۔ بار بار کی محرومیوں نے اسے بدحواس کر دیا ہے۔ وہ اب بھی اس کے بارے میں بزرگوں کی طرح سوچ رہے تھے۔

انہیں کچھ اطمینان ہوا تو صبح کا نور چاروں طرف بکھر رہا تھا۔ وہ کمرے سے باہر آئے اور برآمدے میں ٹہلنے لگے۔

کھلی فضا میں دل کا غبار چھٹ گیا۔

''محسن بھائی آپ مجھ سے ناراض ہیں؟''

انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ تمت متفکر سا چہرہ لیے کھڑی تھی۔ ان کا جی چاہا کہ اسے کہہ دیں کہ وہ ان کے سامنے نہ آئے اس کا یہ روپ ان کیلئے ایسا انجانا تھا کہ وہ آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔ ان کا جی چاہا کہ اسے جھنجوڑ کر کہہ دیں کہ مجھ سے ایسی محبت نہ کرو جو مجھے اپنی ہی نگاہوں میں مجرم بنا دے۔ وہ بالکل اس بزرگ کی طرح اس پر خفا تھے جس کو بچوں کی حماقت کا اچانک پتہ چلا ہو۔ اک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈال کر بجھے بجھے سے لہجے میں بولے۔ ''نہیں ...''

''پھر مجھ سے بولتے کیوں نہیں؟''

''بول تو رہا ہوں اور کس طرح بولوں۔'' وہ الجھ سے گئے تو تمت سہم گئی۔

''محسن بھائی میں آپ کو اچھی نہیں لگتی۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''ارے بابا لگتی ہو' اچھی لگتی ہو۔'' وہ چڑ کر بولے۔

تمت روہانسی ہو گئی۔ ''محسن بھائی پھر ... پھر آپ مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟''

''اوہو ...'' وہ پریشان ہو گئے۔ تلخی سے بولے۔ ''بھئی جو اچھا لگے اس سے شادی کرنے تو نہیں بیٹھ جاتے۔''

ان کے انداز پر وہ بھونچکی سی رہ گی۔ بے یقینی سے ان کی طرف دیکھتی رہی۔ آنکھوں میں آئے آنسو پیتی ہوئی بولی۔ ''محسن بھائی مجھے پتہ ہے آپ کو شبو آپا اچھی لگتی ہیں۔ میں تو بہت بری ہوں نا کسی کو بھی اچھی نہیں لگتی۔ میں آپ سے سچ کہتی ہوں میں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔ بس کبھی نہیں کروں گی۔ چاہے آپ مجھ سے شادی کریں نہ کریں۔ آپ کی مرضی۔ آپ بھی تو خوبصورت سی دلہن چاہتے ہوں گے؟''

محسن بھائی جھنجلائے۔ ''تم فضول باتیں نہ کرو۔''

تمت پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کھوئی کھوئی سی بولی۔ ''محسن بھائی میں کچھ نہیں کہتی میں تو صرف آپ سے پیار کرتی ہوں۔ آپ کو چاہتی ہوں۔ میں بہت پیار کرتی

ہوں۔ آپ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ اگر آپ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے تو آپ کی مرضی۔''

''اوہو!!!'' انہوں نے اس کے سادہ اور معصوم چہرے کی طرف دیکھا جو انہیں پہلے سے کہیں دلکش معلوم ہوا۔ اس کے لرزتے ہونٹ' جھپکتی آنکھیں اس کا کانپتا وجود سب ان کیلئے کتنے انجانے ہو گئے تھے جس کی پیشانی چومتے انہیں کبھی جھجک محسوس نہیں ہوئی تھی آج اسے چھونے کی ہمت بھی خود میں نہیں پاتے تھے۔ اس کا لہجہ کتنا مضبوط تھا۔ اس کے چہرے پر امید و ناامیدی کی دھوپ چھاؤں سی کھل رہی تھی۔

انہوں نے سر جھٹک کر خود کو سنبھالا اور نرمی سے بولے۔ ''تمت دیکھو میری بات سمجھنے کی کوشش کرو یہ کس طرح بھی مناسب نہیں ہے تم میری اور اپنی عمر کا فرق تو دیکھو۔''

''نہیں ... نہیں۔ محسن بھائی آپ جیسے بھی ہیں مجھے اچھے لگتے ہیں۔'' ان کی بات کاٹ کر دیوانگی سے بولی۔ اس کے لہجے میں بچوں کا سا ہٹیلا پن جھلکتا تھا۔

محسن بھائی ٹھٹک سے گئے۔ اس نادان لڑکی نے تو انہیں پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔

ذرا سختی سے بولے۔ 'تمت کتنی بری بات ہے۔ سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ تمہارے ابا میاں کیا کہیں گے کہ میں چھوٹی سی لڑکی کو ورغلا رہا ہوں۔ تم جہاں کہیں بھی ہو مجھے بہت عزیز ہو۔ مجھے بہت پیاری ہو۔ ضروری نہیں کہ تم مجھ سے شادی کرو۔ مجھے بس محسن بھائی سمجھو اور بس۔''

وہ بڑی حسرت سے ان کی طرف دیکھتی ہوئی زار و قطار روتی چلی جاتی تھی۔ نہ جانے اس نے کیا کہا جو ہچکیوں میں کھو کر رہ گیا۔

محسن بھائی کو اس پر ترس آیا۔ یہ ننھی سی لڑکی انہیں کتنی عزیز تھی لیکن وہ زار و قطار روتی جاتی تھی اور اسے رلانے والے بھی وہی تھے۔ وہ نادم سے ہو گئے خود ہی اسے رلا کر وہ تسلی کس طرح دیتے۔ وہ شکستہ سی چال چلتی بار بار آنکھیں خشک کرتی اندر چلی جاتی تھی تو ان کا جی چاہ رہا تھا ہمیشہ کی طرح اسے سینے سے لگا کر اس سے رونے کا سبب دریافت کریں لیکن زمین نے ان کے قدم باندھ لئے تھے۔ ان کی ساری

بردباری' معاملہ فہمی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ وہ بڑی کوشش کے باوجود ایک لفظ بھی اس کی تسلی کیلئے کھوج نہیں پائے تھے۔

وہ بے کلی سے اب تک وہیں ٹہل رہے تھے۔ الجھے ہوئے ذہن کو سلجھاتا بڑا دشوار تھا۔ تمت کا دکھی چہرہ' اس کے بھیگے گال' اس کی روتی آنکھیں نگاہوں میں پھرتی تھی۔ وہ ان سے کتنا قریب تھی وہ ان کی اپنی ہی تو تھی۔ لیکن اسے اپنا لینا' کتنا عجیب تھا۔ یہ چھوٹی سی لڑکی ان کے لئے کتنی اہم ہوگئی تھی جسے انہوں نے گودوں کھلایا تھا۔ آج ان کے مقابل آ گئی تھی۔ اس کے دامن سے محرومیوں کے داغ دھوتے دھوتے وہ خود اسے تارتار کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے لیکن وہ کیا کریں۔ ایک بھنور سی الجھن میں ڈوبتے ابھرتے وہ بے دم سے ہو گئے تھے۔

''محسن بھائی ''اس کی آواز پر وہ چونکے۔

''محسن بھائی ناشتہ کر لیجئے۔'' وہ جھکی جھکی سی نظروں کے ساتھ بولی۔ اس کے چہرے پر ضبط کی انتہائی کیفیتوں کی اذیت تھی لیکن انداز میں وہ مشفق سا درگزر کا انداز جھلکتا تھا جیسے کسی عزیز ہستی سے ناراض ہوتے ہوئے بھی خفا نہ ہو پاتے ہوں۔

انہوں نے عجلت میں کہا۔ ''تم چلو میں آتا ہوں۔''

صمدانی صاحب بھی ناشتے پر موجود تھے۔ آج اس نے معمول سے زیادہ تکلف کیا تھا اور اصرار سے ایک ایک چیز پیش کرتی رہی۔ محسن بھائی کو اس کے یہ گھریلو انداز کتنے اچھے لگتے تھے۔ وہ چلی جائے گی تو پھر ان کی بے ترتیب زندگی شروع ہو جائے گی۔ انہوں نے سوچا' لیکن اسے اپنانے کا خیال بھی کتنا عجیب ہے۔'' انہوں نے سر جھٹکا اور تیار ہونے کیلئے اٹھ گئے۔

''بیٹے جلدی تیار ہو جاؤ جلد گھر سے نکلیں گے۔ تو دوپہر سے پہلے پہنچ جائیں گے۔''

صمدانی صاحب نے تاکید کی۔ تمت غسل خانے میں گھس گئی۔ اس کی حالت اس سلیقہ شعار خاتون خانہ کی سی تھی جس کو بغیر وجہ بتائے گھر سے نکالا جا رہا ہو۔ وہ دل میں اک ایسا درد سا محسوس کر رہی تھی جیسے کسی وفا شعار بیوی کو بلاوجہ طلاق مل گئی ہو۔ کتنی ہی دیر وہ روتی رہی یونہی کپڑے تبدیل کیے اور باہر آ گئی۔

محسن بھائی بھی تیار تھے۔ ابا میاں سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے اخبار دیکھ رہے تھے۔

''محسن!! انہوں نے پکارا۔ میرے پاس آؤ یہاں بیٹھو۔'' انہوں نے اپنے صوفے کے برابر قالین پر اشارہ کیا۔ تو محسن بھائی حیران سے رہ گئے۔ کچھ نہیں سمجھتے ہوئے وہ ان کے قریب جا کھڑے ہوئے۔

''بیٹھ جاؤ۔'' انہوں نے دبنگ لہجے میں کہا۔

تو وہ کچھ الجھے الجھے سے بیٹھ گئے۔ انہوں نے اک ہاتھ سے ان کا کان پکڑ کر ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری یہ ہمت کہ تم میری بیٹی کو رلاؤ۔''

محسن بھائی بھونچکے سے رہ گئے۔ وہ اچھے خاصے ذمہ دار آدمی تھے۔ صمدانی صاحب کی اس غیر متوقع حرکت سے وہ خفیف سے ہو گئے۔ تمت سہم گئی۔

''جی ؟'' انہوں نے کان چھڑانے کی کوشش کی۔

''انگوٹھی اتارو جلدی سے۔ جلدی کرو۔'' انہوں نے سختی سے کہا۔

محسن بھائی نے ہک بک ہو کر چھوٹی انگلی سے کسی دھات کی بنی ہوئی خالص مردانہ انگوٹھی اتار دی۔

''چلو تمت کو پہناؤ جا کر۔'' وہ غرائے۔

محسن بھائی ششدر سے ان کی طرف تکتے رہ گئے۔ اور تمت کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھا رہا تھا۔

''میں کہتا ہوں اٹھو۔'' وہ چلائے۔ محسن بھائی گھبرا کر اٹھے وہ اس پختہ عمر میں بھی کچی عمر کے لڑکوں کی طرح گھبرائے تھے۔ ان کی ساری بردباری دھری کی دھری رہ گی تھی۔ انگوٹھی کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے انہوں نے تمت کی طرف دیکھا جس کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔

صمدانی صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''جلدی کرو کہیں گاڑی نہ نکل جائے۔ میں آج تمہاری ممانی کو زبردست سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔ یہ بیٹیاں انہی کی تو نہیں میری بھی کچھ لگتی ہیں۔'' انہوں نے ہنس کر کہا۔

''ویسے وہ بھی اپنی ڈکٹیٹر شپ سے تائب ہو چکی ہیں۔ بہت عرصہ ہٹلر بنی

رہیں۔اب شاید دل بھر گیا ہے۔''

''ماموں جان لیکن۔'' محسن بھائی نے کچھ کہنا چاہا۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں تمہارے آرگومینٹ میں صبح سن چکا ہوں۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔''سیٹھ ہارون بھی تم سے کچھ کم عمر کے نہیں تھے تمہارے بھی باوا تھے۔''

تمت نے بے یقینی سے ہونٹ چبائے۔ محسن بھائی مسکرائے۔ کچھ جھینپے جھینپے سے وہ تمت کی طرف بڑھے۔ اس کا یہ روپ کتنا انجانا تھا۔اس نے اپنے چہرے پہ بکھرتا گلال کانپتے ہاتھوں سے چھپالیا تھا۔

ختم شد